اثر نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد 25

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
سورہ معارج	۲۵
سورہ معارج کے مطالب	۲۷
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۷
آیت ۱ تا ۳	۲۹
فوری عذاب	۳۱
ایک نکتہ	
بہانہ تراشوں کے بیہودہ اعتراضات	۳۲
آیت ۴ تا ۷	۳۵
پچاس ہزار سال کے برابر دن	۳۵
آیت ۸ تا ۱۸	۳۸
وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبرگیری نہیں کرے گا۔	۳۹
آیت ۱۹ تا ۲۸	۴۳
شائستہ انسانوں کے اوصاف	۴۴
آیت ۲۹ تا ۳۵	۴۹
بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصہ	۵۰
آیت ۳۶ تا ۴۱	۵۳
کس منہ سے جنت کی طمع ؟	۵۳
ایک نکتہ	
'مشارق' و 'مغاربِ' خدا	۵۶
آیت ۴۲ تا ۴۴	۵۷
گویا اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں	۵۷
سورہ نوح	۶۱
سورہ نوح کے مطالب و مضامین	۶۳
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۶۴
آیت ۱ تا ۴	۶۵
نوح کا پہلا پیغام	۶۶
ایک نکتہ	
عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب	۶۸
آیت ۵ تا ۹	۴۹
ان کی ہدایت کے لیے ہر طرح سے کوشش مگر ...	۶۹

عنوان	صفحہ
چند نکات	
۱ : تبلیغ کے طریقے	۷۲
۲ : حقیقت سے فرار کیوں؟	۷۲
آیت ۱۰ تا ۱۳	۷۴
ایمان کی دنیاوی جزا	۷۴
ایک نکتہ	
تقویٰ اور عمران و آبادی میں ربط	۷۶
آیت ۱۵ تا ۲۰	۷۹
باغبان ہستی نے تمھیں ایک پھول کی طرح پالا ہے۔	۷۹
آیت ۲۱ تا ۲۵	۸۳
خدا کا لطف تجھ سے مدارات کہتا ہے	۸۴
آیت ۲۶ تا ۲۸	۸۸
اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے	۸۸
چند نکات	
نوح پہلے اولوالعزم پیغمبر	۹۱
سورۂ جنّ	۹۵
سورہ جن کے مضامین و مطالب	۹۷
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۹۷
آیت ۱ تا ۶	۹۹
شانِ نزول	۱۰۰
ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے	۱۰۱
آیت ۷ تا ۱۰	۱۰۶
ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے لیکن...	۱۰۷

عنوان	صفحہ
آیت ۱۱ تا ۱۵	۱۱۰
ہم نے حق کو سنا اور سرِ تسلیم خم کر لیا	۱۱۱
آیت ۱۶ تا ۱۹	۱۱۴
ہم تمھیں ان فراواں نعمتوں کے ذریعے آزمائیں گے۔	۱۱۴
ایک نکتہ	
'ان المساجد للہ' کی تفسیر میں تحریف	۱۱۸
آیت ۲۰ تا ۲۴	۱۲۰
کہہ دیجئے : میں کسی کے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں۔	۱۲۱
چند نکات	
۱ : خدائی رہبروں کی صداقت	۱۲۴
۲ : جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں جمعیت کا ایمان اہم ہے۔	۱۲۵
آیت ۲۵ تا ۲۸	۱۲۶
عالم الغیب خدا ہے	۱۲۶
چند نکات	
۱ : علمِ غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق	۱۲۹
۲ : آئمہ کے علمِ غیب کو ثابت کرنے کی ایک اور راہ	۱۳۵
۳ : جنّ کی خلقت کے بارے میں تحقیق	۱۳۷
سورۂ مزمّل	۱۴۰
سورۂ مزمّل کے مضامین و مطالب	۱۴۳
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۱۴۴

عنوان	صفحہ
آیت ۱ تا ۵	۱۴۷
اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا	۱۴۷
چند نکات	
۱ : تلاوتِ قرآن اور دعا و عبادت کے لیے رات کو اٹھنا	۱۵۰
۲ : ترتیل کا معنی	۱۵۱
۳ : نمازِ شب کی فضیلت	۱۵۲
آیت ۶ تا ۱۰	۱۵۴
رات کے وقت کی عبادت کا اثر	۱۵۴
آیت ۱۱ تا ۱۹	۱۶۰
ان مستکبرین کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے	۱۶۱
ایک نکتہ	
عذابِ الٰہی کے چار مرحلے	۱۶۵
آیت ۲۰	۱۶۷
جتنا تمہارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو	۱۶۸
چند نکات	
۱ : عقیدت کے ساتھ عملی آمادگی کی ضرورت	۱۷۲
۲ : غور و فکر کے ساتھ تلاوتِ قرآن	۱۷۲
۳ : معاش کی تلاش، جہاد کے ہمردیف	۱۷۳
سورۂ مدثر	۱۷۵
سورۂ مدثر کے مضامین	۱۷۷
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۱۷۷
آیت ۱ تا ۱۰	۱۷۹
اٹھ اور عالمین کو ڈرا	۱۸۰
آیت ۱۱ تا ۱۷	۱۸۷

عنوان	صفحہ
شانِ نزول	۱۸۷
ولید ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند	۱۸۹
آیت ۱۸ تا ۲۵	۱۹۳
ہلاک ہو جائے وہ، اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا	۱۹۴
آیت ۲۶ تا ۳۰	۱۹۷
اس کی سرنوشتِ شوم	۱۹۷
انیس کا عذر عذاب کے فرشتوں کا عذر ہے	۲۰۰
آیت ۳۱	۲۰۱
دوزخ کے مامورین کی تعداد کس لیے ہے	۲۰۱
ایک نکتہ	
پروردگار کے لشکروں کی تعداد	۲۰۴
آیت ۳۲ تا ۳۷	۲۰۶
آیت ۳۸ تا ۴۸	۲۰۹
تم اہلِ دوزخ کیوں ہو گئے ؟	۲۱۰
ایک نکتہ	
روزِ جزا کے شفاعت کرنے والے	۲۱۴
آیت ۴۹ تا ۵۶	۲۱۷
حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیر سے گدھے۔	۲۱۸
سورۂ قیامت	۲۲۳
سورۂ قیامت کے مضامین	۲۲۵
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۲۵
آیت ۱ تا ۶	۲۲۷
قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے	

عنوان	صفحہ
وجدان کی قسم	۲۲۸
چند نکات	
۱: عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغریٰ	۲۳۲
۲: قرآن مجید میں قیامت کے نام	۲۳۴
آیت ۷ تا ۱۵	۲۳۶
انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔	۲۳۷
آیت ۱۶ تا ۱۹	۲۴۲
قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔	۲۴۲
آیت ۲۰ تا ۲۵	۲۴۵
میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے	۲۴۵
آیت ۲۶ تا ۳۰	۲۵۰
ایک نکتہ	
موت کا دردناک لمحہ	۲۵۲
آیت ۳۱ تا ۴۱	۲۵۵
وہ خدا جس نے انسان کو ایک ناچیز نطفہ سے پیدا کیا۔	۲۵۶
چند نکات	
۱: جنین کی تبدیلیاں یا بار بار کی رستاخیز	۲۶۰
۲: جہاں بشریت میں نظامِ جنیت	۲۶۰
سُورۂ انسان (دہر)	۲۶۳
سورۂ انسان (دہر) کے مضامین	۲۶۵
کیا یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے؟	۲۶۵
سُورہ انسان (دہر) کی فضیلت	۲۶۷
آیت ۱ تا ۴	۲۶۹
ہم نے ناچیز نطفہ کو انسان بنا دیا اور ہدایت کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں دے دیئے۔	۲۷۰
ایک نکتہ	
جنین کا پُرغوغا عالم	۲۷۳
آیت ۵ تا ۱۱	۲۷۶
اہلِ بیت، پیغمبر کی فضیلت پر ایک عظیم سند	۲۷۷
ابرار کے لیے عظیم اجر	۲۸۰
ایک نکتہ	
بھوکوں کو سیر کرنا بہترین حسنات میں ہے	۲۸۶
آیت ۱۲ تا ۲۲	۲۸۹
بہشت کی عظیم جزائیں	۲۹۰
آیت ۲۳ تا ۲۶	۲۹۹
خدا کے حکم کے اجراء پر موفق ہونے کے لیے پانچ احکام	۲۹۹
آیت ۲۷ تا ۳۱	۳۰۳
یہ ایک تنبیہ ہے اور راستہ کا انتخاب کرنا تمہارے اختیار میں	۳۰۴
سورہ مرسلات	۳۰۹
سورۂ مرسلات کے مضامین	۳۱۱

عنوان	صفحہ
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۳۱۱
آیت ۱ تا ۱۵	۳۱۳
خدا کے وعدے حق ہیں۔ وائے ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے	۳۱۴
ایک نکتہ	
ان قسموں کا مطلب	۳۱۹
آیت ۱۶ تا ۲۸	۳۲۱
ان تمام مظاہر قدرت کے باوجود پھر بھی تم معاد میں شک رکھتے ہو؟	۳۲۲
آیت ۲۹ تا ۴۰	۳۲۸
نہ دفاع کرنے کی قدرت ہے نہ فرار کی راہ	۳۲۹
آیت ۴۱ تا ۵۰	۳۳۵
اگر وہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے ؟	۳۳۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آئندہ کا اہم پروگرام

ایک نئی فصل، قرآنِ مجید کی "تفسیر موضوعی"

قرآن کا بیکراں سمندر نہ تو ایسا سمندر ہے کہ جس کا انسانی قیاسات سے اندازہ لگایا جا سکے، اور نہ ہی اس کے عجائبات قابلِ درک ہیں، کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے اور خدا کا کلام اس کی ذات کی طرح غیر متناہی ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنی استعداد اور اپنے وجود کے پیمانہ کی مقدار کے مطابق اس بیکراں سمندر سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس بنا پر جس قدر ہمارے وجود کے ظرف اور فکر و روح کی وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، معارفِ قرآن میں ہمارا حصہ اتنا ہی زیادہ ہوتا چلا جائے گا اور پھر ہمیں اس بے دریغ خوانِ نعمت سے زیادہ سے زیادہ ملے گا۔

ٹھیک اسی بناء پر قرآن کی تفسیر کسی مرحلہ میں اور کسی قسم میں رکنی نہیں چاہیے، کیونکہ اگر ہم اسے روک دیں تو پھر ہم نے عملی طور پر قرآن کی محدودیت کا اعتراف کر لیا ہے اور یہ چیز اس کے کلامِ خدا ہونے کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتی۔

تفسیر قرآن کی مختلف اقسام

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ قرآن کی تفسیر کی بس ایک ہی قسم ہے لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی تفسیر کی کم از کم پانچ اقسام تصور ہو سکتی ہیں جن میں سے بعض پر اب تک علماء تحقیق بھی کر چکے ہیں اور ان پر کئی ایک کتابیں لکھ چکے ہیں جبکہ کچھ اقسام ابھی تک ٹھیک طور سے زیرِ مطالعہ ہی نہیں آئی ہیں۔

۱۔ **تفسیر مفرداتِ قرآن**: اس مرحلہ میں مفسّر کی ساری ہمت اس بات پر صرف ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید کے ہر ہر لفظ کی علیحدہ طور سے "معجم" (لغت) کی صورت میں "الف باء" کے حروف کی ترتیب سے تحقیق کرے اور ان مفردات کی اصلی جڑ اور رگ و ریشہ کو، اور قرآن مجید میں اس کے مواقع استعمال کو مشخص کرے۔

اس سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور کتاب "المفردات فی غریب القرآن" تالیف ابوالقاسم حسین بن محمد بن الفضل الراغب الاصفہانی (جو پانچویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے) اور کتاب "وجوہ قرآن" تالیف ابوالفضل حبیش بن ابراہیم تفلیسی ہے (جو چھٹی صدی ہجری کے علماء میں سے تھے)۔

۲۔ **تفسیر ترتیبی**:۔ جو تفسیر قرآن کی سب سے زیادہ رائج قسم ہے، جس میں آیات کو قرآن کی سورتوں کی بنیاد پر ترتیب کے ساتھ، زیر بحث لایا جاتا ہے اور اتفاق سے اکثر موجودہ تفاسیر، جو علمائے اسلام نے لکھی ہیں، اسی بنیاد پر ہیں اور سینکڑوں ہزاروں کتابیں اس سلسلہ میں لکھی جا چکی ہیں۔

۳۔ **تفسیر موضوعی**:۔ اس تفسیر میں مفسر ترتیبی تفسیر کو چھوڑ کر کسی ایک موضوع سے متعلق آیات کو سارے قرآن سے اکٹھا کر کے ایک ساتھ جمع کر دیتا ہے، مثلاً جہاد سے مربوط کل آیات، یا عقائد و اصولِ دین سے مربوط آیات جو توحید یا معاد کے سلسلہ میں ہیں، پہلو بہ پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کر دیتا ہے اور ان کے مجموعہ سے نئے نئے حقائق کا انکشاف کرتا ہے اور اس گہرے سمندر سے گراں بہا موتی نکال لاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی گراں بہا کام ہو چکے ہیں۔ لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تفسیر قرآن کا یہ حصہ ابھی اپنے بچپن کا زمانہ گزار رہا ہے۔

۴۔ **تفسیر ارتباطی (یا سلسلہ وار)**:۔ ہم جانتے ہیں کہ نہ تو کتابِ تکوین میں عالم کے موضوعات ایک دوسرے سے جدا ہیں اور نہ ہی کتاب تدوین یعنی قرآن مجید میں، بلکہ ہمیشہ ایسے قوی اور طاقتور روابط موجود ہوتے ہیں جو عالم کو ایک طرف سے اور حقائق قرآن سے دوسری طرف سے، ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رکھتے ہیں۔

یہاں مفسر کی ذمہ داری یہ ہے کہ تفسیر موضوعی سے فراغت کے بعد، جن موضوعات کو اس نے علیحدہ علیحدہ موردِ مطالعہ قرار دیا تھا، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر، ان کے آپس کے ارتباط کا مطالعہ کرے۔

مثلاً ایمان کا تقویٰ کے ساتھ ربط، تقویٰ کا جہاد کے ساتھ ربط، جہاد کا عملِ صالح کے ساتھ ربط اور عملِ صالح کا شفاعت کے ساتھ ربط اور اسی طرح سے قرآن کو موضوعی ارتباط کی صورت میں اور سلسلہ وار موردِ مطالعہ قرار دے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے تفسیرِ قرآن کی یہ قسم ابھی تک موردِ توجہ قرار نہیں دی گئی اور اوپر والا نام جو اس کے بیان کے لیے انتخاب کیا گیا ہے، وہ اجمالی طور پر، قرآنِ مجید کے اس قسم کے مطالعہ کے لیے ایک وسیع تناظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم کر سکتا ہے۔

۵۔ **تفسیر کلی یا قرآن کی جہان بینی**:۔ یہاں مفسر قرآن کے تمام مطالب کو عالمِ ہستی کے ساتھ مربوط دیکھتا ہے اور زیادہ بہتر تعبیر میں، وہ کتاب تکوین و تدوین کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیتا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط دیکھتا ہے اور دونوں کی ایک دوسرے کے سایہ میں تفسیر کرتا ہے۔

اور یہ اطمینان کی حد تک ایک ایسا کام ہے جو تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں انجام پانا چاہیے لیکن شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور ہمارے اور اس کے درمیان زیادہ فاصلہ ہے کیونکہ اس مرحلہ کو طے کرنا، اس سے پہلے کے مراحل کو طے کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یعنی پہلے تفسیر موضوعی کافی حد تک رشد اور نشو و نما پالے۔ اس کے بعد تفسیر ارتباطی تشکیل اور وسعت پائے۔ اس کے بعد سارے عالمِ ہستی سے مربوط یہ سارے مسائل مفسر کے لیے موردِ توجہ واقع ہوں اور یہ ایسا کام ہے کہ جس کے لیے شاید ہماری زندگی کافی نہ ہو اور یہ کام آنے والوں کے ذمہ ہو۔

بہرحال انشاء اللہ تفسیر نمونہ، جو تفسیر ترتیبی کی قسم سے ہے، اس جلد (جلد ۲۵) اور آنے والی جلد (جلد ۲۶) پر جو اختتام کے قریب ہے خداوند تعالیٰ کی مشیت سے مکمل ہو جائے گی اور ہم ابھی سے بعد کے مرحلہ، یعنی قرآن کی تفسیر موضوعی کو نئی صورت میں پیش کرنے کے لیے، تیار کر رہے ہیں اور پروردگار کی مدد اور ہدایت سے، ان تجربات کی روشنی میں، جو چودہ سال کے طویل عرصہ میں تفسیر نمونہ کی تنظیم و ترتیب میں ہمیں حاصل ہوئے ہیں، اس وادی میں قدم رکھ دیں گے اور ہمیں امید ہے کہ تفسیر نمونہ کا یہ مرحلہ (یعنی تفسیر نمونہ موضوعی) بھی اپنی قسم میں نمونہ اور ممتاز ہوگی اور اس سلسلہ کا ایک قدم شمار ہوگی۔

لیکن یہ کام اس عظیم کلام کے مالک اور اس عظیم کتاب کے نازل کرنے والے کے لطف و کرم اور مدد و نصرت اور ہدایت و رہبری کے بغیر ممکن نہیں ہے، اگر ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کے سپرد کر دیئے جائیں تو لغزشوں اور خطاؤں میں گرفتار ہو جائیں گے۔

یہ وہ منزل ہے جہاں ہم اپنے سارے وجود کے ساتھ، اس کی بارگاہ میں دست تضرع دراز کرتے ہیں اور یہ عرض کرتے ہیں۔

بارالٰہا! ہم تیری حمد و ثنا اور تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں پہلے مرحلہ میں یہ توفیق دی کہ ہم نے اپنی طاقت کے مطابق اس بوجھ کو اٹھایا ہے اور تیری مدد سے اپنے مقصد تک جا پہنچے ہیں۔

اب اس نئے مرحلہ میں جو زیادہ مشکل اور زیادہ پیچیدہ مرحلہ ہے، تو ہی ہمارا یار و مددگار ہو تاکہ ہم مخلص اور مشتاق بندوں کے لیے قرآن کے صاف و شفاف چشمہ کے پیاسوں کے لائق کوئی قابل قدر اور موثر کام کر سکیں۔ آمین رب العالمین۔

ناصر مکارم شیرازی
قم حوزۂ علمیہ
۱۰/۲/۱۳۶۶ھ

آغاز ترجمہ ۱۱ محرم الحرام ۱۴۰۸ ہجری
مطابق ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء
بروز ہفتہ پونے سات بجے صبح ۱۸۱ ای
ماڈل ٹاؤن لاہور
صفدر حسین نجفی

جلد ۲۵

تفسیرِ نمونہ

○ المعارج	○ المدثّر
○ النّوح	○ القیامت
○ الجنّ	○ الدّھر
○ المزمّل	○ المرسلٰت

سُورۂ معارج

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۴ آیات ہیں

تاریخ شروع
۵ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ

سُورۂ معارج کے مطالب

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ سورہ معارج مکی سورتوں میں سے ہے اور "فہرست ابنِ ندیم" و "کتاب نظم الدرر" و "تناسق الایات والسور" کی بنیاد پر، ابوعبداللہ زنجانی کی "تاریخ القرآن" کے مطابق، یہ سُورہ (۷۷) ستر ہواں سُورہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا۔

لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہے کہ اس کی بعض آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور یہ بات سورہ معارج پر ہی منحصر نہیں ہے کیونکہ قرآن کے بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکی ہیں لیکن ان میں ایک یا کئی آیات ایسی ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور اسی طرح اس کے برعکس بعض مدنی سورتوں میں مکی آیات موجود ہیں۔

اس موضوع کے بہت سے نمونے "علامہ امینی" نے "الغدیر" میں پیش کیے ہیں[1]

اس بات کی دلیل کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ بہت سی روایات ہیں جو ان شاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی۔

بہرحال مکی سورتوں کی خصوصیات، مثلاً اصولِ دین کے بارے میں بحث، خاص طور پر معاد اور مشرکین و مخالفین کو ڈرانے کے بارے میں اس سورہ میں کامل طور سے نمایاں ہے اور مجموعی طور سے یہ سُورہ چار حصّوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصّہ: اس شخص کے لیے جلدی ہونے والے عذاب کی بات کرتا ہے جس نے پیغمبر کے بعض ارشادات کا انکار کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر یہ بات حق ہے تو مجھ پر عذاب نازل فرما اور عذاب نازل ہوگیا۔ (آیہ ۱ تا ۳)

دوسرا حصّہ: قیامت کی بہت سی خصوصیات اور اس کے مقدمات، اور اس دن کفار کے حالات کے بارے میں آیا ہے (آیہ ۴ تا ۱۸)۔

تیسرا حصّہ: اچھے اور بُرے انسانوں کی صفات کے ان حصوں کو بیان کرتا ہے جو اسے جنتی اور دوزخی بنا دیتے ہیں۔ (آیہ ۱۹ تا ۳۴)

چوتھا حصّہ: مشرکین و منکرین کو ڈرانے والی باتوں پر مشتمل ہے اور پھر دوبارہ مسئلہ قیامت کی طرف لوٹتا اور سُورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرؐ سے آیا ہے:

[1] الغدیر جلد ۱ ص ۲۵۵ تا ۲۵۷

"من قرأ "سأل سائل" اعطاه الله ثواب الذين هم لاماناتهم وعهدهم راعون و الذين هم على صلواتهم يحافظون"؛

"جو شخص سورہ "سأل سائل" کو پڑھے تو خدا اسے ان لوگوں کا ثواب دے گا جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں"[1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

"من ادمن قرأته "سأل سائل" لم يسأله الله يوم القيامة عن ذنب عمله واسكنه جنته مع محمد (ص)"؛

"جو ہمیشہ سورہ "سأل سائل" کو پڑھے تو خدا قیامت کے دن اس سے اس کے گناہوں کی باز پرس نہیں کرے گا اور اس کو جنت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سکونت عطا فرمائے گا"[2]

یہی مضمون امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ بات جو انسان کو ان سب عظیم ثوابوں کا مشمول قرار دیتی ہے، وہ ایسی تلاوت ہے جو عقیدہ و ایمان کے ساتھ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی ہو، نہ یہ کہ وہ آیات اور سورہ کو تو پڑھے لیکن اس کی روح اور فکر و عمل میں کسی قسم کا انعکاس نہ ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۰

[2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ

۲۔ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَہٗ دَافِعٌ ۙ

۳۔ مِّنَ اللّٰہِ ذِی الۡمَعَارِجِ ؕ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

۱۔ ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا سوال کیا جو واقع ہو گیا۔

۲۔ یہ عذاب کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص اسے دفع نہیں کر سکتا۔

۳۔ یہ ذی المعارج خدا کی طرف سے ہے (وہ خدا جس کے فرشتے آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں)۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین اور محدثین نے ان آیات کی ایک شانِ نزول بیان کی ہے، جس کا ماحصل اس طرح ہے:

"جب رسولِ خداؐ نے علیؑ کو "غدیر خم" کے دن خلافت پر نصب فرمایا تو ان کے بارے میں یہ ارشاد کیا من کنت مولاہ فعلی مولاہ" "جس جس کا میں مولیٰ و ولی ہوں، اس اس کے علی مولیٰ و ولی ہیں"۔ زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ یہ بات سارے شہروں اور بستیوں میں پھیل گئی۔ نعمان بن حارث فہری، پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم یہ گواہی دیں کہ خدا واحد و یگانہ ہے اور آپ اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں تو ہم نے گواہی دی۔ اس کے بعد آپ نے ہمیں جہاد، حج، روزہ، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہم نے ان سب کو قبول کر لیا لیکن آپ ان سب چیزوں پر راضی نہ ہوئے، یہاں تک کہ اس جوان کو (علی کی طرف اشارہ کیا) اپنی جانشینی اور خلافت پر نصب فرمایا اور یہ کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کیا یہ بات خود آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی جانب سے ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: "قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔ یہ بات خدا کی طرف سے ہے۔"

نعمان نے منہ پھیر لیا اور یہ کہتا جاتا تھا:

اللّٰھم ان کان ھٰذا ھوالحق من عندك فامطر علینا حجارۃ من السماء:

خداوندا! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسا"

اسی وقت ایک پتھر آسمان سے اس کے سر پر گرا اور اسے مار ڈالا، اسی موقع پر آیہ سأل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہ دافع" نازل ہوئی۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، یہ اس عبارت کا خلاصہ ہے جو "مجمع البیان" میں "ابوالقاسم حسکانی" سے اس کے سلسلہ سند کے ساتھ "امام صادق" سے نقل ہوئی ہے۔[1]

اس مضمون کو اہل سنت کے بہت سے مفسرین اور راویانِ حدیث نے بھی مختصر فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مرحوم "علامہ امینی" نے "الغدیر" میں اسے اہلِ سنت کے تیس مشہور علماء سے نقل کیا ہے (حوالہ اور اصل عبارت کے ساتھ) منجملہ ان کے:

- تفسیر "غریب القرآن"۔ حافظ ابوعبید ہروی۔
- تفسیر "شفاء الصدور"۔ ابوبکر نقاش موصلی۔
- تفسیر "الکشف والبیان"۔ ابواسحاق ثعالبی۔
- تفسیر "ابوبکر یحییٰ"۔ القرطبی۔
- تذکرہ "ابواسحاق"۔ ثعلبی۔
- کتاب "فرائد السمطین"۔ صمواینی۔
- کتاب "درر السمطین"۔ شیخ محمد زرندی۔
- تفسیر "سراج المنیر"۔ شمس الدین شافعی۔
- کتاب "سیرۂ حلبی"
- کتاب "نورالابصار"۔ سید مومن شبلنجی۔
- کتاب "شرح جامع الصغیر سیوطی"۔ شمس الدین شافعی۔ وغیرہ[2]

ان کتابوں میں سے بہت سی میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اوپر والی آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، البتہ اس سلسلہ میں کہ یہ شخص "حارث بن نعمان" تھا یا "جابر بن نذر" یا "نعمان بن حارث فہری" اختلاف ہے، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اس بات کا اصل مطلب پر کوئی مختلف اثر نہیں پڑتا۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۲

[2] الغدیر، جلد ۱ ص ۲۲۹ تا ۲۴۶

البتہ بعض مفسرین و محدثین جو علی کے فضائل کو خوشی سے قبول نہیں کرتے، انھوں نے اس شانِ نزول پر مختلف اعتراضات کیے ہیں جن کی طرف انشاءاللہ بحث کے آخر میں اشارہ ہوگا۔

تفسیر

فوری عذاب

سورۂ معارج یہاں سے شروع ہوتی ہے: "ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا تقاضا کیا جو واقع ہوگیا (سأل سائل بعذاب واقع)۔

یہ سوال کرنے والا جیسا کہ ہم نے شانِ نزول میں بیان کیا ہے "نعمان بن حارث" یا "نضر بن حارث" جو علی کے "غدیر خم" کے مقام پر خلافت و ولایت پر منصوب ہونے، اور اس خبر کے تمام شہروں میں منتشر ہونے پر بہت غصہ میں بھرا ہوا تھا، پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: کیا یہ بات آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی طرف سے ہے؟ پیغمبرؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: یہ بات خدا کی طرف سے ہے تو وہ اس سے اور بھی زیادہ پریشان ہوگیا اور اس نے کہا: خداوندا! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر نازل فرما۔ اسی وقت ایک پتھر گرا اور اس کے سر پر لگا اور اسے مار ڈالا۔[1]

اس تفسیر کے مقابلہ میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے پیغمبرؐ سے سوال کیا کہ یہ عذاب جو آپ کہتے ہیں کس پر واقع ہوگا تو بعد والی آیت جواب دیتی ہے کہ کافروں کے لیے ہوگا۔

اور تیسری تفسیر کے مطابق یہ سوال کرنے والے خود پیغمبر ہیں جنھوں نے کفار کے لیے عذاب کا تقاضا کیا اور وہ نازل ہوا۔

لیکن پہلی تفسیر، علاوہ اس کے کہ خود آیت کے ساتھ سازگار ہے، ان متعدد روایات پر منطبق بھی ہے جو شانِ نزول میں وارد ہوئی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ عذاب کافروں کے لیے مخصوص ہے اور کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا" (للکافرین لیس لہ دافع)۔[2]

بعد والی آیت میں اس ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس کی طرف سے یہ عذاب ہے، کہتا ہے: "یہ عذاب اس خدا کی طرف

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "بعذاب واقع" میں "باء" زائد اور تاکید کے لیے ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق "عن" کے معنی میں ہے اور یہ دوسری تفسیر کے مطابق ہے (اس پر توجہ رہے کہ اگر سوال، تقاضا اور درخواست کے معنی میں ہو تو پھر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور اگر "استخبار" کے معنی میں ہو تو پھر اس کا دوسرا مفعول یقیناً "عن" کے ساتھ ہوگا)۔

[2] "واقع" عذاب کی صفت ہے اور "للکافرین" دوسری صفت ہے اور "لیس لہ دافع" تیسری صفت۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "للکافرین" "عذاب" سے متعلق ہو اور اگر "لام" "علی" کے معنی میں ہو تو پھر "واقع" سے متعلق ہوگا۔

سے ہے، جو ان آسمانوں کا مالک ہے جن کی طرف فرشتے صعود کرتے ہیں (من اللہ ذی المعارج)۔

"معارج" "معرج" کی جمع ہے، جو سیڑھی یا اس جگہ کے معنی میں ہے جہاں سے صعود کرتے اور اوپر جاتے ہیں اور چونکہ خدا نے فرشتوں کے لیے مختلف مقامات قرار دیئے ہیں کہ وہ مراتب کے لحاظ سے قربِ خدا کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، لہذا خدا کی "ذی المعارج" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔

ہاں فرشتے ہی کافروں اور مجرموں کے عذاب پر مامور ہوتے ہیں اور وہ بھی فرشتے ہی تھے جو ابراہیم خلیل پر نازل ہوئے تھے اور انھیں یہ خبر دی تھی کہ ہم قوم لوط کی بربادی پر مامور ہوئے ہیں اور صبح کے وقت انھوں نے اس آلودۂ جرائم قوم کے شہروں کو تہ و بالا کر دیا[1] یہی فرشتے دوسرے مجرموں پر عذاب نازل کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "معارج" کی فضائل و مواہب الٰہیہ کے معنی میں اور بعض نے "فرشتوں" کے بارے میں تفسیر کی ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب اور اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے،

ایک نکتہ

بہانہ تراشوں کے بے ہودہ اعتراضات

عام طور پر وہ موارد، جن میں آیات و روایات، امیر المومنین علیؑ کے مخصوص فضائل کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ان میں بعض لوگ اتنا اصرار کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے مطلب کو اہمیت نہ دی جائے، یا تو اسے نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی کوئی انحرافی توجیہ کر دی جائے اور ایک خاص وسوسے اور باریکی کے ساتھ مسئلہ کو بیان کیا جائے، حالانکہ اگر یہ فضائل دوسرے لوگوں کے ہوتے تو دریا دلی اور سہولت کے ساتھ انھیں قبول کرتے۔

اس بات کا زندہ ثبوت اور واضح نمونہ وہ سات اعتراضات ہیں جو "ابن تیمیہ" نے "کتاب منہاج السنہ" میں ان احادیث کے بارے میں کیے ہیں جو اوپر والی آیات کے شانِ نزول میں آئی ہیں، جنھیں ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غدیر کا واقعہ، پیغمبرؐ کے حجۃ الوداع سے لوٹنے کے بعد یعنی سن دس ہجری میں واقع ہوا جبکہ سورۂ معارج مکی سورتوں میں سے ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

جواب: جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکی کے نام سے موسوم ہیں جبکہ ان کی بعض ابتدائی آیات مفسرین کی تصریح کے مطابق مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے برعکس کچھ سورتیں ایسی ہیں جو مدنی کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان کی بعض آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔

۲۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ "حارث بن نعمان" پیغمبرؐ کی خدمت میں "ابطح" میں پہنچا اور ہم جانتے ہیں کہ "ابطح"

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۱، ص ۹۸، ۱۰۶ کی طرف رجوع کریں۔

مکہ میں ایک درّہ ہے اور یہ اُمر واقعہ غدیر کے بعد آیت کے نزول کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

جواب: ۔ اوّلاً: "ابطح" کی تعبیر صرف بعض روایات میں ہے نہ کہ میں، ثانیاً: "ابطح" و "بطحاء" ہر اس ریگزار زمین کے معنی میں ہے جس میں سیلاب کا پانی بہتا ہو اور اتفاقاً مدینہ کی سرزمین میں ایسے علاقے موجود ہیں جنھیں "ابطح" یا "بطحاء" کہا جاتا ہے اور اشعارِ عرب اور روایات میں ان کی طرف بہت زیادہ اشارہ ہوا ہے۔

۲۔ آیۂ (واذ قالوا اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء) (انفال ـــ ۳۲) مسلّم طور پر جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی اور یہ واقعہ غدیر سے کئی سال پہلے ہے۔

جواب: کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ مذکورہ آیت کا شانِ نزول واقعہ غدیر ہے، بلکہ بحث آیہ (سأل سائل بعذاب واقع) کے بارے میں ہے۔

لیکن سورۂ انفال کی آیہ ۳۲ ایک ایسی چیز ہے جس سے حارث بن نعمان نے اپنے کلام میں استفادہ کیا ہے اور اس بات کا شانِ نزول کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، لیکن افراطی تعصبات کے سبب سے، انسان ایسے واضح مطلب سے غافل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قرآن مجید کہتا ہے: وما کان اللّٰہ لیعذبھم وانت فیھم وما کان اللّٰہ معذبھم وھم یستغفرون)۔ خدا انھیں عذاب نہیں کرے گا جبکہ تم ان میں موجود ہو اور خدا انھیں عذاب نہیں کرے گا، درآنحالیکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔ (انفال ـــ ۳۳)۔ یہ آیت کہتی ہے کہ: پیغمبرؐ کی موجودگی میں ہرگز کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا۔

جواب: وہ بات جو قابلِ قبول ہے، یہ ہے کہ پیغمبر کے ہوتے ہوئے عمومی اور سب لوگوں کے لیے عذاب نہیں تھا۔ لیکن خصوصی اور شخصی عذاب بارہا بعض لوگوں پر نازل ہوئے، جیسا کہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کئی افراد مثلاً "ابوزمعہ" و "مالک بن طلالہ" و "حکم بن ابی العاص" وغیرہ پیغمبرؐ کی نفرین سے یا اس کے بغیر عذاب میں گرفتار ہوئے۔

علاوہ ازیں اوپر والی آیت کی اور تفاسیر بھی ہیں، جن کے مطابق اس مقام پر اس آیت سے استدلال ممکن نہیں ہے (تفسیر نمونہ جلد ۷، ص ۱۵۴ میں اسی آیہ ۳۲ انفال کے ذیل میں رجوع کیا جائے)۔

۵۔ اگر اس قسم کا شانِ نزول صحیح ہوتا تو اصحابِ فیل کی داستان کی طرح مشہور ہوتا۔

جواب: ۔ یہ شانِ نزول بقدر کافی مشہور و معروف ہے اور ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کم از کم تیس کتب تفسیر و حدیث میں آیا ہے اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ ایک شخصی واقعہ، اصحابِ فیل جیسے عمومی واقع کی طرح مشہور ہو، کیونکہ وہ داستان ایک عمومی پہلو رکھتی تھی سارا مکہ اس کی لپیٹ میں تھا اور ایک بہت بڑا لشکر اس کے اندر نابود ہوا تھا۔ لیکن "حارث بن نعمان" کا واقعہ صرف ایک ہی شخص کے ساتھ مربوط تھا۔

۶۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "حارث بن نعمان" کو صبائی اسلام قبول تھے، تو کسی مسلمان کا عصرِ پیغمبرؐ میں، اس قسم کے عذاب میں گرفتار ہو جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

جواب: ۔ یہ اعتراض بھی شدید تعصب کی پیداوار ہے کیونکہ اوپر والی احادیث اچھی طرح سے بتاتی ہیں کہ وہ نہ صرف پیغمبرؐ کے ارشاد کو قبول نہیں کرتا تھا بلکہ خدا پر بھی معترض تھا کہ اس نے اس قسم کا حکم علیؑ کے بارے میں کیوں دیا، اور یہ کفر و ارتداد کا شدید ترین مرتبہ

شمار ہوتا ہے۔

۷۔ "استیعاب" جیسی مشہور کتاب، جن میں "صحابہ" کے نام آئے ہیں "حارث بن نعمان" کا نام نہیں ہے۔

جواب: اس کتاب میں یا اسی جیسی دوسری کتابوں میں صحابہ کے جتنے نام آئے ہیں وہ صحابہ کے صرف ایک حصہ کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب "اسد الغابہ" میں جو ایک اہم ترین کتاب ہے جس نے اصحاب پیغمبرؐ کو شمار کیا ہے صرف سات ہزار پانچ سو چون (۷۵۵۴) افراد کے نام آئے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف حجۃ الوداع میں ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد بارگاہِ پیغمبرؐ میں حاضر تھے۔ اس بناء پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے اصحاب پیغمبرؐ کے نام ان کتب میں نہیں آئے ہیں[1]

---

[1] اوپر والے جوابات کے سلسلے میں، اور ہر ایک کے تاریخی یا روایتی شواہد کے بارے میں کتاب نفیس "الغدیر" کی جلد ۱ ص ۲۴۷ تا ۲۶۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

۴۔ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ۝

۵۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝

۶۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝

۷۔ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝

ترجمہ

۴۔ فرشتے اور روح (مخصوص فرشتے) اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔ اس کی طرف عروج کریں گے۔

۵ اس بناء پر صبر جمیل اختیار کر۔

۶۔ کیونکہ وہ تو اس دن کو دور سمجھتے ہیں۔

۷۔ اور ہم اسے نزدیک سمجھتے ہیں۔

تفسیر

پچاس ہزار سال کے برابر دن

ایک شخص کے دنیاوی عذاب کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد۔ جس نے عذابِ الٰہی کا تقاضا کیا تھا۔ معاد اور مجرموں کے اس دن کے اخروی عذابوں کے مباحث کا بیان شروع کرتا ہے، پہلے فرماتا ہے: وہ فرشتے اور روح، اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، اس (خدا) کی طرف عروج کریں گے (تعرج الملائکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ)۔

مسلّمہ طور سے "فرشتوں کے عروج" سے مراد جسمانی عروج نہیں ہے بلکہ اس سے مراد روحانی عروج ہے، یعنی وہ خدا کے مقام قرب کی طرف بڑھیں گے، اور اس دن، جو قیامت کا دن ہے، فرمانِ خداوندی کو حاصل کرنے اور اس کے اجراء کے لیے آمادہ ہوں گے۔ جیسا کہ ہم نے سورہ "حاقہ" کی آیہ، کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "والملک علی ارجائھا" (فرشتے آسمان کے اطراف میں قرار پائیں گے) کے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس دن وہ آسمانوں کے گرداگرد کھڑے ہوں گے اور ہر قسم کے فرمان کو انجام دینے کے لیے

آمادہ ہوں گے[1]

"روح" سے مراد وہی "روح الامین" ہے جو سب فرشتوں سے بزرگ ہے اور جس کی طرف سورہ "قدر" میں بھی اشارہ ہوا ہے، جہاں کہتا ہے: تنزل الملائکة والروح فیها باذن ربهم من کل امر:

"شب قدر میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے امور کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں" (قدر ـــــ ۴)

البتہ "روح" کے مختلف معانی ہیں اور ممکن ہے کہ وہ ہر موقع پر موجود قرائن کی مناسبت سے ایک خاص مفہوم دے۔ روح انسان، روح بمعنی قرآن، روح بمعنی روح القدس اور روح بمعنی فرشتہ وحی، یہ سب روح کے معانی ہیں۔ جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے[2]

اب رہی پچاس ہزار سال کی تعبیر تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ زیر بحث دن دنیا کے سالوں کے حساب سے اتنا طولانی ہوگا اور یہ بات اس چیز سے کہ جو سورۂ سجدہ کی آیہ ۵ میں آئی ہے کہ اس کی مقدار ایک ہزار سال ہے، اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ ـــــ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے ـــــ قیامت میں پچاس موقف ہوں گے اور ہر موقف ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر ہوگا[3]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "پچاس ہزار سال، کا عدد تکثیر کے لیے ہے نہ کہ تعدد کے لیے، یعنی وہ دن بہت طولانی ہوگا بہرحال یہ مجرموں، ظالموں اور کافروں کے لیے ہوگا، اسی لیے ایک حدیث میں "ابوسعید خدری" سے آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! وہ دن کتنا طولانی ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیده انه لیخف علی المؤمن حتّٰی یکون اخف علیه من صلاة مکتوبة یصلیها فی الدنیا

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے وہ دن مومن کے لیے بہت ہی ہلکا اور آسان ہوگا، یہاں تک کہ وہ ایک واجب نماز سے بھی زیادہ آسان ہوگا، جو وہ دنیا میں پڑھا کرتا تھا"[4]

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "صبر جمیل اختیار کر اور ان کے استہزاء، تکذیب اور آزار کے مقابلہ میں صبر سے کام لے (فاصبر صبرًا جمیلًا)۔

---

[1] "فرشتوں کے عروج" کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نزول و صعود کا زمانہ ہے جو آغاز دنیا سے لے کر اس کے اختتام تک ہے اور وہ مجموعی طور پر پچاس ہزار سال ہے، جو دنیا کی تمام عمر ہے لیکن بعد والی آیات اچھی طرح بتاتی ہیں کہ گفتگو قیامت کے دن کے بارے میں ہے نہ کہ دنیا کے متعلق (غور کیجیے)۔

[2] تفسیر نمونہ: جلد ۱۲ ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ کی طرف رجوع کریں۔

[3] یہ حدیث امالی شیخ میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، بمطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۲

[4] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۵۲، اور "قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۷۶۱

"صبر جمیل" کا معنی خوبصورت اور قابلِ توجہ صبر و شکیبائی ہے اور وہ وہی صبر و استقامت ہے جس میں دوام و استمرار ہو، جس میں یاس و ناامیدی نہ ہو، اور وہ بے تابی، جزع و فزع و شکوہ اور آہ و نالہ سے توأم نہ ہو، اس صورت کے علاوہ وہ جمیل نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "کیونکہ وہ اس قسم کے دن کو بعید اور دور سمجھتے ہیں (انھم یرونہ بعیدًا)۔

اور ہم اسے قریب اور نزدیک سمجھتے ہیں (ونراہ قریبًا)۔

وہ بالکل باور ہی نہیں کرتے کہ اس قسم کا دن بھی ہوگا جس میں تمام مخلوق کا حساب لیا جائے گا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی گفتار و رفتار کا بھی محاسبہ ہوگا۔ وہ بھی ایسے دن میں جو پچاس ہزار سال طولانی ہوگا لیکن حقیقت میں ایسے لوگوں نے خدا کو پہچانا نہیں اور وہ اس کی قدرت میں شک اور تردد رکھتے ہیں۔

وہ یہ کہتے ہیں: کیا یہ ممکن ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں اور وہ مٹی جس کا ہر ذرہ مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو جائے گا، دوبارہ جمع ہو کر زندگی کا لباس زیبِ تن کر لیں گی۔ (جیسا کہ قرآن نے اپنی آیات میں یہ تعبیریں ان سے نقل کی ہیں)۔ اس کے علاوہ کیا پچاس ہزار سال کا دن ممکن ہے؟!۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا علم یہ کہتا ہے کہ آسمانی کرات میں، دن کی مقدار ہر کُرّہ کی دوسرے کُرّہ سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ کی مقدار کے تابع ہوتی ہے، جس میں وہ کُرّہ اپنے محور کے گرد ایک مرتبہ چکر لگاتا ہے، اسی لیے چاند کے کُرّہ کا دن زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہے، یہاں تک کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ زمین زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اپنی وضعی حرکت کی سرعت اور تیزی میں کمی کر دے اور اس کے ایک دن کی مقدار ایک ماہ یا ایک سال یا کئی سو سال کے برابر ہو جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قیامت کا دن اس طرح ہوگا، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کے برابر دن، اس دنیا کے اندازوں کے ساتھ بھی کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔

---

[1] "صبر جمیل" کے سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ (جلد ۹ ص ۲۵۱) میں یعقوب و یوسف کی داستان میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۸۔ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ
۹۔ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝
۱۰۔ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۚ ۝
۱۱۔ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ ۙ ۝
۱۲۔ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ ۝
۱۳۔ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ ۝
۱۴۔ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ ۝
۱۵۔ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۙ ۝
۱۶۔ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۚ ۝
۱۷۔ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۙ ۝
۱۸۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝

ترجمہ

۸۔ اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوجائے گا۔
۹۔ اور پہاڑ رنگین بکھری ہوئی اون کی طرح ہوجائیں گے۔
۱۰۔ اور کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبرگیری نہیں کرے گا۔
۱۱۔ وہ انھیں دکھائے جائیں گے (لیکن ہر شخص اپنے کام میں گرفتار ہوگا) گنہ گار چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے بدلے میں اپنی اولاد کو فدا کردے۔

۱۲۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی (کو بھی)
۱۳۔ اور اپنے اس قبیلہ کو بھی جو ہمیشہ اس کی حمایت کرتا تھا۔
۱۴۔ اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو بھی، تاکہ وہ اس کی نجات کا سبب بن جائے۔
۱۵۔ لیکن ہرگز ایسا نہیں ہوگا، آگ کے جلانے والے شعلے ہوں گے۔
۱۶۔ جو ہاتھ پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کر لے جائیں گے۔
۱۷۔ اور وہ ان لوگوں کو، جنھوں نے حکمِ خدا کی طرف سے روگردانی کی تھی، پکاریں گے:
۱۸۔ اور انھیں بھی کہ جنھوں نے مال کو جمع کیا اور ذخیرہ کیا

تفسیر

وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبرگیری نہیں کریگا

ان آیات میں، قیامت کے بارے میں، گزشتہ مباحث کو، مزید تشریح و توضیح کے ساتھ جاری رکھا گیا ہے، فرماتا ہے:
"اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کے مانند ہوجائے گا (یوم تکون السماء کالمھل)[1]

اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہوجائیں گے (و تکون الجبال کالعھن)۔
"مھل" (بروزن قفل) پگھلی ہوئی دھات کے معنی میں ہے اور کبھی ایک خاص قسم کی تلچھٹ کے معنی میں ہوتا ہے جو زیتون کے تیل کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے اور یہاں وہی پہلا معنی ہی مناسب ہے، اگرچہ تشبیہ کے اعتبار سے آپس میں کوئی خاص فرق نہیں رکھتے۔
"عھن" دھنکی ہوئی رنگین اون کے معنی میں ہے۔
ہاں! اس دن آسمان ایک دوسرے سے جدا ہوکر پگھل جائیں گے اور پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اور پھر تیز آندھی سے فضا میں بکھر جائیں گے، اس اون کی طرح جسے تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتی ہے، اور چونکہ پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں رنگین اون سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس ویرانی کے بعد، ایک نیا عالم ایجاد ہوگا اور انسان اپنی حیاتِ نو کو نئے سرے سے حاصل کرے گا۔

---

[1] "یوم" کے محل اعراب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ "قریباً" سے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے بدل ہو یا ایک فعل محذوف سے متعلق ہو، مثلاً "اذکر"

جب اس جہانِ نو میں قیامت برپا ہوگی تو اس طرح سے حساب و کتاب اور اعمال کی جانچ پڑتال کی کیفیت وحشت ناک ہوگی، اور ہر شخص کو اپنی ہی فکر ہوگی، کوئی دوسرے کی خبر نہیں لے گا اور کوئی گہرا اور مخلص دوست اپنے دوست کا حال نہیں پوچھے گا (ولا یسئل حمیم حمیمًا)۔[1]

سب کے سب اپنے کام میں مشغول ہوں گے، ہر ایک کو اپنی ہی نجات کی فکر ہوگی، جیسا کہ سورۂ عبس کی آیہ ۳۷ میں آیا ہے: (لکل امرئ منھم یومئذ شأن یغنیہ) اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح گرفتار ہوگا کہ اسے صرف اپنی ہی اپنی فکر ہوگی۔[2]

ایسا نہیں ہوگا کہ دوست وہاں پر دوستوں کو پہچانیں گے نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ "ان کے دوست انھیں دکھائے جائیں گے، لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنی ہی مصیبت میں مبتلا ہوگا" (یبصرونھم)۔[3]

مسئلہ یہ ہے کہ ہول و وحشت اس سے کہیں زیادہ ہوگی کہ کوئی دوسرے کی فکر کرسکے۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اور اس وحشت ناک منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: حالت یہ ہوگی کہ مجرم و گنہگار یہ چاہے گا کہ اپنی اولاد کو اس دن کے عذاب کے بدلے میں فدا کردے (یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیہ)۔

نہ صرف اپنی اولاد کو، بلکہ وہ یہ چاہے گا کہ "اپنی بیوی کو بھی اور اپنے بھائی کو بھی فدا کردے (و صاحبتہ و اخیہ)۔

اور اسی بناء پر اس خاندان اور قبیلہ کو بھی جو اس سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی حمایت کیا کرتا تھا (و فصیلتہ التی تئویہ)۔

بلکہ تمام لوگوں کو جو روئے زمین میں ہیں، سب کو فدا کردے تاکہ اس کی نجات ہوجائے (و من فی الارض جمیعًا

---

[1] "حمیم" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اصل میں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے، اس کے بعد یہ لفظ گرم جوشی دکھانے والے مخلص اور دلی دوستوں پر بھی بولا جانے لگا۔

[2] اوپر والی آیت کے لیے اور دوسری تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے حالات کے متعلق سوال نہیں کرے گا، کیونکہ سب کی وضع و کیفیت ان کے چہرے سے عیاں ہوگی (و آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است)؛ دوسری یہ کہ کوئی شخص دوسرے سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ اس کے اعمال کی ذمہ داری اٹھائے، کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے، لیکن صحیح وہی اوپر والی تفسیر ہے۔

[3] باوجود اس کے کہ "حمیم" دونوں مرحلوں میں مفرد کی صورت میں ہے، لیکن "یبصرونھم" میں دونوں ضمیریں جمع کی صورت میں آئی ہیں، کیونکہ وہ جنس کے معنی میں ہے۔

ثم ینجیه)۔

ہاں! اس دن خدا کا عذاب اتنا ہولناک ہوگا، کہ انسان یہ چاہے گا کہ وہ اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو ——— جن کا یہاں چار گروہوں (اولاد، بیویاں، بھائی اور قریبی رشتہ دار جو اس کے یار و مددگار تھے) میں خلاصہ کیا گیا ہے ——— اپنی نجات کے لیے قربان کردے، نہ صرف انھیں کو، بلکہ وہ تو اس بات کے لیے بھی تیار ہوگا کہ روئے زمین کے تمام انسان اس کی عذاب سے رہائی کے لیے قربان ہوجائیں۔!

"یود" "ود" کے مادہ سے (جو حب کے وزن پر ہے)۔ "تمنی" سے تو "دوست رکھنے" کے معنی میں ہے اور بقول "راغب" ان دونوں معانی میں سے ہر ایک کے لیے (بلکہ دونوں معانی میں) بھی استعمال ہوتا ہے۔

"یفتدی" "فداء" کے مادہ سے، کوئی چیز دے کر اپنے آپ کو مصائب و مشکلات سے محفوظ کرنے کے معنی میں ہے۔

"فصیلة" بر معنی "عشیرہ" اس خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں جس سے انسان منفصل اور جدا ہوا ہو۔

"تئویه" "ایواء" کے مادہ سے، ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد پناہ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "ثم ینجیه" کے جملہ میں "ثم" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان فدیوں اور قربانیوں کا اثر کرنا بہت بعید ہے (کیونکہ "ثم" عام طور پر، بعد، فاصلہ اور تراخی کے لیے آتا ہے)۔

لیکن ان تمام تمناؤں اور آرزوؤں کے مقابلہ میں فرماتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا" کوئی فدیہ اور قربانی قبول نہیں کی جائے گی۔

(کلّا)۔ "وہ تو آگ کے جلانے والے شعلے ہیں" (انها لظی)۔

ہمیشہ اس کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں اور جو چیز بھی اس کے پاس یا اس کی راہ میں آتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔ "ہاتھ، پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے" (نزاعة للشوی)۔

"لظی" آگ کے خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور جہنم کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے، اور اوپر والی آیات میں دونوں معنی ممکن ہیں۔

"نزاعة" اس چیز کے معنی میں ہے جو پے در پے جدا کرتی ہے۔

اور "شوی" ہاتھ، پاؤں اور اطراف بدن کے معنی میں ہے اور بعض اوقات بریاں کرنے اور بھوننے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے، کیونکہ جس وقت جلانے والی اور شعلہ ور آگ کسی چیز کو لگتی ہے تو پہلے اس کے اطراف و جوانب اور شاخ و برگ کو جلاتی ہے اور اس سے جدا کر دیتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں "شوی" کی بدن کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے سر کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے پنڈلی کے گوشت کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ سب معانی، اس وسیع مفہوم میں جو ہم نے بیان کیا ہے، جمع ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ساری مصیبت اور تکلیف کے باوجود موت اور مرنا درمیان میں نہیں ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو اس قسم کی آگ کا لقمہ ہیں، فرماتا ہے: "یہ جلانے والا شعلہ ان لوگوں کو، کہ جنھوں نے حکمِ خدا سے پشت پھیری اور اس کی اطاعت سے روگردانی کی، آواز دیتا ہے اور اپنی طرف بلاتا ہے" (تدعوا من ادبر و تولّی)۔

اور انھیں بھی، کہ جنھوں نے مال جمع کیے اور ان کا ذخیرہ کیا، اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کیا (وجمع فاوعٰی)۔

اس طرح سے یہ جلانے والی آگ، زبان حال سے، اور اس مخصوص کشش کے ساتھ، جو وہ مجرموں کے لیے رکھتی ہے، یا زبانِ قال سے جو خدا نے اسے دی ہے، مسلسل انھیں آواز دیتی ہے، اور انھیں اپنی طرف بلاتی ہے، انھیں کو جو ان دو صفات کے حامل ہیں، ایمان کی طرف سے پشت کیے ہوئے اور خدا و رسول کی اطاعت سے سرتابی کیے ہوئے، اور دوسری طرف سے، ہمیشہ حرام و حلال سے مال جمع کرنے اور اسے ذخیرہ کرنے میں لگے ہوئے تھے، اور فقراء و مساکین کے حقوق کی طرف کوئی توجہ نہیں کیا کرتے تھے، یا اصلاً اس نعمتِ الٰہی، یعنی مال کے فلسفہ کو سمجھتے ہی نہ تھے۔

۱۹۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ

۲۰۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ

۲۱۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ

۲۲۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ

۲۳۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ

۲۴۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ

۲۵۔ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۙ

۲۶۔ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ

۲۷۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۚ

۲۸۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۚ

ترجمہ

۱۹۔ انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے۔

۲۰۔ جب اسے کوئی برائی پہنچے تو بے تابی کرتا ہے۔

۲۱۔ اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے منع کرتا ہے۔

۲۲۔ سوائے نماز پڑھنے والوں کے۔

۲۳۔ جو نماز کو بلاناغہ ہمیشہ بجالاتے ہیں۔

۲۴۔ اور (سوائے ان لوگوں کے) جن کے مال میں حق معلوم ہے۔

۲۵۔ سوال کرنے والوں اور محروموں کے لیے۔

۲۶۔ اور وہ لوگ جو جزا کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲۷۔ اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔
۲۸۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو پروردگار کے عذاب سے ہرگز امان میں نہیں سمجھتے۔

تفسیر

شائستہ انسانوں کے اوصاف

قیامت کے عذابوں کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، بے ایمان افراد کے اوصاف اور ان کے مقابلہ میں سچے مومنین کے اوصاف بیان کرتا ہے، تاکہ معلوم ہوجائے کہ ایک گروہ اہلِ عذاب کیوں ہے اور ایک گروہ اہلِ نجات کیوں ہے؟
پہلے فرماتا ہے: "انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے" (ان الانسان خلق هلوعًا)۔

جب اسے کوئی برائی پہنچے تو جزع وفزع اور بیتابی کرتا ہے (اذا مسه الشر جزوعًا)۔

اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے دریغ کرتا ہے (اور روکتا ہے)۔ (و اذا مسه الخير منوعًا)۔

بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت نے "هلوع" کا معنی حریص کہا ہے اور ایک گروہ نے اس کی "کم طاقت" کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ پہلی تفسیر کی بناء پر یہاں اس قسم کے انسانوں کے وجود میں تین منفی اخلاقی نکتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے "حرص" و "جزع" و "بخل"، کیونکہ دوسری اور تیسری آیت "هلوع" کے معنی کی تفسیر ہے۔
یہ احتمال بھی ہے کہ اس لفظ میں دونوں معانی اکٹھے مراد ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفات ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، حریص افراد عام طور پر بخیل ہوتے ہیں اور بُرے حوادث میں کم تحمل ہوتے ہیں اور اس کا عکس بھی صادق اور سچا ہے۔

یہاں ایک یا کئی سوالات سامنے آتے ہیں، کہ اگر خدا نے انسان کو سعادت وکمال کے لیے پیدا کیا ہے، تو پھر اس کی طبیعت میں شر اور بدی کو کیوں قرار دیا ہے؟
اور پھر یہ بات بھی ہے، کہ اگر خدا کسی چیز کو، کسی صفت کے ساتھ پیدا کرے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ پھر اپنی خلقت کی مذمت بھی کرے؟
اور ان تمام باتوں سے قطع نظر، قرآن سورہ "تین" کی آیہ ۴ میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم "ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت اور ساخت میں پیدا کیا ہے"۔

مسلمہ طور پر اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کا ظاہر تو اچھا ہے لیکن اس کا باطن قبیح اور بُرا ہے، بلکہ انسان کی تمام خلقت "احسن تقویم" کی صورت میں ہے اور اسی طرح وہ دوسری آیات جو انسان کے بلند مقام کی تعریف کرتی ہیں، تو یہ سب کی سب آیات، زیر بحث آیت کے ساتھ کس طرح سازگار ہیں؟

ان تمام سوالات کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان میں ایسی قوتیں، غرائز اور صفات خلق فرمائی ہیں، جو اس کے تکامل و ارتقاء اور سعادت کا بالقوہ ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔ اس بنا پر مذکورہ صفات و غرائز ذاتی طور پر بُری نہیں ہیں، بلکہ کمال کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، لیکن جب یہی صفات انحرافی راہ اختیار کر لیں اور ان سے سوء استفادہ ہونے لگے، تو نکبت، بدبختی اور شر و فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔

مثلاً یہ حرص ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جلد ہی سعی و کوشش سے رُک جائے اور کسی نعمت تک پہنچ کر سیر ہو جائے۔ یہ تو ایک بھڑکی ہوئی پیاس ہے، جو انسان کے وجود پر مسلط ہے۔ اگر یہی صفت تحصیل علم و دانش کی راہ میں استعمال ہو اور انسان علم کے حصول میں حریص ہو جائے یا دوسرے لفظوں میں علم کا پیاسا اور عاشق بے قرار ہو جائے تو مسلّمہ طور پر یہ بات، اس کے کمال کا سبب بنے گی، لیکن اگر وہ مادیات کی راہ میں استعمال ہونے لگے، تو پھر شر و بدبختی اور بخل کا سبب بنے گی۔

دوسرے لفظوں میں، یہ صفت حُبِ ذات کی ایک شاخ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حُبِ ذات ایک ایسی چیز ہے، جو انسان کو کمال کی طرف لے جاتی ہے، لیکن اگر یہ انحرافی راہ پر پڑ جائے تو انحصار طلبی (خود غرضی) و بخل و حسد وغیرہ کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسرے مواہب کے بارے میں بھی مطلب اسی طرح سے ہے، خداوند تعالیٰ نے ایٹم کے اندر ایک عظیم قدرت پیدا کی ہے، جو مسلّمہ طور پر مفید اور سود مند ہے لیکن اگر ایٹم کی اس اندرونی قوت سے سوء استفادہ ہونے لگے اور اس سے ویران و تباہ کرنے والے ایٹم بم بنائے جانے لگیں، نہ کہ بجلی کے پاور ہاؤس اور دوسری صنعتوں کے وسائل، تو پھر یہی شر و فساد کا سبب بن جائے گا۔

اوپر والے بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے، ان تمام آیات کے معانی و مطالب کو ——— جو قرآنِ مجید میں انسان کے بارے میں آئی ہیں ——— جمع کیا جا سکتا ہے [1]

اس کے بعد شائستہ اور لائق انسانوں کا بیان ——— ایک استثنائی صورت میں ——— نو (۹) عمدہ صفات کے ضمن میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مگر نماز پڑھنے والے" (الا المصلّین)۔

وہی نمازگزار جو اپنی نمازوں کو دوام بخشتے ہیں (الذین هم علی صلاتهم دائمون)۔

---

[1] ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۸ کے ص ۲۲۹ تا ۲۴۱ پر "انسان در قرآن کریم" کے عنوان کے تحت (یونس آیہ ۱۲ کے ذیل میں) ایک اور وضاحت بھی کی ہے۔

یہ ان کی پہلی خصوصیت ہے، جو خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مسلسل اور دائمی طور پر ارتباط رکھتے ہیں اور یہ ارتباط نماز کے ذریعے پورا ہوتا ہے وہ نماز جو انسان کو فحشاء و منکر سے روکتی ہے، وہ نماز جو انسان کی روح اور جان کی پرورش کرتی ہے، اور اس کو ہمیشہ خدا کی یاد دلاتی رہتی ہے اور یہ مسلسل اور دائمی توجہ، غفلت و غرور اور دریائے شہوات میں ڈوب جانے، اور شیطان اور ہوائے نفس کے چنگل میں اسیر ہونے سے باز رکھتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نماز پر مداومت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ حالتِ نماز میں رہیں، بلکہ مراد یہ ہے، کہ وہ معین اوقات میں نماز کو انجام دیتے ہیں۔

اصولی طور پر ہر کارِ خیر اسی وقت انسان میں مثبت اثر کرتا ہے، جب کہ اس کی مداومت ہو، اور اسی لیے پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

ان احب الاعمال الی اللہ ما دام و ان قل

خدا کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہے کہ جس میں مداومت ہو چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے یہ آیا ہے کہ: "اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی انسان نوافل میں سے کوئی چیز اپنے اوپر فرض کرے تو ہمیشہ اس کی مداومت کرتا رہے"[2]

ایک اور حدیث میں اسی امام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ آیت نافلہ کی طرف اشارہ ہے اور آیہ والذین ھم علی صلاتھم یحافظون

(جو کچھ آیات کے بعد آئے گی) نماز فریضہ کو بیان کرتی ہے"[3]

یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ محافظت کی تعبیر تو واجب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے اور انھیں خاص طور پر معین اوقات میں ہی انجام دینا چاہیے۔ باقی رہی مدام کی تعبیر تو یہ مستحب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے، کیونکہ انسان انھیں انجام بھی دے سکتا ہے اور کبھی چھوڑ بھی سکتا ہے۔

بہرحال نماز کے ذکر کے بعد ——— جو بہترین عمل اور مومنین کی بہترین حالت ہے ——— ان کی دوسری خصوصیت پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جن کے اموال میں ایک حق معلوم ہے" (والذین فی اموالھم حق معلوم)۔

"سوال کرنے والوں اور محروموں کے لیے" (للسائل والمحروم)۔

---

[1] المعجم المفہرس للالفاظ الحدیث، جلد ۲ ص ۱۶۰ (مادہ دوام)

[2] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۱۵

[3] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۱۶

اس طرح سے وہ خالق سے اپنے ارتباط کی بھی حفاظت کرتے ہیں ، اور مخلوقِ خدا کے ساتھ بھی اپنے رشتہ اور تعلق کو برقرار رکھتے ہیں ۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں "حق معلوم" سے مراد وہی "زکات" ہے ۔ جس کی ایک مقدار معین ہے اس کے مصارف میں سے "سائل" اور "محروم" ہیں ، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے ، اور زکوٰۃ کا حکم مکہ میں نازل نہیں ہوا تھا یا اگر نازل ہوا تھا تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں تھی ۔ لہٰذا بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ "حق معلوم" سے مراد زکات کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ، جسے انسان اپنے اوپر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ حاجت مندوں کو دے گا ۔ اس تفسیر کا شاہد و گواہ وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے ، کہ جس وقت لوگوں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا کہ کیا وہ زکات کے علاوہ کوئی چیز ہے ؟ تو آپ نے فرمایا :

"ھو الرجل یؤتیہ اللہ الثروۃ من المال فیخرج منہ الالف و الالفین والثلاثۃ آلاف و الاقل و الاکثر ، فیصل بہ رحمہ ، و یحمل بہ الکل عن قومہ"

ہاں ! یہ اس شخص کے بارے میں ہے ، جسے خدا مال و ثروت عطا فرماتا ہے ، اور وہ اس میں سے ایک ہزار ، دو ہزار اور تین ہزار یا اس سے زیادہ یا کم الگ کر دیتا ہے اور اس سے صلہ رحمی کرتا ہے ۔ اور اس کے ذریعے اپنی قوم سے مشقت اور بوجھ کو اٹھا لیتا ہے [1]

"سائل" اور "محروم" کے درمیان فرق یہ ہے کہ سائل تو اس شخص کو کہتے ہیں ، جو اپنی حاجت پیش کر کے تقاضا اور سوال کرتا ہے اور "محروم" وہ شخص ہے جسے شرم و حیا ، سوال و تقاضا کرنے سے مانع ہوتی ہے ، اور ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

"محروم" وہ شخص ہے جو کسب و کار میں زحمت و تکلیف اٹھاتا ہے لیکن اس کی زندگی پیچیدہ ہو گئی ہے [2]

مذکورہ حق کی مزید تشریح اور "سائل" و "محروم" کی تفسیر ، تفسیر نمونہ کی جلد ۲۲ ص ۲۹۰ میں آچکی ہے ۔ (ذاریات آیہ ۱۹ کے ذیل میں) ۔

بہر حال اس کام کا انجام دینا ایک طرف تو اجتماعی اثر رکھتا ہے اور فقر و فاقہ اور محرومیت کے ساتھ مبارزہ کرتا ہے ، اور دوسری طرف ان لوگوں پر جو اس پر عمل کرتے ہیں ، اخلاقی اثر چھوڑتا ہے اور ان کے دل و جان کو حرص و بخل اور دنیا پرستی سے پاک کرتا ہے ۔

بعد والی آیت ان کی تیسری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے : "وہ لوگ جو روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں" ۔ (والذین یصدقون بیوم الدین) ۔

اور چوتھی خصوصیت میں کہتا ہے : "اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں" (والذین ھم من

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۱۰ (حدیث ۲۵ - ۲۰)

[2] ایضاً

عذاب ربهم مشفقون)۔

"کیونکہ وہ کسی شخص کو پروردگار کے عذاب سے امان میں نہیں سمجھتے" (ان عذاب ربهم غير مأمون)۔

وہ ایک طرف تو روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اور "يصدقون" کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس بات پر توجہ رکھتے ہیں کہ حساب و کتاب اور جزا و سزا سے واسطہ پڑے گا۔

بعض مفسرین نے اس کی "تصدیق عملی" کے معنی میں، یعنی انجام وظائف اور ترک محرمات سے تفسیر کی ہے، لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے جو علمی اور عملی دونوں تصدیقوں کو شامل ہے۔

لیکن چونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص روز جزا پر ایمان تو رکھتا ہو، لیکن وہ اپنے آپ کو سزا کا مشمول نہ سمجھتا ہو، اس لیے کہتا ہے: وہ ہرگز اپنے آپ کو امان میں نہیں سمجھتے"۔ یعنی وہ ہمیشہ باز پرس کا احساس رکھتے ہیں۔ اپنے حسنات اور نیکیوں کو ناچیز اور اپنی برائیوں کو بڑا شمار کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

خف الله خوفاً انك لو اتيته بحسنات اهل الارض لم يقبلها منك، و ارج الله رجاءً انك لو اتيته بسيئات اهل الارض غفرها لك؛

اے میرے فرزند! تو خدا سے اس طرح خائف رہ کہ اگر تو روئے زمین کے لوگوں کی نیکیاں لے کر بھی آئے تو بھی یہ احتمال دے کہ (شاید) خدا تجھ سے قبول نہ کرے، اور اس طرح اس سے امیدوار رہ کہ اگر تو تمام اہل زمین کے گناہ بھی رکھتا ہو تو بھی یہ احتمال دے کہ وہ تجھے بخش دے"۔[1]

یہاں تک کہ خود پیغمبر یہ فرمایا کرتے تھے:

لن يدخل الجنة احدٌ عمله قالوا ولا انت يا رسول الله؟ قال ولا انا، الا ان يتغمدني الله برحمته!؛

"کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا، لوگوں نے عرض کیا اے رسولؐ خدا کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں! میں بھی اسی طرح ہوں مگر یہ کہ خدا کی رحمت میرے شامل حال ہو"

---

[1] جامع الاخبار، ص ۱۱۳

۲۹۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ
۳۰۔ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ
۳۱۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ
۳۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ
۳۳۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۙ
۳۴۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ
۳۵۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۧ

ترجمہ

۲۹۔ اور وہ لوگ جو اپنے دامن کو بے عفتی سے محفوظ رکھتے ہیں۔
۳۰۔ اور اپنی بیویوں اور کنیزوں کے سوا (جو بیویوں کے حکم میں ہیں) وہ کسی سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے، اور ان سے بہرہ مند ہونے پر ان کی کوئی ملامت نہیں ہوگی۔
۳۱۔ اور جو شخص اس سے زیادہ طلب کرے تو وہ تجاوز کرنے والا ہے۔
۳۲۔ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرتے ہیں۔
۳۳۔ اور وہ لوگ جو شہادتِ حق کے ادا کرنے کے لیے قیام کرتے ہیں۔
۳۴۔ اور وہ لوگ جو نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔
۳۵۔ یہی لوگ جنت کے باغات میں عزت و تکریم سے رہیں گے۔

تفسیر

بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصّہ

گزشتہ آیات میں مومنین اور ان لوگوں کی، جو قیامت میں اہل جنت ہوں گے، مخصوص اوصاف میں سے چار صفات کا بیان ہوا تھا اور ان آیات میں دوسری پانچ صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو مجموعی طور پر نو صفات ہو جاتی ہیں۔

پہلی توصیف کے بارے میں فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی عفت[1] کی حفاظت کرتے ہیں" (والذین ھم لفروجھم حافظون)۔

"مگر اپنی بیویوں اور کنیزوں کی نسبت، جن سے فائدہ اٹھانے میں انھیں کسی قسم کی ملامت اور سرزنش نہیں ہے (الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ خواہش جنسی، انسان کی سرکش خواہشات میں سے ہے اور بہت سے گناہوں کا سرچشمہ ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ تمام اہم جرائم کے اعمال ناموں میں، اسی خواہش کا اثر نظر آتا ہے، اس لیے اس پر کنٹرول کرنا اور اس کے حدود کی حفاظت کرنا، تقویٰ و پرہیزگاری کی اہم نشانیوں میں سے ہے، اسی بناء پر نماز، ضرورت مندوں کی مدد، قیامت کے دن پر ایمان اور عذاب الٰہی سے خوف کے ذکر کے بعد، اسی خواہش پر کنٹرول کا ذکر ہوا ہے۔

وہ استثناء جو اس کے ذیل میں بیان ہوا ہے، وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام کی ہرگز یہ منطق نہیں ہے کہ یہ غریزہ اور خواہش کلی طور پر محو اور نابود ہو جائے اور کوئی شخص راہبوں اور پادریوں کی طرح قانونِ خلقت کے برخلاف قدم اٹھائے، کیونکہ یہ عمل غالباً غیر ممکن ہے اور یہ فرض امکان غیر منطقی ہے، اسی لیے راہب بھی اس خواہش کو زندگی کے منظر سے حذف نہیں کر سکے اور اگر وہ رسمی طور پر شادی بیاہ نہیں کرتے، تو ان میں سے بہت سے "چون بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" (جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو پھر دوسرا ہی کام کرتے ہیں)۔

اور اس طریقہ سے جو رسوائیاں ہوئی ہیں وہ کم نہیں ہیں، مسیحی مؤرخین "دیل دورانت" وغیرہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

"ازدواج" کی تعبیر دائمی اور مؤقت دونوں بیویوں کے لیے استعمال ہوتی ہے اور یہ جو بعض نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت "ازدواج موقت" (متعہ) کی نفی کرتی ہے، اس بناء پر ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ (عقد متعہ) بھی ازدواج (شادی) کی ایک قسم ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "اور جو لوگ اس کے علاوہ طلب کریں وہ تجاوز کرنے والے، اور خدائی حدود سے خارج ہیں" (فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ھم العادون)۔

---

[1] "فروج" "فرج" کی جمع ہے۔ عضو تناسل کی طرف کنایہ ہے۔

اور اس طرح سے اسلام ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالتا ہے کہ جس میں فطری غرائز و خواہشات کا جواب بھی مل سکے اور وہ فحشاء و فساد جنسی اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بھی آلودہ نہیں ہے۔

البتہ کنیزیں اسلام کے نقطہ نظر سے بیوی کے بہت سے شرائط اور قانونی ضابطوں کی حامل ہیں، اگرچہ ہمارے زمانے میں ان کا موضوع نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے اور تیسرے اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں" (والذین ھم لاماناتھم و عھدھم راعون)۔

البتہ "امانت" کا ایک وسیع معنی ہے، جو نہ صرف لوگوں کی ہر قسم کی مادی امانتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، بلکہ خدا، پیغمبروں اور ائمہ معصومین کی امانتوں کو بھی شامل ہے۔

خدا کی نعمتوں میں سے ہر نعمت اس کی ایک امانت ہے، اجتماعی مناصب خصوصاً حکومت کا منصب اہم ترین امانتوں میں سے ہے، اسی لیے امام باقرؑ اور امام صادقؑ کی مشہور حدیث میں آیہ "ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا" کی تفسیر میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "ولایت و حکومت کو اس کے اہل کے سپرد کرو"۔[1]

سورۂ احزاب کی آیہ ۷۲ میں بھی یہ آیا ہے کہ تکلیف و مسئولیت (فرائض و واجبات) کا مسئلہ، خدا کی ایک عظیم امانت ہے: (انا عرضنا الامانۃ علی السماوات و الارض) اور سب سے اہم ترین، خدا کا دین و آئین اور اس کی کتاب قرآن، اس کی عظیم امانت ہے، جس کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیے۔

"عہد" بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو لوگوں کے عہد اور پیمانوں کو بھی شامل ہے اور خدا کے عہد اور پیمانوں کو بھی۔ کیونکہ "عہد" ہر وہ اقرار اور وعدہ ہے جو انسان دوسرے کے ساتھ کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاتا ہے، تو اس نے اس ایمان کے ساتھ ہی بہت وسیع ذمہ داریوں کو قبول کر لیا ہے۔

اسلام میں امانت کی حفاظت اور معاہدوں کا پابند ہونے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسے اسلام کی اہم ترین نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۳ ص ۴۲۲، سورۂ نساء کی آیہ ۵۸ کے ذیل میں، تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

چوتھی صفت کے بارے میں مزید کہتا ہے: "وہ لوگ جو شہادتِ حق کی ادائیگی کے لیے قیام کرتے ہیں" (والذین ھم بشھاداتھم قائمون)۔

کیونکہ عادلانہ شہادت کو قائم کرنا اور اس کو نہ چھپانا انسانی معاشرے میں قیام عدالت کی اہم ترین بنیادوں میں سے ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۱ ص ۳۰۰

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں، کہ ہم کسی کے خلاف گواہی دے کر ان کی عداوت و دشمنی مول کیوں لیں، اور اپنے لیے دردِ سر کیوں پیدا کریں، ایسے لوگ حقوق انسانی کی طرف سے بے اعتنا، روحِ اجتماعی کے ناقد اور اجرائے عدالت کے سلسلہ میں غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو کئی آیات میں شہادتِ حق کی دعوت دی ہے اور شہادت کے چھپانے کو گناہ قرار دیا ہے[۱]۔ فقہ اسلامی میں بھی شہادت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، اور بہت سے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے اثبات کے لیے بنیاد شمار ہوئی ہے، اور اس کے لیے خاص احکام ہیں۔

آخری صفت میں جو حقیقت میں اس مجموعۂ صفات کی نویں صفت ہے، پھر دوبارہ نماز کے مسئلہ کی طرف لوٹتا ہے، جیسا کہ ان کا آغاز بھی نماز ہی سے ہوا تھا، فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں (والذین ھم علیٰ صلاتھم یحافظون)۔

اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، بعض قرائن کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نماز" "واجب نماز" کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ آیت میں "نماز نافلہ" کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ پہلی صفت میں، نماز کے ہمیشہ قائم رکھنے کی طرف اشارہ تھا، لیکن یہاں اس کے آداب و شرائط، ارکان و خصوصیات کی حفاظت کے متعلق گفتگو ہے، ایسے آداب جو نماز کے ظاہر کو بھی اس چیز سے کہ جو باعثِ فساد ہے، محفوظ رکھتے ہیں اور روحِ نماز کو بھی، جو حضورِ قلب ہے۔ تقویت دیتے ہیں اور اخلاقی رکاوٹوں کو بھی جو اس کی قبولیت کی راہ میں مانع ہوتے ہیں، دُور کر دیتے ہیں، تو اس بناء پر یہ ہرگز تکرار شمار نہیں ہوگا۔

یہ آغاز و اختتام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ ان تمام اوصاف میں، نماز کی طرف توجہ، ان سب سے زیادہ برتر اور سب سے زیادہ اہم ہے، ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ "نماز تربیت کا عالی مکتب" اور تہذیبِ نفوس اور معاشرہ کی پاکسازی کا اہم ترین وسیلہ ہے۔

اور اس گفتگو کے آخر میں، ان اوصاف والوں کی اصلی راہ کو بیان کرتا ہے، جیسا کہ گزشتہ آیات میں مجرموں کی اصلی راہ کی تشریح کی تھی۔ یہاں ایک مختصر اور پُر معنی جملہ میں فرماتا ہے: "وہ لوگ جو ان اوصاف کے حامل ہیں، ان کا ٹھکانا جنت کے باغات ہیں اور انھیں ہر لحاظ سے عزت کے ساتھ رکھا جائے گا۔ (اولئک فی جنات مکرمون)[۲]۔

وہ محترم اور معزز کیوں نہ ہوں؟ جبکہ وہ خدا کے مہمان ہیں اور خدائے قادر و رحمٰن نے، تمام ضروری وسائل ان کے لیے فراہم کر دیئے ہیں، اور حقیقت میں یہ دونوں تعبیریں ("جنات" و "مکرمون") مادی و معنوی دونوں قسم کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس گروہ کے شاملِ حال ہوں گی۔

---

[۱] بقرہ ۲۸۳ - ۱۴۰ مائدہ ۱۰۶ و طلاق ۲

[۲] "فی جنات"، "اولئک" کی خبر ہے اور "مکرمون" دوسری خبر ہے، یا یہ کہ "مکرمون" خبر ہے اور "فی جنات" اس سے متعلق ہے (غور کیجیے)

۳۶۔ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۙ

۳۷۔ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝

۳۸۔ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۙ

۳۹۔ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

۴۰۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۙ

۴۱۔ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ ان کفار کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔

۳۷۔ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی (جنت کی طمع ہے)۔

۳۸۔ کیا ان میں سے ہر ایک کو یہ طمع ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے۔

۳۹۔ ہرگز ایسا نہیں ہو گا، ہم نے انھیں اس چیز سے پیدا کیا ہے، جس کا انھیں خود علم ہے۔

۴۰۔ مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم، ہم اس بات پر قادر ہیں۔

۴۱۔ کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں، جو ان سے بہتر ہیں اور ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے۔

تفسیر

کس منہ سے جنّت کی طمع؟

اس سورہ کی گزشتہ آیات میں، مومنین اور کفار کی نشانیوں اور ان دونوں گروہوں کی سرنوشت کے بارے میں مختلف مباحث آئے ہیں، اوپر والی آیات میں پھر کفار کی وضع و کیفیت اور مقدساتِ اسلام کے بارے میں ان کے استہزاء اور تمسخر کی تفصیل کی طرف لوٹتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات مشرکین کے ان گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس وقت جبکہ پیغمبرؐ معاد کی آیات کو

مسلمانوں کے سامنے پڑھتے تھے، تو وہ ہر گوشہ و کنار سے آجاتے تھے اور یہ کہتے تھے، کہ اگر معاد ہوئی تو ہماری وضع و کیفیت اس عالم میں بھی، ان افراد سے جو تجھ پر ایمان لائے ہیں، بہتر ہوگی، جیسا کہ اس دنیا میں بھی ہماری وضع و کیفیت ان سے بہتر ہے۔

قرآن ان کے جواب میں اس طرح کہتا ہے:

"ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے، جو سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔ (فمال الذین کفروا قبلک مهطعین)۔

دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ در گروہ آتے ہیں اور جنت کی طمع رکھتے ہیں"۔ (عن الیمین و عن الشمال عزین)۔

"کیا ان میں سے ہر ایک یہ طمع رکھتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے گا" (ایطمع کل امرئ منهم ان یدخل جنة نعیم)۔

یہ کون سے ایمان اور کون سے عمل کی بناء پر اپنے لیے اس قسم کی شائستگی اور لیاقت کے قائل ہیں؟!

"مهطعین" "مهطع" کی جمع ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے، جو گردن اٹھا کر تیزی کے ساتھ چلتا ہے اور کسی چیز کی جستجو میں ہوتا ہے اور کبھی صرف خبر معلوم کرنے کے لیے گردن اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔

"عزین" "عزة" (بروزن ہبہ) کی جمع ہے، جو پراگندہ جماعتوں اور گروہوں کے معنی میں ہے اور اس کا ریشہ اور اصلی جڑ "عزو" (بروزن جذب) نسبت دینے کے معنی میں ہے اور چونکہ وہ گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نسبت اور ارتباط رکھتے ہیں، یا ان کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے لہٰذا جماعت اور گروہ کو "عزہ" کہا گیا ہے۔

بہر حال خود غرض اور خود پرست مشرکین اس قسم کے بہت سے بے بنیاد دعوے رکھتے تھے اور اپنی مادی زندگی کے مرفہ اور خوش حال ہونے کو ——— جو عموماً ناجائز اور لوٹ مار وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، خدا کی بارگاہ میں اپنے مقام کی بلندی اور پروردگار کے نزدیک اپنی محبوبیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے بعد ایک بے معنی موازنہ کے ساتھ قیامت میں اپنے لیے بلند مقامات کے قائل تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ "معاد" پر اس طرح سے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے، عقیدہ نہیں رکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی احتمال کی بناء پر معاد پر بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہم اس دوسرے جہان میں اس طرح اور ایسے ہوں گے، شاید وہ یہ بات استہزاء اور تمسخر کے طور پر بھی کہتے تھے۔

یہاں قرآن ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ بہشت میں داخل ہو جائیں، کیونکہ ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے، اس کا انھیں خود علم ہے"۔ (کلا انا خلقناهم مما یعلمون)۔

درحقیقت خدا یہ چاہتا ہے کہ پہلے تو اس جملہ کے ذریعہ ان کا غرور اور تکبر توڑ دے، کیونکہ وہ کہتا ہے: تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے تمھیں کس چیز سے پیدا کیا ہے"؟ ایک بے قدر و قیمت نطفہ سے، ایک گندے اور پست پانی سے، تو پھر یہ اتنا غرور و نخوت کس بناء پر ہے؟۔

دوسرے معاد کا مذاق اڑانے والوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تم معاد و قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو، تو جاؤ اور نطفہ کی حالت کی تحقیق کرو اور دیکھو کہ ہم ایک بے قدر و قیمت پانی کے قطرے سے کس طرح ایک نیا اور عمدہ وجود پیدا کر دیتے ہیں، جو جنین کی صورت میں ہر روز ایک نئی خلقت اختیار کرتا ہے۔

تو کیا نطفہ سے انسان کو پیدا کرنے والا، اس بات پر قادر نہیں ہے، کہ وہ مٹی ہو جانے کے بعد، انسان کے بدن پر لباسِ حیات پہنا دے۔

"تیسرے" یہ لوگ کس طرح جنت کی طمع رکھتے ہیں، جبکہ وہ اپنے صحیفۂ اعمال میں اس قدر افعال گناہ رکھتے ہیں، کیونکہ وہ موجود جو ایک بے قدر و قیمت نطفہ سے پیدا ہوا ہے، مادی لحاظ سے تو کوئی شرافت و عظمت نہیں رکھتا، اگر کوئی شرف ہے تو وہ ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ہے اور وہ ان کے پاس نہیں ہے، تو پھر یہ لوگ کس طرح توقع رکھتے ہیں کہ وہ جنت کے باغوں میں قدم رکھیں گے [1]

اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم ہم اس بات پر قادر ہیں ....."؛ (فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقادرون)۔

"کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں جو ان سے بہتر ہیں، اور ہم ہرگز بھی اس کام میں مغلوب نہیں ہوں گے" (علی ان نبدل خیرًا منهم وما نحن بمسبوقین)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم نہ صرف اس بات پر قادر ہیں کہ انھیں مٹی ہو جانے کے بعد نئی زندگی اور حیات کی طرف پلٹا دیں، بلکہ ہم انھیں ایک زیادہ کامل اور بہتر موجودات میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں، اور اس کام میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

اس طرح سے اوپر والی تعبیر قیامت کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمارے لیے کوئی مانع نہیں ہے کہ ہم تمھیں تمھارے کیفر کردار کی بناء پر نابود کریں اور شائستہ، آگاہ اور مومن افراد کو تمھارا جانشین بنا دیں، تاکہ وہ ہمارے پیغمبرؐ کے یار و مددگار ہوں، ہمیں اس کام سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

اس بناء پر اگر ہم تم سے یہ اصرار کرتے ہیں کہ تم ایمان لے آؤ، تو وہ کسی حاجت یا عجز کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ بشر کے لیے

---

[1] اوپر والی آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ "مما یعلمون" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انھیں عقل و شعور کے ساتھ پیدا کیا ہے، نہ کہ حیوانات اور بہائم کی طرح، اس بناء پر وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انھیں ایسے اہداف و مقاصد کے لیے جنھیں وہ خود جانتے ہیں۔ یعنی انھیں فرائض کی ادائیگی اور اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ سب احتمال بعید نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اکثر مفسرین نے وہی معنی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، قبول کیا ہے۔

ہدایت وتربیت کی ،مصلحت کلی کا تقاضا ہے ۔

"رب المشارق والمغارب "(مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہی خدا جو اس بات پر قادر ہے، کہ اتنے عظیم سورج کو ہر روز ایک نئے مشرق اور ایک نئے مغرب میں قرار دیتا ہے، اور یہ حساب کتاب اتنا دقیق ہو کہ وہ کئی ملین سال سے اپنے سالانہ دورے کو بے کم وکاست طے کرے، تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ایک دفعہ پھر انسان کو زندگی کی طرف لوٹا دے ، اور اسے ایک نئی زندگی بخش دے ، یا ایک گروہ کو لے جائے اور کسی دوسرے شائستہ اور لائق گروہ کو ان کا جانشین بنا دے ۔

ایک نکتہ

"مشارق" و "مغارب" کا خدا

قرآن مجید کی آیات میں کبھی تو "مشرق ومغرب" کی تعبیر مفرد کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۱۵ میں و للہ المشرق والمغرب "مشرق ومغرب خدا ہی کے لیے ہے اور کبھی تثنیہ کی صورت میں آئی ہے ، مثلاً سورۂ رحمٰن کی آیہ ۱۷ میں " رب المشرقین ورب المغربین ، "دو مشرقوں کا پروردگار اور دو مغربوں کا پروردگار" اور کبھی "جمع" کی صورت میں المشارق و المغارب جیسے زیر بحث آیت ہے ۔

بعض کوتاہ نظر لوگوں نے ان تعبیروں کو متضاد خیال کیا ہے، حالانکہ وہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، اور ہر ایک کسی ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ سورج ہر روز ایک نئے نقطہ سے طلوع اور ایک نئے نقطہ میں غروب کرتا ہے، اس بناء پر سال کے دنوں کی تعداد کے برابر مشرق ومغرب ہیں اور دوسری طرف ان تمام مشرقوں اور مغربوں میں دو مشرق اور دو مغرب ممتاز ہیں، جن میں سے ایک موسم گرما کے آغاز میں یعنی مدار شمالی میں، خورشید کی بلندی کی زیادہ سے زیادہ حد کے موقع پر، اور ایک موسم سرما کے آغاز میں، یعنی مدار جنوبی میں سورج کے نیچے آنے کی آخری حد (جن میں سے ایک کو "مدار راس السرطان" سے اور دوسرے کو "مدار راس الجدی" سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں پورے طور پر مشخص ہیں لہٰذا خصوصیت کے ساتھ ان کی بات ہوئی ہے، ان کے علاوہ دوسری دو مشرقیں اور دو مغرب بھی ہیں، جنھیں مشرق اعتدالی اور مغرب اعتدالی کا نام دیتے ہیں (اوّل بہار اور اوّل خزاں میں جبکہ ساری دنیا میں رات دن برابر ہوتے ہیں) یہ بھی مشخص ہیں اور بعض نے رب المشرقین و رب المغربین" کو اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور یہ بھی قابل توجہ ہے ۔

لیکن جہاں یہ مفرد کی صورت میں ہے تو وہاں جنس کا معنی رکھتا ہے، کہ توجہ صرف اہل مشرق ومغرب پر رہے، قطع نظر اس سے کہ افراد پر نظر کی جائے، اس طرح سے اوپر والی مختلف تعبیروں میں ہر کوئی ایک نکتہ رکھتی ہے اور انسان کو سورج کے طلوع وغروب کے مختلف تغیرات، اور سورج کے مداروں کے منظم تغیرات کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔

۴۲۔ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ۙ

۴۳۔ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۙ

۴۴۔ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل میں غوطہ زن رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں۔

۴۳۔ وہی دن جب وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ نکلیں گے، گویا وہ اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

۴۴۔ درآنحالیکہ ان کی آنکھیں شدت وحشت سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت وخواری کے پردہ نے انھیں ڈھانپ رکھا ہوگا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہی دن ہے، جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔

تفسیر

گویا اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں

ان آیات میں جو سورۂ معارج کی آخری آیات ہیں۔ ہٹ دھرم، ٹھٹھہ کرنے والے اور سخت کافروں کو انذار وتہدید کے عنوان سے فرماتا ہے: "انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل مطالب میں ڈوبے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں" (فذرھم یخوضوا ویلعبوا حتّٰی یلاقوا یومھم الذی یوعدون)[1]۔

---

[1] "یخوضوا" "خوض" (بروزن حوض) کے مادہ سے اصل میں پانی میں چلنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد کنایہ کے طور پر ان موارد میں جہاں انسان باطل مطالب میں غوطہ زن ہو، استعمال ہوا ہے۔

اس سے زیادہ استدلال اور موعظہ کی ضرورت نہیں ہے، وہ نہ تو اہل منطق ہیں اور نہ ہی بیدار ہونے کے لیے آمادگی رکھتے ہیں، چھوڑو انھیں وہ اپنی باطل اور بے ہودہ باتوں میں غوطہ زن ہیں اور بچوں کی طرح کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ ان کا موعود دن، قیامت کا دن آن پہنچے اور وہ ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔

یہ آیت اسی تعبیر کے ساتھ اور کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر سورۂ زخرف کی آیہ ۸۳ میں بھی آئی ہے۔

اس کے بعد اس موعود دن کا تعارف کراتے ہوئے اس وحشت ناک اور ہولناک دن کی نشانیاں بیان کرتا ہے، اور فرماتا ہے: وہی دن جس میں وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ خارج ہوں گے اور اس طرح تیزی سے چل رہے ہوں گے، گویا کہ وہ اپنے بتوں کی طرف جا رہے ہیں" (یوم یخرجون من الاجداث سراعًا کانھم الیٰ نصب یوفضون)۔

کیسی عجیب تعبیر ہے؟ قیامت میں ان کی حالت کی کیفیت کی، جبکہ وہ تیزی کے ساتھ دادگاہ عدلِ الٰہی کی طرف چل رہے ہوں گے ان کے کسی جشن یا عزا کے دن بتوں کی طرف، ہجوم کرنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، لیکن وہ کہاں اور یہ کہاں؟ اور حقیقت میں یہ ان بے ہودہ عقائد کے بارے میں، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، ایک تمسخر اور استہزاء ہے۔

"اجداث" "جدث" (بروزن عبث) کی جمع ہے جو "قبر" کے معنی میں ہے۔

"سراع" "سریع" کی جمع ہے (جیسے ظراف وظریف) اس شخص یا چیز کے معنی میں ہے، جو جلدی سے چلے۔

"نصب" "نصیب" کی جمع ہے اور وہ بھی بعض کے قول کے مطابق "نصب" (بروزن سقف) کی جمع ہے، یہ اصل میں اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی جگہ نصب ہوئی ہو اور ان بتوں کو بھی کہتے ہیں، جنھیں ایک پتھر کے ٹکڑے کی صورت میں کسی جگہ نصب کر کے اس کی پرستش کرتے تھے، اور اس کے اوپر قربانی کر کے اس کا خون اس پر ڈال دیتے تھے اور اس میں اور "صنم" میں یہ فرق تھا کہ "صنم" تو وہ بت تھا، جس کی کوئی خاص شکل وصورت ہوتی تھی، لیکن "نصب" پتھر کے ایسے ٹکڑے ہوتے تھے جن کی کوئی مشکل وصورت نہیں ہوتی تھی جن کی وہ کسی سبب سے پرستش کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۳ میں آیا ہے کہ وہ حرام گوشتوں میں سے اس جانور کے گوشت کو بھی شمار کرتے تھے جو ان بتوں پر ذبح ہوتے تھے (وما ذبح علی النصب)

"یوفضون" "افاضہ" کے مادہ سے، تیز چلنے کے معنی میں ہے، پانی کے چشمہ سے چلنے کی تیزی سے مشابہ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں نصب سے مراد وہ پرچم ہیں جنھیں لشکروں یا قافلوں کے درمیان کسی ایک جگہ نصب کر دیتے ہیں اور ہر شخص تیزی سے اپنے آپ کو ان تک پہنچاتا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد دوسری نشانیاں پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ اس حالت میں ہوگا کہ ان کی آنکھیں ہول اور وحشت کی وجہ سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ خضوع کے ساتھ دیکھ رہے ہوں گے" (خاشعۃ ابصارھم)۔

"اور ذلت وخواری کے پردہ نے انھیں ڈھانپ رکھا ہوگا" (ترھقھم ذلّۃ)۔[1]

---

[1] "ترھقھم" "رھق" (بروزن سفق) کے مادہ سے، جبری طور پر ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "یہ وہی دن ہے جس کا انھیں وعدہ دیا جاتا تھا"۔ (ذالك اليوم الذى كانوا يوعدون)۔

ہاں! یہ وہی موعود دن ہے، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور بعض اوقات یہ کہا کرتے تھے: فرض کریں کوئی ایسا دن ہو بھی تو پھر بھی ہماری حالت مومنین سے بہتر ہوگی، لیکن اس دن ان میں شدت خوف، دہشت و شرمساری کی وجہ سے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی، ذلت کا گرد و غبار ان کے سر اور چہرہ پر پڑا ہوا ہوگا، اور وہ غم واندوہ کے ہالے میں گھرے ہوئے ہوں گے، یقیناً اس دن وہ نادم و پشیماں ہوں گے، لیکن کیا فائدہ؟

خداوندا! اس ہولناک دن ہمیں اپنی رحمت کے پردے میں ڈھانپ لینا۔

پروردگارا! شیطان کے جال سخت، ہوائے نفس غالب اور لمبی چوڑی آرزوئیں فریب دینے والی ہیں، تو خود ہی بیداری و آگاہی اور راہ ہدایت سے عدم انحراف کی ہمیں توفیق مرحمت فرما۔

بارِ الٰہا! ہمیں ان مومنین میں سے قرار دے، جنھوں نے اپنے عہد کو وفا کرنے، اور تیری اطاعت کے لیے کمر ہمت باندھی ہوئی ہے

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ معارج۔ ۲۱ ذی الحجۃ الحرام

۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۱۵ محرم ۱۴۰۸ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۸۷ء بروز بدھ

بوقت تقریباً ساڑھے سات بجے صبح۔ ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن

لاہور

صفدر حسین نجفی

سُورۂ نوح

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۲۸ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۰۶ھ

سُورۂ نوح کے مطالب ومضامین

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، نوح پیغمبر کی سرگزشت بیان کرتی ہے، قرآن مجید کی کئی سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہوا ہے، ان میں سے سورۂ شعراء، مومنون، اعراف اور انبیاء ہیں، اور سب سے زیادہ تفصیل سُورۂ ہود میں آئی ہے، جس میں تقریباً ۲۵ آیات اس "اولوالعزم" پیغمبر کے بارے میں ہیں (آیہ ۲۵ تا ۴۹)۔

لیکن سُورۂ نوح میں جو کچھ آیا ہے، وہ ان کی زندگی کا ایک خاص حصّہ ہے، جو دوسری جگہ پر اس طرح سے نہیں آیا، اور یہ حصّہ ان کی توحید کی طرف دعوت دینے، اس کی کیفیت، اس دعوت کے عناصر، اور ان جزئیات کے بارے میں جو اس اہم مسئلہ میں بروئے کار آئے ہیں ——— اور وہ بھی اس ہٹ دھرم، خود غرض اور متکبر قوم کے مقابلہ میں جو حق کے سامنے سر جھکانے کے لیے بالکل تیار نہ تھی ——— پے در پے اور مسلسل دعوتِ حق دینے کے ساتھ مربوط ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ اور اس زمانہ کے تھوڑے سے مسلمان، نوح اور ان کے اصحاب کے زمانہ کے حالات سے مشابہ حالات رکھتے تھے، انھیں بہت سے مسائل کی تعلیم دیتا ہے اور اس واقعہ کے بیان کرنے کے اہداف و مقاصد میں سے ایک یہی ہے۔ منجملہ ان کے:

۱۔ انھیں یہ بتانا ہے کہ منطقی استدلال کے طریق سے، جو دشمنوں کے ساتھ محبت اور مکمل دلسوزی سے توأم ہو، کس طرح تبلیغ کریں اور اس راہ میں ہر مفید اور موثر ذریعہ سے کیسے فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ انھیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا کی طرف دعوت دینے کی راہ میں ہرگز نہ تھکیں، چاہے سالہا سال گزر جائیں اور دشمن کتنا بھی مزاحم کیوں نہ ہو۔

۳۔ انھیں یہ سبق دیتا ہے کہ ایک طرف تو شوق دلانے کے وسائل ہوں اور دوسری طرف ڈرانے کے عوامل، اور دعوت کرنے کے لیے دونوں طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۴۔ اس سورہ کی آخری آیات، ہٹ دھرم مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ اگر وہ حق کے سامنے نہ جھکے اور خدا کے حکم کے سامنے انھوں نے گردن خم نہ کی، تو ان کا انجام بہت دردناک ہوگا۔

۵۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ سورۂ پیغمبر اور پہلے مومنین اور ان سے مشابہ افراد کے لیے دل کی تسلّی کا سبب ہے کہ وہ خدا کے لطف و کرم سے اپنے پروگراموں میں سرگرم اور مشکلات اور سختیوں میں صابر و شکیبا رہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ سورہ، حق و باطل کے طرف داروں میں دائمی مبارزہ کے بیان اور ان پروگراموں کی، جن پر حق کے طرف داروں کو اپنی راہ میں کاربند ہونا چاہیے، تصویر کشی کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة نوح كان من المؤمنين الذين تدركهم دعوة نوح"

"جو شخص سورۂ "نوح" کو پڑھے گا، وہ ان مومنین میں سے ہو جائے گا جنھیں نوح کی دعوت کی شعاع ڈھانپ لیتی ہے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من كان يؤمن بالله واليوم الآخر ويقرأ كتابه فلا يدع ان يقرأ سورة "انا ارسلنا نوحا" فاي عبد قرأها محتسبا صابرا في فريضة او نافلة اسكنه الله مساكن الابرار واعطاه ثلاث جنان مع جنته كرامة من الله"

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی کتاب کو پڑھتا ہے، وہ سورۂ نوح کی تلاوت کو ترک نہ کرے، جو شخص اس سورہ کو، صبر و استقامت کے ساتھ، خدا کے لیے، واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا تو خدا اسے نیک افراد کی منازل میں جگہ دے گا اور جنت کے باغوں میں سے تین باغ، اس کے اپنے باغ کے علاوہ، اس کے احترام میں اسے مرحمت فرمائے گا۔[2]

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اس کی تلاوت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کے طور طریقوں، اور حق کی طرف دعوت کی راہ میں ان کے یار و انصار کے صبر و استقامت سے ہدایت حاصل کرے اور اس کی دعوت کی شعاع سے روشنی حاصل کرے، نہ کہ ایسا پڑھنا کہ جس میں غور و فکر نہ ہو، اور نہ ہی ایسا غور و فکر کہ جس میں عمل نہ ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۳۵۹

[2] ایضاً

سورۂ نوح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

١۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

٢۔ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○

٣۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ○

٤۔ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

١۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے ان سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے، اپنی قوم کو ڈراؤ۔

٢۔ انھوں نے کہا: اے قوم! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

٣۔ کہ تم خدا کی عبادت کرو اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور میری اطاعت کرو۔

٤۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور ایک معیّن وقت تک کیلئے تمھیں زندہ رکھے گا، لیکن جب خدائی اجل آگئی تو پھر تاخیر نہیں ہوگی، اگر تم سمجھو!

تفسیر

نوح کا پہلا پیغام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۂ نوح کے حالات کے اس حصہ کو بیان کرتا ہے، جو ان کی دعوت سے مربوط ہے، اور وہ راہِ حق کے تمام راہ روؤں کو، خصوصاً ہٹ دھرم قوموں کے مقابلہ میں، حق کی طرف دعوت کے سلسلہ میں، بہت سے عمدہ نکات سکھاتی ہے۔

سب سے پہلے ان کی بعثت کے مسئلہ کو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے اس سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے تم اپنی قوم کو ڈراؤ" (انّا ارسلنا نوحًا الیٰ قومہ ان انذر قومك من قبل ان یأتیھم عذاب الیم)۔

یہ دردناک عذاب، ممکن ہے دنیا کا عذاب ہو، یا آخرت کا عذاب ہو، اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں مراد ہوں، اگرچہ اس سورہ کی آخری آیات کے قرینہ سے زیادہ تر مراد دنیا کا عذاب ہے۔

"انذار" (اور ڈرانے) پر تکیہ، باوجودیکہ انبیاء ڈرانے والے بھی تھے، اور بشارت دینے والے بھی، اس بناء پر ہے کہ انذار اور ڈرانا، غالباً زیادہ قوی تاثیر رکھتا ہے، جیسا کہ تمام دنیا میں قوانین کے اجراء کی ضمانت کے لیے انذار اور سزا پر تکیہ ہوتا ہے۔

نوح ایک "اولوالعزم" پیغمبر، جو پہلی شریعت اور دینِ الٰہی کے حامل تھے، عالمی دعوت رکھتے تھے، یہ فرمان حاصل کرنے کے بعد اپنی قوم کی طرف آئے اور ان سے کہا: "اے میری قوم! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں"۔ (قال یا قوم انی لکم نذیر مبین)۔

ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم خدائے یکتا و یگانہ کی پرستش کرو، اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اسے دور پھینک دو، تقویٰ اختیار کرو اور میرے احکام کی جو خدا کے احکام ہیں اطاعت کرو (ان اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون)۔

حقیقت میں نوح نے اپنی دعوت کے مضمون کا تین جملوں میں خلاصہ بیان کیا: خدائے یکتا کی پرستش، تقویٰ کی رعایت اور ان قوانین و احکام کی، جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے اور جو عقائد و اخلاق و احکام کا مجموعہ تھے، اطاعت۔

اس کے بعد انھیں شوق دلاتے ہوئے، اور اس دعوت کو قبول کرنے کے اہم نتائج کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم میری دعوت کو قبول کر لو تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا (یغفر لکم من ذنوبکم)۔[1]

---

[1] "من" اس جملہ میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہے، کیونکہ خدا پر ایمان تمام گزشتہ گناہوں کے بخشے جانے کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حقیقت میں مشہور قاعدہ کلیہ " الاسلام یجب ما قبلہ " (اسلام اپنے سے پہلے کی چیزوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انھیں ختم کر دیتا ہے) ایک ایسا قانون ہے جو تمام توحیدی اور الٰہی دینوں میں ہے اور اسلام پر ہی منحصر نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اور تمھیں ایک معین زمانہ تک تاخیر میں ڈالتا ہے اور تمھاری عمر کو طولانی کر کے تم سے عذاب کو دور رکھتا ہے (و یؤخرکم الی اجل مسمّی)۔

"کیونکہ جب خدا کی طرف سے اصلی اور آخری اجل آجاتی ہے، تو اس میں تاخیر نہیں ہوتی، اگر تم جانتے ہو" (انّ اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر لو کنتم تعلمون)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ " اجل " اور انسانی عمر کی مدت دو قسم کی ہے، "اجل مسمّی" اور" اجل نہائی یا اخری" یا دوسرے لفظوں میں " اجل ادنی " (نزدیک کی مدت والی) اور" اجل اقصی " (دور کی مدت والی) یا" اجل معلق " (مشروط) اور" اجل حتمی" (مطلق)

پہلی قسم کی عمر کی مدت تو وہ ہے جو قابلِ تغیر ہے اور وہ انسان کے غلط اعمال کے نتیجے میں ممکن ہے کہ بہت جلدی آجائے جن میں سے ایک خدائی عذاب بھی ہے اور اس کے برعکس تقویٰ نیکو کاری اور تدبیر کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ بہت پیچھے اور تاخیر میں پڑ جائے۔

لیکن عمر کی اصلی اور آخری مدت کسی طرح بھی قابلِ تغیر نہیں ہے، اس موضوع کو ایک مثال کے ذریعے مشخص کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان عمر جاودانی اور ہمیشہ کی زندگی کی استعداد نہیں رکھتا، اگر انسانی بدن کے تمام کل پُرزے اور مشینری اچھی طرح سے کام کرتے رہیں تو آخر کار ایک ایسا وقت آجائے گا، جب کہ فرسودہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے اس کا دل خود بخود کام کرنے سے رُک جائے گا، لیکن حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت، اور بیماریوں کو وقت پر روکنے سے، انسان کی عمر کو طولانی کر سکتے ہیں، جبکہ ان امور کی رعایت نہ کرنے سے ممکن ہے کہ اس کی عمر بہت کم ہو جائے اور بہت جلدی اس کو ختم کر دے [1]

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا:

باعث ہے، مگر وہ کہ جو حق الناس سے مربوط ہے، لیکن گناہ کے لحاظ سے اور حرمت کے حکم کی وجہ سے بخشا جانا اس کو بھی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے (مثلاً فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں) احتمال دیا ہے کہ من تبعیضیہ ہے۔ یہ گزشتہ گناہوں کے بارے میں ہے، نہ کہ آئندہ والے گناہوں کے بارے میں، یہ بعید نظر آتا ہے، کیونکہ آیت میں آئندہ کے گناہوں کے بارے میں تو بات ہی نہیں ہو رہی۔

[1] حاشیہ صفحہ ھذا:۔ " اجل نہائی " اور " اجل معلق " کے بارے میں ہم نے سورۂ انعام کی آیہ ۲ (جلد ۵ ص ۱۴۸) کے ذیل میں ایک اور بحث کی ہے۔

ایک نکتہ

عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب

ایک دوسرا نکتہ جو اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، وہ عمر کے کم ہونے میں گناہوں کی تاثیر ہے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے: اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو، تو خدا تمہاری عمر کو طولانی کر دے گا اور تمہاری موت کو تاخیر میں ڈال دے گا۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گناہ ہمیشہ انسان کے جسم اور روح پر ہولناک ضربیں وارد کرتے ہیں، اس مطلب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

روایات اسلامی میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے، ان میں سے ایک پر معنی حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال، ومن یعیش بالاحسان اکثر ممن یعیش بالاعمار،

"وہ لوگ جو گناہ کے اثر سے مرتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں، جو خدائی موت سے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، اور وہ لوگ جو نیکو کاری کی بناء پر طولانی عمر پاتے ہیں، ان سے بہت زیادہ ہیں، جن کی عمر طبیعی عوامل کی بناء پر زیادہ ہوتی ہے۔"

۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۙ
۶۔ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝
۷۔ وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ
۸۔ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۙ
۹۔ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۙ

ترجمہ

۵۔ "نوح" نے کہا، پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو رات دن (تیری طرف) دعوت دی۔
۶۔ لیکن میری دعوت نے حق سے فرار کے علاوہ ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔
۷۔ اور میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں تاکہ تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور اپنے لباس سے چہروں کو ڈھانپ لیا، اور مخالفت پر اصرار کیا، اور شدت کے ساتھ استکبار کیا۔
۸۔ اس کے بعد میں نے انھیں ظاہر بظاہر (توحید اور تیری بندگی کی طرف) دعوت دی۔
۹۔ پھر میں نے علی الاعلان بھی اور پوشیدہ طور پر بھی انھیں تیری طرف بلایا۔

تفسیر

ان کی ہدایت کیلئے ہر طرح سے کوشش کی، مگر.....

ان آیات میں، اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے، نوح کی رسالت اور ماموریت کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے، خود انھیں کی زبان سے

کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں، جو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں شکایت کے طور پر کہی تھیں، جو بہت ہی سبق آموز ہیں۔

نوحؑ کی باتیں ایسی باتوں کے سلسلہ میں ہیں، جو تمام دینی مبلغین کے لیے رہنما بن سکتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے: "نوحؑ نے کہا: پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو رات دن تیری طرف دعوت دی ہے" (قال رب انی دعوت قومی لیلًا و نھارًا)۔

اور ان کی ہدایت و تبلیغ میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوتاہی نہیں کی۔

لیکن میری اس دعوت وارشاد نے، حق سے فرار کرنے کے سوا، ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا" (فلم یزدھم دعاءی الا فرارًا)۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ کسی چیز کی دعوت، اسی سے بھاگنے کا سبب بن جائے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرنے سے، کہ دعوتوں کی تاثیر، ایک قسم کی آمادگی اور کشش متقابل کی محتاج ہے، تعجب کی کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ غیر آمادہ دلوں میں معکوس اور منفی اثر ڈالے دوسرے لفظوں میں ہٹ دھرم اور حق کے دشمن افراد، جب مردان حق کی دعوت کو سنتے ہیں تو وہ اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ان کا یہی مقابلہ کے لیے کھڑے ہوجانا، انھیں راہِ حق سے زیادہ دور کردیتا ہے، اور ان کے کفر ونفاق کو اور بھی زیادہ راسخ بنادیتا ہے۔

یہ بات ٹھیک اسی چیز کے مانند ہے جو سورۂ اسراء کی آیہ ۸۲ میں آئی ہے: "و ننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمة للمؤمنین ولا یزید الظالمین الا خسارًا) ہم نے قرآن میں ایسی آیات نازل کی ہیں جو مومنین کیلئے شفا اور رحمت کا سبب ہیں، لیکن ظالموں میں سوائے خسارے اور نقصان کے کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتیں"۔

اور قرآنی آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہ آسمانی کتاب پرہیزگاروں کے لیے باعثِ ہدایت ہے "ھدًی للمتقین" (البقرہ ـــ ۲) اسی وجہ سے ہے کہ انسان میں کچھ نہ کچھ تقویٰ کا وجود ہونا چاہیے تاکہ وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، یہ مرحلہ وہی "حقیقت جوئی کی روح" اور حق کی گفتگو کو قبول کرنے کی آمادگی ہے۔

اس کے بعد نوحؑ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتے ہیں "خداوندا! میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں اور تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنے لباسوں کو اپنے اوپر لپیٹ لیا اور مخالفت کرنے اور ایمان نہ لانے پر اصرار کیا اور شدت کے ساتھ استکبار کیا" (و انی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارًا)۔

کانوں میں انگلیاں ڈالنا اس لیے تھا کہ حق کی آواز کو نہ سنیں، اور ان کا اپنے اوپر لباس لپیٹ لینا، یا تو اس معنی میں تھا کہ وہ لباس کو سر پر ڈال لیتے تھے تاکہ وہ کانوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ڈھانپ لیں اور آواز کی معمولی سے معمولی لہر بھی کانوں کے پردے سے نہ ٹکرائے، اور وہاں سے کوئی پیغام دماغ کی طرف منتقل نہ ہو، یا وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نگاہیں اس بزرگ پیغمبر نوحؑ کے ملکوتی چہرے پر جا پڑیں۔ حقیقت میں انھیں یہ اصرار تھا، کہ نہ تو وہ اپنے کانوں سے ان کی کوئی بات سنیں، اور نہ ہی اپنی آنکھوں سے

انھیں دیکھیں۔

واقعاً یہ ایک حیرت انگیز چیز ہے کہ انسان حق کی عداوت اور دشمنی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ خود کو دیکھنے، سننے اور سوچنے تک کی بھی اجازت نہ دے۔

بعض اسلامی تفاسیر میں آیا ہے کہ اس منحرف قوم میں سے بعض لوگ اپنے بیٹوں کے ہاتھ پکڑ کر نوحؑ کے پاس لے جایا کرتے تھے اور ان سے یہ کہتے تھے: اس شخص سے ڈرتے رہنا کہیں یہ تمھیں گمراہ نہ کر دے، یہ وہ وصیت ہے جو میرے باپ نے مجھے کی تھی اور میں اب وہی وصیت تمھیں کر رہا ہوں (تاکہ میں وصیت اور خیر خواہی کا حق ادا کر دوں)[1]

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح اپنی طولانی عمر میں، کئی نسلوں کے درمیان اسی طرح دعوتِ الٰہی کی تبلیغ کرتے رہے تھے اور بالکل نہیں تھکے تھے۔

اور ضمنی طور پر اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ ان کی بدبختی کا ایک اہم عامل استکبار اور غرور تھا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ اپنے جیسے انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں، چاہے وہ خدا کا نمائندہ ہو اور اس کا دل علم و دانش اور تقویٰ و پرہیزگاری کا مرکز ہو۔ یہ کبر و غرور ہمیشہ ہی حق کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ رہا ہے اور ہم نے بشر کی تمام تاریخ میں اس کا شوم و منحوس نتیجہ، بے ایمان افراد کی زندگی میں مشاہدہ کیا ہے۔

نوحؑ اپنی باتوں کو پروردگار کی بارگاہ میں جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"خداوندا! میں نے انھیں آشکار اور ظاہر طور پر تیری توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی۔ (ثم انی دعوتھم جھارًا)۔

میں نے انھیں عمومی جلسوں میں اور بلند آواز کے ساتھ ایمان کی طرف بلایا۔

اس پر ہی قناعت نہیں کی۔ "آشکار و پنہاں"۔ توحید و ایمان کی حقیقت ان سے بیان کی ہے"۔ (ثم انی اعلنت لھم واسررت لھم اسرارًا)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق، نوحؑ نے اس ہٹ دھرم اور خود غرض جمعیت میں اپنی دعوت کے نفوذ کے لیے تین مختلف طریقے اختیار کیے۔ کبھی تو صرف مخفی طور پر دعوت کرتے تھے، تو چار قسم کے ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ (کانوں میں انگلیاں ڈال لیں، اپنے اوپر کپڑے لپیٹ لیے، کفر پر اصرار کیا اور استکبار و غرور سے کام لیا)۔ کبھی علی الاعلان اور آشکارا دعوت دیتے اور کبھی آشکارا اور پنہاں دونوں طریقوں کی دعوت سے فائدہ اٹھاتے، لیکن ان میں سے کوئی بھی مؤثر ثابت نہیں ہوئی[2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۱

[2] تفسیر "فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۱۲۶

اصولی طور پر انسان کی ساخت اور بناوٹ کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر وہ باطل کی راہ میں اس قدر آگے بڑھ جائے، کہ فساد کی جڑیں اس کے وجود میں مستحکم ہو جائیں، اور اس کے وجود کی گہرائیوں میں نفوذ کرتے ہوئے، طبیعت ثانوی کی شکل اختیار کر لیں، تو پھر نہ تو مردانِ حق کی دعوت کچھ اثر کرتی ہے اور نہ ہی خدا کے پیغامہائے رسالت ان کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ تبلیغ کے طریقے:

اوپر والی آیات میں، نوح کی دعوت کے سلسلہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ پیغمبر اور مکہ میں رہنے والے ان تھوڑے سے مومنین کے لیے، جو آپ کے ساتھ مل گئے تھے، دلی تسلی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ راہِ خدا کے تمام مبلغین کے لیے ایک عمومی پروگرام بھی پیش کیا گیا ہے۔

نوحؑ کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے شہر کے ایک عمومی مرکز میں جمع ہو جائیں گے، پھر وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ، اس حالت میں کہ وہ سب کے سب آپ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اور کان آپ کی باتوں پر لگائے ہوئے ہوں گے اور پھر وہ خدا کا پیغام انھیں پہنچائیں گے۔ بلکہ آیات کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے (اور بعض روایات میں آیا بھی ہے) کہ آپ بعض اوقات لوگوں کے گھروں میں ان کے پاس جاتے، یا کوچہ و بازار میں خصوصی طور پر انھیں آواز دیتے اور حوصلہ کے ساتھ اور محبت آمیز لب ولہجہ میں انھیں تبلیغ کرتے اور کبھی آپ ان عمومی مجالس میں، جو دوسرے مقاصد مثلاً جشن یا تعزیت کے لیے قائم ہوئی تھیں چلے جاتے اور بلند آواز میں آشکارا خدا کا فرمان ان کے سامنے پڑھتے، لیکن ہمیشہ نامطلوب ردِ عمل، توہین و استہزاء اور بعض اوقات مارنے اور زخمی کرنے کا سامنا ہوتا، لیکن اس کے باوجود وہ ہرگز اپنے کام سے دستبردار نہیں ہوئے۔

یہ عجیب و غریب حوصلہ اور اتنی عجیب دلسوزی اور بے نظیر استقامت اور کام کی لگن، دینِ حق کی راہ میں دعوت کے لیے ان کا سرمایہ تھی۔

اور سب سے بڑھ کر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ سے نو سو سال کی طویل مدت میں، تقریباً (۸۰) اسی افراد آپ پر ایمان لائے۔ اگر ہم ان دونوں اعداد کو ایک دوسرے پر تقسیم کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کی ہدایت کے لیے اوسطاً تقریباً ۱۲ سال تبلیغ کی۔

اگر مبلغین اسلام اس قسم کی استقامت اور کام کی لگن رکھتے ہوں، تو کیا اسلام ایسے مالا مال اور عمدہ مطالب و مضامین کے ہوتے ہوئے، عالمگیر نہیں ہو جائے گا؟!

۲۔ حقیقت سے فرار کیوں؟

بعض اوقات انسان اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس آسمان کے نیچے ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں، جو حق کی بات

تک سننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور اس سے دور بھاگیں؟ بات قبول کرنے کی نہیں ہے، بات صرف سننے کی ہے۔

لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ اس قسم کے افراد بہت زیادہ تھے۔

صرف قوم نوح ہی ایسی نہیں تھی کہ جب آپ انھیں توحید کی دعوت دیتے تھے، تو وہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے، اور سر اور چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے تھے، تاکہ نہ تو حق کی بات کو سنیں اور نہ ہی آپ کو دیکھیں، بلکہ قرآن کی صراحت کے مطابق، پیغمبر اسلام کے زمانہ میں بھی ایسا گروہ موجود تھا، جب پیغمبرؐ دل انگیز بلند آواز کے ساتھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے، تو وہ شور وغوغا کر کے اور سیٹیاں بجا کر اس قسم کا ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی آواز کو نہ سُن پائے، وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھٰذا القراٰن و الغوا فیہ لعلکم تغلبون "کافروں نے کہا: اس قرآن پر کان نہ دھرو اور اس کی تلاوت کے وقت شور وغوغا بلند کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (حٰم السجدۃ ـــــ ۲۶)

کربلا کی خونی تاریخ میں بھی یہ آیا ہے کہ جب امام حسینؑ سالار شہیدان نے منحرف اور کج فہم دشمنوں کو، ہدایت وارشاد، اور بیدار کرنا چاہا، تو انھوں نے اس طرح شور وغوغا کیا، کہ امام کی آواز ان میں گم ہو کر رہ گئی[1]

آج بھی یہ پروگرام اسی طرح جاری وساری ہے۔ البتہ دوسری شکلوں اور صورتوں میں، باطل کے طرفداروں نے، قسم قسم کی غلط سرگرمیوں، فاسد اور خراب کرنے والی موسیقیوں، خراب مواد اور منشیات کے ذریعہ، اس قسم کی فضا فراہم کر رکھی ہے، کہ لوگ خصوصاً نوجوان، مردانِ حق کی دلنواز آواز سُن ہی نہ سکیں۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۴۵ ص ۸

۱۰۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ
۱۱۔ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ
۱۲۔ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ
۱۳۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ
۱۴۔ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝

ترجمہ

۱۰۔ میں نے ان سے کہا: اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔
۱۱۔ تاکہ وہ آسمان کی پُربرکت بارشیں پے درپے تم پر بھیجے۔
۱۲۔ اور تمھاری فراواں مال و دولت سے مدد کرے، اور تمھارے لیے سرسبز باغات اور نہریں جاری کرے۔
۱۳۔ تم خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے؟
۱۴۔ حالانکہ اس نے تمھیں مختلف مرحلوں میں پیدا کیا ہے۔

تفسیر

ایمان کی دنیاوی جزا

نوحؑ اس ہٹ دھرم اور سرکش قوم کی ہدایت کے لیے، اپنے مؤثر بیانات کو جاری رکھتے ہوئے، اس مرتبہ بشارت و تشویق پر تکیہ کرتے ہیں اور انھیں تاکید کے ساتھ یہ وعید دیتے ہیں کہ اگر وہ شرک و گناہ سے توبہ کرلیں، تو خدا ان پر اپنی رحمت کے دروازے ہر طرف سے کھول دے گا ارشاد ہوتا ہے: "خداوندا! میں نے ان سے کہا ہے کہ تم اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو وہ بہت ہی بخشنے والا ہے (فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارًا)۔

نہ صرف یہ کہ وہ تمھیں گناہوں سے پاک کردے گا، بلکہ "اگر تم ایسا کرو تو وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں پے درپے نازل

کرے گا" (یرسل السماء علیکم مدرارًا)۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اس کی معنوی رحمت کی بارش بھی، اور مادی برکت پر برکت بارش بھی تم پر نازل ہوگی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کہتا ہے: "آسمان کو تم پر بھیجے گا" یعنی اس قدر بارش ہوگی کہ گویا آسمان برس رہا ہے؛ لیکن چونکہ وہ رحمت کی بارش ہوگی، لہٰذا نہ تو اس سے کوئی ویرانی اور تباہی ہوگی، اور نہ ہی کوئی تکلیف پہنچے گی، بلکہ وہ ہر جگہ خوشی و خرمی اور سرسبزی و شادابی کا باعث ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور تمھارے مال و اولاد میں زیادتی کرے گا" (ویمددکم باموال و بنین)۔

"اور تمھارے لیے سرسبز و شاداب باغ، اور رواں پانی کی نہریں قرار دے گا" (و یجعل لکم جنات و یجعل لکم انھارًا)۔

اس طرح سے انھیں ایک عظیم معنوی نعمت، اور پانچ عظیم مادّی نعمتوں کی وعید دی ہے۔ معنوی عظیم نعمت تو گناہوں کی بخشش اور کفر و عصیان کی آلودگی سے پاک ہونا ہے۔ باقی رہی مادی نعمتیں تو وہ مفید، برموقع اور پُر برکت بارشوں کا نازل ہونا، مال کی زیادتی، اولاد کی فراوانی، (انسانی سرمایہ) پر برکت باغات اور جاری پانی کی نہریں۔

ہاں قرآن مجید کی گواہی کے مطابق، ایمان و تقویٰ، دنیا کی آبادی کا سبب بھی ہے اور آخرت کی آبادی کا موجب بھی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب اس ہٹ دھرم قوم نے نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا، تو خشک سالی اور قحط نے انھیں گھیر لیا، اور ان کے بہت سے اموال و اولاد تباہ و ہلاک ہوگئے، عورتیں بانجھ ہوگئیں اور ان کے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو نوحؑ نے ان سے کہا: اگر تم ایمان لے آؤ تو یہ تمام مصیبتیں اور بلائیں تم سے دور ہوجائیں گی۔ لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اسی طرح سے سختی پر قائم رہے، یہانتک کہ آخری عذاب آپہنچا جس نے سب کا خاتمہ کردیا۔

اس کے بعد پھر دوبارہ ڈرانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: "تم خدا سے ڈرتے کیوں نہیں اور خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے"؟! (مالکم لا ترجون للہ و قارًا)۔[2]

"حالانکہ خدا نے تمھیں گوناگوں طریقے کی خلقتیں دی ہیں" (وقد خلقکم اطوارًا)۔

---

[1] "مدرار" "در" (بروزن جر) کے مادہ سے اصل میں پستان مادر سے "دودھ" کے گرنے کے معنی میں ہے اور پھر بارش برسنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ "مدرار" مبالغہ کا صیغہ ہے۔

[2] "وقار" وزن اور عظمت کے معنی میں ہے اور "ترجون" "رجاء" کے مادہ سے، امید کے معنی میں ہے جو بعض اوقات خوف سے توأم ہوتا ہے۔ اور سارے جملہ کا معنی یہ ہے کہ تم عظمتِ خدا کے مقابلہ میں خضوع کیوں نہیں کرتے۔

پہلے تم ایک بے قدر وقیمت "نطفہ" تھے، زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ تمھیں "علقہ" بنادیا اور اس کے بعد "مضغہ" کی صورت میں لے آیا، اس کے بعد اس نے تمھیں انسانی شکل وصورت اور جسم عطا کیا، پھر تمھارے جسم کو لباس حیات پہنایا اور تمھیں روح اور حس وحرکت دی، اسی طرح سے تم نے یکے بعد دیگرے مختلف جنینی مراحل طے کیے، یہاں تک کہ تم ایک مکمل انسان کی شکل وصورت میں، ماں سے پیدا ہوگئے، اس کے بعد زندگی کے مختلف اطوار اور زندگی کی مختلف شکلیں شروع ہوگئیں۔ تم ہمیشہ اس کی ربوبیت کے ماتحت رہے ہو اور ہمیشہ نئی سے نئی حالت اختیار کرتے ہو اور ایک جدید خلقت حاصل کرتے ہو، تو پھر تم اپنے خالق کے باعظمت آستانے پر سر تعظیم کیوں نہیں جھکاتے۔

نہ صرف جسمانی لحاظ سے تم مختلف شکلیں بدلتے ہو بلکہ تمھاری روح اور جان بھی ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تم میں سے ہر ایک، ایک نئی استعداد رکھتا ہے، اور ہر سر میں ایک نیا ذوق اور ہر دل میں ایک نیا شوق ہے اور تم سب کے سب ہمیشہ بدلتے رہتے ہو۔ بچپنے کے احساسات اپنی جگہ، جوانی کو دے دیتے ہیں اور جوانی اپنے احساسات ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کے احساسات کے حوالے کر دیتی ہے۔

اس طرح سے وہ جگہ تمھارے ساتھ ہے اور ہر قدم پر تمھاری رہبری اور ہدایت کرتا ہے اور اس کے اس سارے لطف وعنایت کے باوجود یہ کفران اور بے حرمتی کس بناء پر ہے۔؟

ایک نکتہ

"تقویٰ" اور "عمران وآبادی" میں ربط:

قرآن کی مختلف آیات سے، منجملہ ان کے اوپر والی آیات سے یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے، کہ ایمان وعدالت، معاشروں کی آبادی کا باعث ہیں اور کفر، ظلم اور گناہ ویرانی وتباہی کا سبب ہیں۔

سورۂ اعراف کی آیہ ۹۶ میں آیا ہے: ولوان اهل القرٰى اٰمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والارض "اگر شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے۔

اور سورۂ روم کی آیہ ۴۱ میں آیا ہے: ظهر الفساد فى البر والبحر بما كسبت ايدى الناس۔ خشکی اور سمندر میں، لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد برپا ہوگیا ہے۔

اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ میں آیا ہے: وما اصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم۔ "جو مصیبت بھی تمھیں پہنچتی ہے، وہ تمھارے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے"۔

اور سورۂ مائدہ کی آیہ ۶۶ میں آیا ہے ولو انهم اقاموا التوراة والانجيل وما انزل اليهم من ربهم لاكلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم۔ "اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اسے قائم رکھتے، تو وہ آسمان وزمین سے روزی کھاتے"۔ (اور آسمان اور زمین کی برکتیں انھیں گھیر لیتیں)، اور اسی قسم کی دوسری آیات مزید ہیں۔

یہ "رابطہ" صرف ایک باطنی و معنوی رابطہ ہی نہیں ہے، بلکہ معنوی رابطہ کے علاوہ ——— جس کے آثار ہمیں اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں ——— ایک واضح مادی رابطہ بھی ہے۔

کفر و بے ایمانی، مسئولیت کے عدم احساس، قانون شکنی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کرنے کا سرچشمہ بھی ہے اور یہ امور معاشروں کی وحدت کے ختم ہونے، اعتماد و اطمینان کے پایوں کے متزلزل ہونے، اقتصاد و انسانی قوتوں کے ضائع ہونے، اور اجتماعی امتداد کے درہم برہم ہونے کا سبب بھی ہیں۔

واضح رہے کہ وہ معاشرہ جس پر ان امور کی حکمرانی ہو وہ بہت جلد پیچھے چلا جاتا ہے، اور سقوط و نابودی کی راہ پر چل پڑتا ہے اور اگر ہم کچھ معاشروں کو دیکھتے ہیں، کہ وہ ایمان و تقویٰ کے نہ ہونے کے باوجود، مادی حالت کے سلسلہ میں، پیش رفت کر رہے ہیں تو اسے بھی بعض اخلاقی اصولوں کی رعایت کا مرہونِ منت سمجھنا چاہیے، جو گزشتہ انبیاء کی میراث اور خدائی رہبروں، علماء اور دانش مندوں کی صدیوں کی طویل زحمتوں کا نتیجہ ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ اسلامی روایات میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تکیہ ہوا ہے کہ استغفار اور ترکِ گناہ، روزی کی کثرت اور زندگی کی بہبود کا سبب ہیں، منجملہ ان کے:

ایک حدیث میں علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

اکثر الاستغفار تجلب الرزق

زیادہ استغفار کر، تاکہ تو روزی کو جلب کرے[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

من انعم الله عليه نعمة فليحمد الله تعالى، ومن استبطأ الرزق فليستغفر الله، ومن حزنه امر فليقل، لاحول ولا قوة الا بالله

"جسے خدا نے کوئی نعمت بخشی ہے، وہ خدا کا شکر بجا لائے، اور جس کی روزی میں کچھ تاخیر ہو تو وہ استغفار اور طلبِ بخشش کرے، اور جو کسی حادثہ کی وجہ سے غمگین ہو تو وہ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" کہے[2]

نہج البلاغہ میں بھی یہ آیا ہے کہ:

وقد جعل الله سبحانه الاستغفار سببًا لدرور الرزق ورحمة الخلق، فقال سبحانه استغفروا ربكم انه كان غفارًا يرسل السماء عليكم مدرارًا.....

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۴

[2] ایضاً

"خداوند سبحان نے استغفار کو روزی کی زیادتی، اور مخلوق کے لیے رحمت قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، کہ وہ بہت بخشنے والا ہے، اور وہ آسمانوں کی برکتوں والی بارش تم پر برساتا ہے"۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کی سزا، اسی جہان کی محرومیاں ہیں اور جب انسان اس سے توبہ کرکے پاکیزگی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرلیتا ہے تو خدا اس عذاب اور سزا کو اس سے برطرف کردیتا ہے۔[2]

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۴۲

[2] ہم نے اس سلسلہ میں "گناہ اور معاشروں کی تباہی" کے عنوان کے تحت، سورۂ ہود کی آیہ ۵۲ کے ذیل میں، ایک دوسری تشریح بھی کی ہے تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۱۲۱

۱۵۔ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ

۱۶۔ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝

۱۷۔ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ

۱۸۔ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝

۱۹۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ

۲۰۔ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ع

ترجمہ

۱۵۔ کیا تم دیکھتے نہیں، کہ خدا نے سات آسمانوں کو، ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے خلق کیا ہے؟

۱۶۔ اور چاند کو آسمانوں کے درمیان روشنی کا باعث اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا۔

۱۷۔ اور خدا نے تمھیں نباتات کی طرح سے زمین سے اگایا ہے۔

۱۸۔ پھر تمھیں اسی زمین کی طرف لوٹائے گا اور پھر تمھیں دوبارہ نکال کھڑا کرے گا۔

۱۹۔ اور خدا نے زمین کو تمھارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا ہے۔

۲۰۔ تاکہ تم اس کے وسیع راستوں اور دروں سے گزرو (اور جہاں جانا چاہو..... چلے جاؤ)۔

تفسیر

باغبانِ ہستی نے تمھیں ایک پھول کی طرح پالا ہے

حضرت "نوحؑ" ہٹ دھرم مشرکین کے مقابلہ میں، اپنے گہرے اور استدلالی بیانات کے ذریعہ، پہلے تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے وجود کی گہرائیوں میں لے گئے، تاکہ وہ آیات انفسی کا مشاہدہ کریں (جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد، جیسا کہ زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے، انھیں خلقت و آفرینش کے عالم بزرگ میں خدا کی نشانیوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اور انھیں آفاق کی سیر کی طرف لے جاتے ہیں[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

پہلے آسمان سے شروع کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے پیدا کیا ہے" (الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقا)[1]

"طباق" "باب" "مفاعلہ" کا مصدر ہے جو "مطابقہ" کے معنی میں ہے جو بعض اوقات ایک چیز کے دوسری چیز پر قرار پانے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی دو چیزوں کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مطابقت کے معنی میں ہوتا ہے، اور یہاں دونوں معنی صادق آتے ہیں۔

پہلے معنی کے مطابق ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پائے ہیں، اور ساتوں آسمانوں کی تفسیر میں جس طور پر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک قابلِ توجہ تفسیر یہ ہے کہ وہ تمام ثوابت و سیار ستارے، جنھیں ہم خوردبینوں کے ذریعے یا بغیر خوردبینوں کے آنکھ سے دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب پہلے آسمان کا حصہ ہیں اور دوسرے چھ عالم اس کے بعد ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں، جو موجودہ زمانہ کے انسان کی پہنچ سے باہر ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں انسان یہ لیاقت و استعداد پیدا کرے کہ وہ ان عجیب اور وسیع عوالم کو بھی ایک دوسرے کے بعد معلوم کرے۔[2]

اور دوسرے احتمال کی بناء پر، قرآن سات آسمانوں کی، نظم و ضبط اور عظمت و زیبائی میں، ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مطابقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: خدا نے چاند کو سات آسمانوں کے درمیان، تمھارے لیے نور اور روشنی کا سبب اور سورج کو چراغِ فروزاں قرار دیا ہے" (وجعل القمر فیھن نورًا وجعل الشمس سراجًا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ سات آسمانوں میں لاکھوں اور اربوں چمکنے والے ستارے ہیں، جو ہمارے سورج اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہیں، لیکن جو ہمارے لیے اہم ہے اور ہماری زندگی میں اثر انداز ہے وہ نظامِ شمسی کا یہی سورج اور چاند ہے۔ جن میں سے ایک تو ہماری فضائے زندگی کو دنوں میں اور دوسرا راتوں میں روشن کرتا ہے۔[3]

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) [1] اس بارے میں کہ یہ باتیں نوح کے کلام کا تتمہ اور آخری حصہ ہے یا ایسے مستقل جملے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کے خطاب کے لیے بطور جملہ معترضہ کے صادر ہوتے ہیں۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن ان میں سے بعض سوں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ نوح کے کلام کا تتمہ ہے اور آیات کا ظاہر بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اگر ان آیات کے بعد "و قال نوح" کا جملہ آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوح لوگوں سے اپنی بات ختم کرنے کے بعد بارگاہِ خدا کی طرف رخ کر کے ان کی شکایت کرتے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ھذا: [1] "طباقا" ممکن ہے مفعول مطلق ہو، یا حال ہو۔

[2] سات آسمانوں کی گوناگوں تفاسیر کے بارے میں ہم سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۹ کے ذیل میں (جلد اول تفسیر نمونہ میں) تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

[3] یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ "فیھن" کی ضمیر جو ظاہراً "سبع سماوات" کی طرف لوٹتی ہے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی، کیونکہ گفتگو ہمارے لیے نور اور روشنی کی ہے۔ اس لیے ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم "فی" کو "مع" کے معنی میں یا "ھن" کی ضمیر کو "پچھلے آسمان" کے معنی میں لیں۔

"سراج" (چراغ) کی سورج کے لیے تعبیر اور "نور" کی "چاند" کے لیے تعبیر اس بناء پر ہے کہ "سورج" کی روشنی تو خود چراغ کی طرح اسی کے اندر سے پھوٹتی ہے، لیکن چاند کا نور خود اس میں سے نہیں ہے، بلکہ اس عکس کے مشابہ ہے جو آئینہ سے منعکس ہوتا ہے، اسی لیے لفظ "نور" جو ایک عام مفہوم رکھتا ہے اس کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔

تعبیر کا یہ فرق قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتا ہے۔

ہم اس سلسلے میں سورۂ یونس کی آیہ ۵ کے ذیل میں (جلد ۶) بہت زیادہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ انسان کی خلقت کی طرف لوٹتا ہے اور مزید کہتا ہے: "خدا نے تمھیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے" (واللہ انبتکم من الارض نباتا)[1]۔

انسان کے بارے میں "انبات" کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ اولاً انسان کی پہلی خلقت مٹی سے ہے اور ثانیاً وہ تمام غذائیں جو انسان کھاتا ہے اور جن کی وجہ سے نشوونما پاتا ہے، وہ سب زمین سے ہیں۔ یا تو وہ براہ راست زمین سے ہوتی ہیں جیسے سبزیاں، غلے اور پھل یا غیر مستقیم طور پر مثلاً جانوروں کے گوشت اور ثالثاً انسان اور نباتات کے درمیان بہت زیادہ مشابہت ہے اور بہت سے ایسے قوانین جو نباتات کی غذا، تولید مثل اور نشوونما میں کارفرما ہیں وہ انسان پر بھی لاگو ہیں۔

یہ تعبیر انسان کے بارے میں بہت پُرمعنی ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مسئلہ ہدایت میں خدا کا کام صرف ایک معلم و استاد کا کام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا کام ایک باغبان کی طرح ہے جو نباتات کے بیج کو ایک مساعد ماحول میں قرار دیتا ہے تاکہ ان میں چھپی ہوئی استعداد ظہور میں آئے۔

سورۂ آل عمران کی آیہ ۳۷ میں حضرت مریم کے بارے میں بھی یہ آیا ہے: وانبتھا نباتًا حسنًا: "خدا نے بہت ہی اچھے طریقے سے مریم کے وجود کو پیدا کیا اور اس کی پرورش کی"۔ یہ سب اسی لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد مسئلہ معاد کی طرف، جو مشرکین کے لیے پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے، متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے: "اس کے بعد وہ تمھیں اسی زمین کی طرف، جس سے اس نے تمھیں اگایا تھا، دوبارہ پلٹا دے گا اور پھر دوبارہ تمھیں اس سے نکال کھڑا کرے گا (ثم یعیدکم فیھا و یخرجکم اخراجًا)۔

ابتداء میں بھی تم مٹی ہی تھے، پھر دوبارہ مٹی کی طرف لوٹ جاؤ گے اور وہی ذات جس میں یہ قدرت تھی کہ تمھیں ابتداء میں مٹی سے پیدا کرے، یہ قدرت رکھتی ہے کہ دوبارہ مٹی ہو جانے کے بعد تمھارے جسم پر دوبارہ لباس حیات پہنا دے۔

مسئلہ "توحید" سے "معاد" کی طرف یہ انتقال، جو اوپر والی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقہ پر منعکس ہوا ہے، ان دونوں مسئلوں کے نزدیکی ربط کو بیان کرتا ہے اور اس طرح نوحؑ مخالفین کے مقابلہ میں، نظام آفرینش کے طریق سے، توحید پر بھی استدلال کرتے ہیں،

---

[1] اس آیت میں ایک قاعدے کے لحاظ سے تو "انباتا" کہا جانا چاہیے تھا، لیکن آیت میں کچھ مقدر ہے اور وہ اس طرح ہے "انبتکم من الارض فنبتم نباتا" (تفسیر فخر رازی و ابوالفتوح رازی)

اور اسی طریقہ سے معاد پر بھی استدلال کرتے ہیں ۔

اس کے بعد پھر نئے سرے سے آیاتِ آفاقی اور عالم کبیر میں توحید کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور زمین کے وجود کی نعمت کے متعلق گفتگو کرتا ہے، فرماتا ہے: "خدا نے زمین کو تمھارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا، (و اللہ جعل لکم الارض بساطاً)۔[1]

یہ نہ تو ایسی سخت ہے کہ اس پر آرام اور آمد و رفت ہی نہ کر سکو اور نہ ایسی نرم کہ تم اس میں دھنس جاؤ اور اس پر چل پھر ہی نہ سکو۔

اور نہ یہ ایسی گرم اور جلانے والی ہے کہ اس پر گرمی کی وجہ سے تکلیف اٹھاؤ اور نہ ایسی سرد اور بے حرارت ہے کہ اس پر زندگی بسر کرنا تمھارے لیے مشکل ہو جائے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسا وسیع آمادہ و تیار فرش ہے۔ جس میں تمھاری زندگی کی تمام ضروریات موجود ہیں ۔

نہ صرف ہموار زمینیں ہی فرش کی طرح بچھی ہوئی ہیں بلکہ پہاڑ بھی۔ ان درّوں اور شگافوں کی وجہ سے، جو ان کے درمیان موجود ہیں اور عبور کرنے کے قابل ہیں، بچھے ہوئے فرش ہی ہیں "ہر ف و مقصد یہ ہے کہ تم ان وسیع راستوں اور درّوں سے، جو اس زمین میں موجود ہیں، گزر سکو اور جس علاقہ میں جانا چاہو جا سکو" (لتسلکوا منھا سبلاً فجاجا)۔

"فجاج" (بروزن مزاج) جمع ہے "فج" (بروزن حج) کی۔ اس درّہ کے معنی میں ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور وسیع و کشادہ راستہ کو بھی کہا جاتا ہے۔[2]

اس طرح "نوح" اپنی گفتگو کے اس حصہ میں، کبھی تو آسمانوں اور آسمان کے ستاروں میں خدا کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کبھی کرۂ زمین میں اس کی گوناگوں نعمتوں کی طرف۔ اور کبھی انسان کی ساخت اور اس کی حیات کے مسئلہ کی طرف جو خدا کی شناخت کی بھی ایک دلیل ہے اور مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے بھی۔

لیکن نہ تو پہلے انذاروں، بشارتوں اور تشویقوں نے اس ہٹ دھرم قوم کے سیاہ دل میں کوئی اثر کیا اور نہ ہی کسی منطقی استدلال نے، وہ اسی طرح سے مخالفت اور کفر پر تلے رہے اور حق کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے رہے۔ جیسا کہ بعد والی آیات میں ان کی خیرہ سری کا انجام بیان ہوا ہے ۔

---

[1] "بساط" "بسط" کے مادہ سے کسی چیز کو پھیلانے کے معنی میں ہے، اس لیے لفظ "بساط" ہر پھیلی ہوئی وسیع چیز کو کہا جاتا ہے جس کا ایک مصداق فرش ہے ۔

[2] مفردات "راغب" مادہ "فج"

۲۱۔ قَالَ نُوحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۚ

۲۲۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ

۲۳۔ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ

۲۴۔ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۝

۲۵۔ مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ۬ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝

ترجمہ

۲۱۔ نوحؑ نے (ان کی ہدایت سے مایوس ہونے کے بعد) عرض کیا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی کی، جن کے مال اور اولاد نے خسارے کے سوا ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۲۲۔ اور (ان گمراہ راہبروں نے) ایک عظیم مکر کیا۔

۲۳۔ اور انھوں نے یہ کہا کہ: اپنے خداؤں اور بتوں سے دستبردار نہ ہونا، خصوصاً "ود" و "سواع" و "یغوث" و "یعوق" و "نسر" کو نہ چھوڑنا۔

۲۴۔ اور انھوں نے بہت سے گروہوں کو گمراہ کر دیا۔ خداوندا! ظالموں میں ضلالت اور گمراہی کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہ کرنا۔

۲۵۔ (ہاں! آخرکار) وہ سب کے سب اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہو گئے اور جہنم کی آگ میں داخل ہوئے اور انھیں اپنے لیے خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا۔

تفسیر

خدا کا لطف تجھ سے مدارات کرتا ہے

جب نوح نے سینکڑوں سال تک اپنی پوری پوری کوشش کر کے دیکھ لی اور وہ قوم ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا، اسی طرح کفر بت پرستی، گمراہی اور فساد پر ڈٹی رہی، تو وہ ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے اور بارگاہِ خدا کی طرف رخ کیا، اور ایک استدلالی مناجات کے ضمن میں خدا سے ان کے لیے عذاب کا تقاضا کیا، جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں آیا۔

نوح نے کہا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال و اولاد نے خسارے کے سوا اس میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا (قال نوح رب انھم عصونی واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ الا خسارا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قوم کے رہبر ایسے لوگ ہیں، جن کا امتیاز مال و اولاد کی زیادتی ہے اور وہ مال و اولاد بھی ایسے جو فساد و خرابی کے سوا کسی کام نہیں آتے، نہ تو وہ مخلوق ہی کی خدمت کرتے ہیں اور نہ ہی خالق کے سامنے خضوع و خشوع کرتے ہیں اور یہ بکثرت وسائل و امکانات ان کے غرور و طغیان اور سرکشی کا سبب بن گئے ہیں۔

اگر ہم نوعِ بشر کی تاریخ کی طرف نگاہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف قوموں کے بہت سے رہبر اسی قماش کے تھے، وہ ایسے لوگ تھے جن کا تنہا امتیاز، مالِ حرام جمع کرنا اور غیر صالح اولاد کو وجود میں لانا اور اس کے بعد سرکشی اور طغیان اور آخر میں اپنے افکار و نظریات، مستضعف اور کمزور لوگوں پر لادنا اور انھیں زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ان گمراہ راہبروں نے مکرِ عظیم کیا" (و مکروا مکرا کبارا)۔

"کبارا" "جو" کبیر" سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہاں نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے اور نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے روکنے کے لیے بہت عظیم اور وسیع شیطانی منصوبے بنا رکھے تھے۔ لیکن وہ منصوبے کیا تھے، ٹھیک طور پر مشخص نہیں ہیں۔

احتمال یہ ہے کہ وہی بت پرستی کا مسئلہ ہوگا، کیونکہ بعض روایات کے مطابق، بت پرستی نوح سے پہلے موجود نہیں تھی۔ بلکہ نوح کی قوم نے ہی اسے ایجاد کیا تھا۔ اس مسئلہ کا سرچشمہ یہ تھا کہ آدم اور نوح کے درمیانی زمانہ میں کچھ ایسے نیک اور صالح افراد ہو گزرے تھے۔ جن سے لوگ اظہارِ محبت کیا کرتے تھے۔ شیطان (اور شیطان صفت انسانوں) نے لوگوں کے اس لگاؤ اور محبت سے سوءِ استفادہ کیا اور انھیں ان بزرگوں کے مجسمے بنانے، اور ان مجسموں کی عزت و احترام کرنے کا شوق دلایا۔

لیکن کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ بعد میں آنے والی نسلیں اس موضوع کے رابطہ تاریخی کو بھول گئیں اور انھوں نے خیال کیا کہ یہ مجسمے ایسے محترم موجودات ہیں، جن کی پرستش اور عبادت کرنا چاہیے اور اس طرح سے وہ بتوں کی پرستش میں سرگرم ہو گئے اور ظالم مستکبرین نے انھیں غفلت میں رکھ کر اس طریقے سے انھیں اپنی قید و بند میں لے لیا اور ایک عظیم مکر و فریب واقع ہوا۔

ہوسکتا ہے کہ بعد والی آیت اس مطلب کی گواہ ہو۔ کیونکہ اس عظیم گمراہی کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "ان کے رؤسا نے کہا، اپنے خداؤں اور بتوں سے دستبردار نہ ہو" (و قالوا لا تذرن الھتکم)۔

اور خدائے یگانہ کے بارے میں نوح کی دعوت ہرگز قبول نہ کرنا۔ وہ خدا جو نہ تو دکھائی ہی دیتا ہے اور نہ ہی ہاتھ کے ساتھ چھونے کے قابل ہے۔

انھوں نے خصوصیت کے ساتھ انھیں پانچ بتوں کے بارے میں تاکید کی اور کہا: "ود"، "سواع"، "یغوث"، "یعوق" اور "نسر" کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ان کے دامن کو چھوڑنا" (ولا تذرن ودًّا ولا سواعًا ولا یغوث ویعوق ونسرًا)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچوں بت کچھ خاص امتیازات رکھتے تھے اور وہ گمراہ قوم ان کی طرف خاص طور پر متوجہ تھی اور اسی بناء پر ان کے فرصت طلب رہبر بھی ان کی عبادت پر تکیہ کرتے تھے۔

یہ بات کہ یہ پانچ بت کہاں سے آئے؟ اس سلسلہ میں گوناگوں روایات ہیں۔

۱۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ پانچ نیک اور صالح افراد کے نام ہیں، جو نوح سے پہلے دنیا میں ہوگزرے ہیں۔ جب وہ دنیا سے چل بسے تو ابلیس کی تحریک پر لوگوں نے یادگار کے طور پر ان کے مجسمے بنا لیے اور ان کا احترام و عزت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ بت پرستی کی صورت اختیار کرلی۔

۲۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آدم کے پانچ بیٹوں کے نام ہیں۔ ان میں سے جب بھی کوئی دنیا سے جاتا تو اس کا مجسمہ یادگار کے طور پر بنا لیتے۔ لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یہ تعلقات فراموش ہوگئے اور نوح کے زمانہ میں ان کی پرستش کی لہر دوڑ گئی۔

۳۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ یہ ان بتوں ہی کے نام ہیں جو خود نوح کے ہی زمانہ میں بنائے گئے تھے۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ نوح لوگوں کو آدم کی قبر کے گرد طواف کرنے سے روکتے تھے تو ایک گروہ نے ابلیس کی تحریک پر اس کے کچھ مجسمے بنا لیے اور ان کی پرستش میں مشغول ہوگئے[1]

اتفاقاً یہ پانچوں بت زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرف منتقل ہوگئے، پھر ہر قبیلہ نے ان بتوں میں سے ایک کو اپنے لیے انتخاب کرلیا۔ البتہ یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ خود وہ بت منتقل ہوئے ہوں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے نام منتقل ہوئے۔ اور انھوں نے ان ناموں کے بت بنا لیے۔ لیکن بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں بت طوفانِ نوح میں دفن ہوگئے تھے اور عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں شیطان نے انھیں باہر نکالا اور لوگوں کو ان کی پرستش کی دعوت دی[2]

پھر اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے عرب قبائل میں یہ بت کس طرح تقسیم ہوئے، اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "ود" بت تو "بنی کلب" کے قبیلہ سے متعلق تھا جو سرزمین "دومۃ الجندل" میں رہتا تھا (وہ شہر جو تبوک کے نزدیک ہے اور جسے موجودہ زمانہ میں "جوف" کہتے ہیں) اور "سواع" قبیلہ "ہذیل" سے جو سرزمین "رباط" میں تھا، متعلق تھا، اور

---

[1] مجمع البیان، تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر عیاشی، روح المعانی اور دوسری تفاسیر (زیر بحث بت کے ذیل میں)۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰، ص ۶۰۷۔

"یغوث" "بت" "بنی قطیف" کے قبیلہ سے یا "بنی مذحج" کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور "یعوق" قبیلہ ہمدان سے، اور "نسر" "ذی الکلاع" قبیلہ سے جو حمیر کے قبائل میں سے تھا۔[۱]

مجموعی طور پر ان پانچ بتوں میں سے تین بت (یغوث، یعوق اور نسر) سرزمین یمن میں تھے، جو "ذونواس" کے یمن پر تسلط سے ختم ہوگئے اور اس علاقہ کے لوگ دین یہود سے وابستہ ہوگئے۔[۲]

"واقدی" مشہور مؤرخ کہتا ہے کہ "ود" بت مرد کی شکل میں تھا اور "سواع" عورت کی شکل میں "یغوث" شیر کی صورت میں اور "یعوق" گھوڑے کی شکل اور "نسر" "باز" کی صورت میں (جو ایک معروف پرندہ ہے)۔[۳]

البتہ زمانہ جاہلیت کے عربوں ـــــ خصوصاً اہل مکہ ـــــ کے پاس اور بت بھی تھے، جن میں سے ایک بت "جبل" تھا، جو ان کے بتوں میں سے سب سے بڑا تھا اور وہ خانہ کعبہ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس کا طول ۱۸ ہاتھ تھا۔ بت "اساف" حجر اسود کے مقابل تھا، اور بت "نائلہ" (خانہ کعبہ کے جنوبی کونہ میں) رکن یمانی کے سامنے تھا اور اسی طرح "لات" و "عزیٰ" بت تھے۔

اس کے بعد نوح مزید کہتے ہیں: "خداوندا! ان گمراہ اور خود غرض رہبروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا" (وقد اضلوا کثیرا)۔[۴]

"خداوندا! ظالموں میں ضلالت و گمراہی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر" (و لا تزد الظالمین الا ضلالا)۔

ظالموں اور ستم گروں میں ضلالت و گمراہی کو زیادہ کرنے سے مراد وہی ان سے توفیق الٰہی کا سلب ہونا ہے جو ان کی بدبختی کا سبب بن جاتا ہے جسے وہ اپنے ظلم کی وجہ سے پاتے ہیں، کیونکہ خدا نور ایمان کو ان سے چھین لیتا ہے اور کفر کی تاریکی کو اس کا جانشین بنا دیتا ہے۔

یہ ان کے اعمال کی خاصیت ہے، جس کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے، کیونکہ ہر موجود جو تاثیر بھی رکھتا ہے، وہ اسی کے حکم سے ہے (غور کیجیے)۔

جو کچھ بھی ہو، کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں وہ خداوند تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ کسی قسم کی منافات نہیں رکھتا اور اختیار کے سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا۔

آخر کار آخری زیر بحث آیت میں، اس سلسلہ میں آخری بات خدا یہ فرماتا ہے: "وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہوگئے اور انھیں آگ میں

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۴ و اعلام القرآن ص ۶۳۱

[۲] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۴

[۳] "اضلوا" کی ضمیر اس گروہ کے دولت مند رؤسا اور رہبروں کی طرف لوٹتی ہے اور قرینہ اس کا گزشتہ آیت ہے جو یہ کہتی ہے: و قالوا لا تذرن آلهتكم "انھوں نے کہا کہ اپنے بتوں کو نہ چھوڑو" لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ ضمیر بتوں کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ وہی گمراہی کا سبب تھے (اور اسی کے مشابہ سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۶ میں بھی آیا ہے۔ لیکن جمع مذکر کی صورت میں نہیں بلکہ جمع مونث کی ضمیر کی صورت میں) لیکن یہ احتمال زیر بحث آیت میں بہت بعید نظر آتا ہے۔

داخل کر دیا گیا اور انھیں خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا جو اس کے خشم و غضب سے ان کا دفاع کرے"۔ "مما خطیئاتھم اغرقوا فادخلوا نارًا فلم یجدوا لھم من دون اللہ انصارًا"[1]

آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ غرق ہونے کے بعد بلا فاصلہ آگ میں داخل کر دیئے گئے اور یہ عجیب بات ہے کہ پانی میں سے فوراً آگ میں داخل ہوں، اور یہ آگ وہی برزخ والی آگ ہے۔ چونکہ قرآن مجید کی آیات کی گواہی کے مطابق ایک گروہ کو موت کے بعد عالم برزخ میں سزا ملے گی اور بعض روایات کے مطابق "قبر" یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کی آگ ہے لیکن چونکہ قیامت کا وقوع قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے، لہٰذا فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوا ہے[2]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی آگ ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا کے حکم سے، طوفان کی انھیں موجوں کے درمیان ایک آگ ظاہر ہوئی اور انھیں نگل گئی[3]

---

[1] "مما خطیئاتھم" میں "من" بادعیت یا ابتدائے تعلیل کے معنی میں ہے اور "ما" یہاں زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

[2] "فخر رازی" نے اپنی تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے نقل کیا ہے جلد ۳۰ ص ۱۹۵

[3] تفسیر "ابوالفتوح رازی" جلد ۱۱ ص ۲۸۰

۲۶۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ○

۲۷۔ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○

۲۸۔ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ○

ترجمہ

۲۶۔ نوح نے کہا: پروردگارا! روئے زمین پر کفار میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ رہنے دے۔

۲۷۔ کیونکہ اگر تو انھیں رہنے دے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ایک فاجر و کافر نسل کے سوا کچھ وجود میں نہیں لائیں گے۔

۲۸۔ پروردگارا! مجھے بخش دے، اور اسی طرح میرے ماں باپ کو اور ان تمام لوگوں کو، جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ وارد ہوئے، اور تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں میں ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ فرما۔

تفسیر

اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے!

یہ آیات اسی طرح سے، نوح کی گفتگو اور خدا کی بارگاہ میں قوم کی شکایت اور ان کے بارے میں بددعا اور نفرین کو جاری رکھے ہوئے ہیں، فرماتا ہے: "پروردگارا! کفار میں سے کسی کو روئے زمین پر زندہ نہ رہنے دے" (وقال نوح رب لا تذر علی

الارض من الکافرین دیارًا)۔

یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب وہ مکمل طور پر ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے تھے اور اپنی آخری کوشش ان کے ایمان لانے کے سلسلہ میں کر چکے تھے۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے۔

"علی الارض" (صفحہ زمین پر) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح کی دعوت بھی عالمی اور جہانی تھی اور وہ طوفان اور عذاب بھی جو بعد میں آیا عالمی تھا۔

"دیار" (بروزن سیار) "دار" کے مادہ سے، اس شخص کے معنی میں ہے جو گھر میں رہائش رکھتا ہو، یہ لفظ عام طور پر نفی عموم کے موارد میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے (ما فی الدار دیار) (گھر میں کوئی نہیں رہتا)[1]

اس کے بعد نوحؑ اپنی نفرین اور بد دعا کرنے کے بارے میں استدلال کرتے ہیں اور مزید کہتے ہیں: "کیونکہ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور فاجر و کافر نسل کے سوا اور کچھ وجود میں نہیں لائیں گے"۔ (انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا)

یہ گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی نفرین و بد دعا، جن میں نوح بھی ہیں، غیض و غضب، انتقام جوئی اور کینہ پروری کی بناء پر نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ ایک منطقی حساب کی صورت میں ہوتی تھی اور نوح کم حوصلہ افراد کی طرح نہیں تھے کہ تھوڑی سی بات کے لیے آپے سے باہر ہو جائیں اور نفرین و بد دعا کرنے لگ جائیں۔ بلکہ آپ نے نو سو پچاس (۹۵۰) سال کی دعوت، صبر و شکیبائی اور خون دل پینے اور مکمل مایوسی کے بعد نفرین کے لیے زبان کھولی تھی۔

اس بارے میں کہ نوحؑ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اس کے ساتھ وہ ان بندگانِ خدا کو جو اس ماحول میں رہتے تھے گمراہ کریں گے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی آنے والی نسل بھی فاسد و مفسد ہو گی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اس غیب پر اطلاع و آگاہی کی بناء پر تھا جو خدا نے انھیں دیا تھا۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ نوحؑ نے اس مطلب کا وحی الٰہی سے استفادہ کیا تھا، جہاں فرماتا ہے: واوحی الی نوح انہ لن یؤمن من قومک الا من قد آمن۔ نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی بھی شخص سوائے ان کے جو ایمان لا چکے ہیں، ایمان نہیں لائیں گے" (سورہ ہود آیہ ۳۶)[2]

لیکن یہ احتمال بھی قابلِ قبول ہے کہ نوحؑ نے، فطری عادت اور عمومی حساب سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا، کیونکہ وہ قوم جسے ساڑھے نو سو سال تک موثر ترین بیانات کے ساتھ تبلیغ کی گئی ہو، اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے ہوں، اس کی ہدایت کی امید نہ تھی اور چونکہ یہ کافر گروہ

---

[1] بعض کا کہنا ہے کہ اصل میں "دیوار" (بروزن حیوان) تھا، اس کے بعد "واؤ" "یاء" میں بدل گئی، اور یاء کا یاء میں ادغام ہو گیا (البیان فی غرائب القرآن جلد ۶ ص ۴۶۵ و تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] اس معنی کی طرف بہت سی روایات میں اشارہ ہوا ہے (نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۸)

معاشرے میں قطعی اکثریت رکھتا تھا اور تمام وسائل و امکانات ان کے اختیار میں تھے۔ لہٰذا طبعًا وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس قسم کی قوم کی آئندہ نسل قطعی طور پر فاسد اور مُرتکب ہوتی۔ ان تینوں احتمالات کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"فاجر" اس شخص کے معنی میں ہے جو بُرے اور قبیح گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور "کفار" "کفر" میں مبالغہ ہے۔ اس بناء پر ان دو الفاظ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک عملی کاموں سے مربوط ہے اور دوسرا اعتقادی پہلوؤں سے۔

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ خدا کے عذاب "حکمت" کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ وہ جمعیت جو فاسد و مفسد ہو اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی فساد و گمراہی کے خطرے سے دوچار ہوں۔ وہ خدا کی حکمت میں زندگی اور حیات کا حق نہیں رکھتیں۔ طوفان یا صاعقہ (بجلی) یا زلزلہ یا کوئی اور دوسری بلا نازل ہوگی اور انھیں صفحہ ہستی سے مٹادے گی۔ جیسا کہ طوفانِ نوح نے زمین کو اس بری قوم کے وجود کی گندگی سے پاک کر دیا۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ قانونِ الٰہی کسی خاص زمانہ اور مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ اگر اس وقت بھی کوئی فاسد و مفسد قوم اور اس کی اولاد "فاجر" "کفار" ہو تو انھیں بھی عذابِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے، کیونکہ ان امور میں کوئی تبعیض نہیں ہے اور یہ ایک سنت الٰہی ہے۔

"یضلوا عبادك" (تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس چھوٹے سے مومنین کے گروہ کی طرف اشارہ ہو۔ جو اس طویل مدت میں نوحؑ پر ایمان لایا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ عامۃ الناس میں سے مستضعف لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو گمراہ رہبروں کے دباؤ اور فشار سے ان کے دین و مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔

آخر میں نوحؑ اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے تھے اس طرح دعا کرتے ہیں: پروردگارا! مجھے بخش دے اور اسی طرح میرے ماں باپ اور ان تمام لوگوں کو جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوئے تھے اور تمام مؤمنین و مومنات کو بھی بخش دے اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر" (رب اغفر لی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنًا وللمؤمنین والمؤمنات ولا تزد الظالمین الا تبارًا)[1]۔

یہ طلب مغفرت اس لیے ہے کہ نوحؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے صدہا سال مسلسل تبلیغ کی ہے، اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت جھیلی ہے۔ لیکن چونکہ ممکن ہے کہ اس مدت میں مجھ سے کوئی ترکِ اولیٰ سرزد ہوگیا ہو، تو میں اس کے بارے میں بھی عفو و بخشش کا تقاضا کرتا ہوں، اور تیری بارگاہ مقدس میں ہرگز خود کو بَری قرار نہیں دیتا۔

اور "اولیاء اللہ" کی حالت اسی طرح ہے کہ وہ راہِ خدا میں ہر قسم کی زحمت و تکلیف اور سعی و کوشش کے بعد بھی اپنے آپ کو مقصر سمجھتے ہیں اور ہرگز غرور و تکبر اور خود کو بڑا سمجھنے میں گرفتار نہیں ہوتے۔

نوحؑ حقیقت میں چند افراد کے لیے طلبِ مغفرت کرتے ہیں۔

---

[1] "تبار" ہلاکت کے معنی میں ہے اور "زیان اور خسارے" کے معنی میں بھی اس کی تفسیر ہوئی ہے۔

اوّلؑ: اپنے لیے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قصور یا ترکِ اولیٰ ان سے سرزد ہو گیا ہو۔
دوم: اپنے ماں باپ کے لیے، ان کی زحمتوں کی قدردانی کے باعث اور حق شناسی کے پیشِ نظر۔
سوم: تمام ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے۔ اگرچہ وہ بہت تھوڑے تھے اور پھر وہ آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے کہ وہ کشتی بھی نوح کا گھر تھی۔
چہارم: تمام جہان اور طول تاریخ میں ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کے لیے، اور یہاں سے اپنا رابطہ سارے عالم کے مومنین سے برقرار کر رہے ہیں۔
لیکن آخر میں پھر ظالموں کی نابودی کی تاکید کرتے ہیں، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے ظلم کی بناء پر اسی قسم کے عذاب کے مستحق ہیں۔

چند نکات

نوحؑ پہلے اولوالعزم پیغمبر

قرآن مجید بہت سی آیات میں نوح کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور مجموعی طور پر قرآن کی انتیس سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، اور ان کا نام ۴۳ مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔
قرآن مجید نے ان کی زندگی کے مختلف حصوں کی باریک بینی کے ساتھ تفصیل بیان کی ہے ایسے حصے جو زیادہ تر تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت حاصل کرنے کے پہلوؤں سے مربوط ہیں۔
مورخین و مفسرین نے لکھا ہے کہ نوح کا نام "عبدالغفار" یا "عبدالملک" یا "عبدالاعلیٰ" تھا اور "نوح" کا لقب انھیں اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ وہ سالہا سال اپنے اوپر یا اپنی قوم پر نوحہ گری کرتے رہے۔ آپ کے والد کا نام "لمک" یا "لامک" تھا۔ اور آپ کی عمر کی مدت میں اختلاف ہے، بعض روایات میں ۱۴۹۰ اور بعض میں ۲۵۰۰ سال بیان کی گئی ہے، اور ان کی قوم کے بارے میں بھی طولانی عمریں تقریباً ۲۰۰۰ سال تک لکھی ہیں، جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے بہت طولانی عمر پائی ہے، اور قرآن کی صراحت کے مطابق آپ ۹۵۰ سال اپنی قوم کے درمیان رہے (اور تبلیغ میں مشغول رہے)۔
نوح کے تین بیٹے تھے "حام" "سام" "یافث" اور مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ کرۂ زمین کی اس وقت کی تمام نسلِ انسانی کی بازگشت انھیں تینوں فرزندوں کی طرف ہے۔ ایک گروہ "حامی" نسل ہے، جو افریقہ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ "سامی" نسل ہے جو شرقِ اوسط اور مشرقِ قریب کے علاقوں میں رہتے ہیں اور "یافث" کی نسل کو چین کے ساکنین سمجھتے ہیں۔
اس بارے میں بھی، کہ نوح طوفان کے بعد کتنے سال زندہ رہے، اختلاف ہے، بعض نے ۵۰ سال لکھے ہیں اور بعض نے ۶۰ سال۔
یہود کے منابع (موجودہ تورات میں بھی نوح کی زندگی کے بارے میں تفصیلی بحث آئی ہے، جو کئی لحاظ سے قرآن سے مختلف ہے، اور تورات کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے۔

یہ مباحث تورات کے سفر "تکوین" میں فصل ۶، ۷، ۸، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں۔

نوحؑ کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کا نام "کنعان" تھا۔ جس نے باپ سے اختلاف کیا، یہاں تک کہ کشتیٔ نجات میں ان کے ساتھ بیٹھنے کے لیے بھی تیار نہ ہوا، اس نے بُرے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھی اور خاندانِ نبوت کی قدر و قیمت کو ضائع کر دیا اور قرآن کی صراحت کے مطابق آخر کار وہ بھی باقی کفار کے، مانند طوفان میں غرق ہو گیا۔

اس بارے میں کہ اس طویل مُدت میں کتنے افراد نوحؑ پر ایمان لائے، اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے، اس میں بھی اختلاف ہے بعض نے ۸۰ اور بعض نے ۷۰ افراد لکھے ہیں۔

نوحؑ کی داستان عربی اور فارسی ادبیات میں بہت زیادہ بیان ہوئی ہے، اور زیادہ تر طوفان اور آپ کی کشتیٔ نجات پر تکیہ ہوا ہے۔[1]

نوحؑ صبر و شکر اور استقامت کی ایک داستان تھے، اور محققین کا کہنا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے وحی کی منطق کے علاوہ عقل و استدلال کی منطق سے بھی مدد لی (جیسا کہ اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح ظاہر ہے) اور اسی بناء پر آپ اس جہان کے تمام خدا پرستوں پر ایک عظیم حق رکھتے تھے۔

ہم نوحؑ کے حالات کی تشریح کو امام باقرؑ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: نوح غروبِ آفتاب اور صبح کے وقت یہ دعا اور مناجات پڑھا کرتے تھے۔

"امسیت اشهدانه ماامسی بی من نعمة فی دین او دنیا فانها من الله وحده لا شریك له، له الحمد بها علی والشکر کثیرًا فانزل الله "انه کان عبدًا شکورًا" فهذا کان شکره"

میں نے اس حالت میں شام کی ہے کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ دین و دنیا کی جو نعمت میں رکھتا ہوں، وہ اس خدائے یگانہ کی طرف سے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور میں اس کی نعمتوں پر اس کی حمد و ثناء کرتا ہوں اور اس کا بہت بہت شکر کرتا ہوں۔

اسی بناء پر خدا نے قرآن میں یہ نازل فرمایا ہے کہ وہ شکر گزار بندہ تھا اور نوح کا شکر اسی طرح کا تھا۔[2]

۲۔ "رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنًا" "پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور جو شخص میرے گھر میں مومن وارد ہو بخش دے" کے جملہ میں لفظ "بیت" کے معنی میں اختلاف ہے مجموعی طور پر اس کے چار معانی بیان کیے گئے ہیں بعض نے اسے شخصی اور ذاتی گھر کے معنی میں لیا ہے

---

[1] "اعلام القرآن"، "فرہنگ قصص قرآن"، دائرۃ المعارف "محمد" مادہ "نوح" و "بحار الانوار جلد ۱۱"

[2] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۲۹۱ حدیث ۳

بعض مسجد کے معنی میں لیتے ہیں ۔
بعض کشتی نوح کے معنی میں لیتے ہیں اور
بعض ان کے دین وآئین وشریعت کے معنی میں جانتے ہیں ۔
ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :
"یہاں بیت سے مراد ولایت ہے ، جو شخص ولایت میں داخل ہوا وہ انبیاء کے گھر میں داخل ہوا ہے"۔
"من دخل فی الولایۃ دخل فی بیت الانبیآء علیھم السلام"

خداوندا ! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ولایت آئمہ اہل بیت کو قبول کرنے کے طریق سے بیت انبیاء میں داخل ہوں ۔
پروردگارا ! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ ہم نوحؑ ایسے بزرگ انبیاء کے مانند تیرے دین وآئین کی طرف دعوت کی راہ میں خستہ نہ ہوں ،
اور ہرگز تھک ہار کر نہ بیٹھ جائیں ۔
بارالہا ! جس وقت تیرے خشم وغضب کا طوفان آئے تو ہمیں اپنے لطف ورحمت کی نجات کی کشتی کے ذریعہ رہائی بخش دے ۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ نوح

اوّل ماہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ بوقت تقریباً پونے سات بجے صبح
۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷ء
۱۸۱ ۔ ای ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور
صفدر حسین نجفی

سُورۂ جن

یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۲۸ آیات ہیں

شروع
۲، محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

سورۂ جن کے مضامین و مطالب

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، زیادہ تر ایک دکھائی نہ دینے والی مخلوق کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جسے "جن" کہتے ہیں۔ یہ گفتگو ان کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے، قرآن مجید کے مقابلہ میں خضوع کرنے، معاد پر ان کے ایمان و اعتقاد، ان کے درمیان مومن و کافر گروہ کے وجود اور اسی قسم کے دوسرے مسائل سے متعلق ہے۔ سورہ کا یہ حصہ اٹھائیس آیات میں سے انیس آیات میں پھیلا ہوا ہے۔ اور "جن" کے بارے میں بہت سے بے ہودہ عقائد کی اصلاح کرتا ہے، اور انھیں باطل قرار دیتا ہے۔

اس سورہ کے دوسرے حصہ میں توحید و معاد کے مسئلہ کے بارے میں اشارہ آیا ہے۔

اور اس سورہ کے آخری حصہ میں علم غیب کے مسئلہ کے متعلق گفتگو ہے، کہ کوئی بھی شخص اس سے آگاہ نہیں ہے، سوائے اس قدر جس کا خدا نے ارادہ کر لیا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الجن اعطی بعدد کل جنی و شیطان صدق بمحمد وکذب به عتق رقبة"

"جو شخص سورۂ جن کو پڑھے تو اسے ہر جن اور شیطان کی تعداد کے برابر، جس نے محمدؐ کی تصدیق یا تکذیب کی ہے، غلام آزاد کرنے کا ثواب دیا جائے گا"[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من اکثر قراءة قل اوحی لم یصبه فی الحیوة الدنیا شیء من اعین الجن ولا نفثهم ولا سحرهم، ولا کیدهم، وکان مع محمد (ص) فیقول یارب لا ارید منه بدلا ولا ابغی عنه حولا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۵

"جو شخص سورۂ جن کو بکثرت پڑھے، تو وہ دنیا کی زندگی میں، ہرگز جنوں کی نظر بد، ان کے جادو، سحر اور مکر و فریب سے نقصان نہیں اٹھائے گا، اور وہ محمدؐ کے ہمراہ ہوگا اور کہے گا: "پروردگارا! میں اس کی بجائے کسی اور کو نہیں چاہتا اور نہ ہی اس سے کسی دوسرے کی طرف مائل ہوتا ہوں"۔[1]

البتہ یہ تلاوت، اس سورہ کے مضامین و مطالب پر آگاہ ہونے، اور پھر اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۳۹۰

سورۂ جن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ قُلۡ اُوۡحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ

۲۔ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا ۙ

۳۔ وَّ اَنَّہٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّ لَا وَلَدًا ۙ

۴۔ وَّ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوۡلُ سَفِیۡہُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا ۙ

۵۔ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ۙ

۶۔ وَّ اَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ یَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡہُمۡ رَہَقًا ۙ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

۱۔ کہہ دیجیے کہ مجھے وحی ہوئی ہے کہ "جن" کی ایک جماعت نے کان دھر کے میری باتیں سنیں تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔

۲۔ جو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک

قرار نہیں دیتے۔

۳۔ اور بے شک ہمارے باعظمت پروردگار کا مقام بلند ہے، اور اس نے ہرگز اپنے لیے بیوی اور اولاد کا انتخاب نہیں کیا ہے۔

۴۔ اور بے شک ہمارے بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا باتیں کیا کرتے تھے۔

۵۔ اور ہم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ جن اور انسان ہرگز خدا پر جھوٹ نہیں باندھتے۔

۶۔ اور بے شک انسانوں میں سے کچھ لوگ، جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، اور وہ ان کی گمراہی اور طغیان میں زیادتی کا سبب بنا کرتے تھے۔

شانِ نزول

سورۂ احقاف کی آیہ ۲۹ تا ۳۲ کی تفسیر میں کچھ شان نزول بیان ہو چکی ہیں، جو زیر بحث سورہ (سورۂ جن) کے مطالب سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، اور وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ دونوں سورتوں کی آیات ایک ہی واقعہ سے مربوط ہیں۔ وہ شانِ نزول مختصر طور پر اس طرح ہے:

۱۔ پیغمبرؐ مکہ سے طائف کے بازار "عکاظ" کی طرف آئے تاکہ اس عظیم مرکزِ اجتماع میں لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں، لیکن کسی نے آپ کی دعوت کا کوئی مثبت جواب نہ دیا، واپسی پر آپ ایک ایسی جگہ پہنچے جسے "وادی جن" کہتے تھے، رات آپ وہیں رہے اور قرآن کی آیات کی تلاوت فرماتے رہے، جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو وہ ایمان لے آئے اور تبلیغ کے لیے اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے[1]

۲۔ "ابن عباس" کہتے ہیں "پیغمبر صبح کی نماز میں مشغول ہوئے اور اس میں قرآن کی تلاوت کر رہے تھے، جنوں کا ایک گروہ آسمانی خبروں کے ان سے منقطع ہو جانے کی علت کی تحقیق کر رہا تھا، انھوں نے محمدؐ سے قرآن کی تلاوت کی آواز سنی تو انھوں نے کہا کہ آسمانی اخبار کے ہم سے منقطع ہو جانے کی علت یہی ہے لہٰذا وہ اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی[2]

۳۔ "ابو طالب" کی وفات کے بعد جب رسولِ خدا پر معاملہ سخت ہو گیا تو آپ نے "طائف" کی طرف جانے کا ارادہ کیا تاکہ کوئی مددگار پیدا کریں۔ "طائف" کے رؤسا نے شدت کے ساتھ آپ کی تکذیب کی اور انھوں نے پیغمبر کی پشت پر اس قدر پتھر مارے کہ آپ کے پائے مبارک سے خون جاری ہو گیا، تھکے ماندے زخمی حالت میں ایک باغ کے پاس آئے اور انجام کار اس باغ کے مالکوں کا غلام جس کا

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۹ (تلخیص کے ساتھ)

[2] صحیح بخاری، مسلم و مسند احمد مطابق نقل "فی ظلال" جلد ۷، ص ۴۲۹ (تلخیص کے ساتھ)

نام "مداس" تھا، آنحضرتؐ پر ایمان لے آیا، آپ وہاں سے مکہ کی طرف لوٹے، رات ہوتے ایک کھجور کے درخت کے قریب پہنچے اور نماز میں مشغول ہوگئے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے "نصیبین" یا "یمن" کے "جنوں" کا ایک گروہ گزر رہا تھا۔ انھوں نے صبح کی نماز میں آنحضرت کی تلاوت قرآن کی آواز سنی تو وہ ایمان لے آئے [1]

بہت سے مفسرین نے اسی قسم کے شانِ نزول سورۂ جن کے آغاز میں بھی نقل کیے ہیں۔

لیکن یہاں ایک اور شانِ نزول بھی بیان کی گئی ہے، جو ان سب سے مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ لوگوں نے "عبداللہ بن مسعود" سے پوچھا: کیا تم اصحاب پیغمبرؐ میں سے، کوئی شخص "جن" والی رات کے واقعہ میں، پیغمبر کی خدمت میں تھا، اس نے کہا، کہ ہم میں سے کوئی نہیں تھا، ہم نے ایک رات مکہ میں پیغمبر کو نہ پایا، اور جس قدر ہم نے جستجو اور تلاش کی، آپ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم ڈرے کہ کہیں پیغمبرؐ کو دشمنوں نے قتل نہ کر دیا ہو، ہم پیغمبرؐ کو تلاش کرتے ہوئے مکہ کے درّوں کی طرف گئے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ آپ کوہ "حرا" کی طرف سے آرہے ہیں، ہم نے عرض کیا، اے رسولِ خدا آپ کہاں تھے؟ ہم سخت پریشان تھے اور کل رات ہماری زندگی کی بدترین رات تھی۔ آپ نے فرمایا: جنوں کی طرف سے ایک دعوت کرنے والا میرے پاس آیا تھا اور میں ان کے لیے قرآن پڑھنے کے لیے گیا تھا [2]

تفسیر

ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے

اب جو کچھ بیان ہوچکا، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے، آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: "کہہ دیجیے کہ میری طرف وحی ہوئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے میری باتوں کو کان لگا کر سنا، تو انھوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے" (قل اوحی الیّ انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآنا عجبا) [3]

"اوحی الیّ" (میری طرف وحی کی گئی ہے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبر نے بذاتِ خود اس واقعہ میں جنوں کو مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ آپ وحی کے ذریعے آگاہ ہوئے ہیں کہ انھوں نے قرآن مجید کو کان دھر کے سُنا ہے۔

ضمنی طور پر یہ آیت، اچھی طرح سے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ گروہ "جن" صاحبانِ عقل و شعور، فہم و ادراک والے اور تکلیف و مسئولیت کے حامل ہیں، اور زبان سے آشنائی اور اعجاز آمیز کلام میں فرق کو سمجھتے ہیں، اور اسی طرح سے خود کو تبلیغ حق کا ذمہ دار جانتے ہیں

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹ ص ۹۲ و سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۲، ۶۳ (تلخیص کے ساتھ)

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۸

[3] ارباب لغت و تفسیر کے قول کے مطابق "نفر" ۳ سے ۹ افراد تک کو کہا جاتا ہے۔

اور قرآن کے خطاب کے مخاطب بھی ہیں۔

یہ اس زندہ نظر نہ آنے والے موجود کی خصوصیات کا ایک حصہ ہے، جو صرف اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی کچھ اور خصوصیات بھی ہیں، جنھیں ہم انشاء اللہ اسی بحث کے آخر میں تفصیل سے بیان کریں گے۔

انھیں اس بات کا حق تھا کہ وہ قرآن کو ایک عجیب بات شمار کریں، کیونکہ اس کا لب ولہجہ اور طرز و آہنگ بھی عجیب ہے اور اس کا نفوذ کرنا اور قوت جاذبہ بھی۔ اس کے مضمون و مطالب اور اس کی تاثیر بھی عجیب ہے اور اس کا لانے والا بھی کہ جس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور وہ امیین میں سے مبعوث ہوا تھا۔

یہ ایک ایسا کلام ہے جو ظاہر و باطن میں عجیب ہے اور ہر دوسری گفتگو سے مختلف ہے، اور اس طرح سے انھوں نے قرآن کے معجزہ ہونے کا اعتراف کر لیا ہے۔

انھوں نے اس جملہ کے بعد کچھ اور باتیں بھی اپنی قوم سے کہیں، جنھیں قرآن نے بعد والی آیات میں بارہ جملوں میں بیان کیا ہے، جن میں سے ہر ایک "ان" کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جو تاکید کی نشانی ہے[1]

پہلے فرماتا ہے: انھوں نے کہا: "یہ قرآن سب کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک قرار نہیں دیتے" (یھدی الی الرشد فامنا بہ ولن نشرک بربنا احدًا)۔

"رشد" کی تعبیر بہت ہی وسیع اور ایک جامع تعبیر ہے، جو ہر قسم کا امتیاز اپنے اندر لیے ہوئے ہے، ایک ایسا صاف ستھرا راستہ ہے جس میں کوئی پیچ و خم نہیں ہے، روشن اور واضح جو طے کرنیوالوں کو سعادت و کمال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان کے اظہار اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بعد، انھوں نے صفات خدا کے بارے میں اپنی گفتگو کو اس طرح جاری رکھا: "ہمارے پروردگار کا باعظمت مقام (مخلوق کے ساتھ مشابہت اور ہر قسم کے عیب و نقص سے) بلند ہے اور اس نے اپنے لیے بیوی اور اولاد کا ہرگز انتخاب نہیں کیا (وانہ تعالیٰ جد ربنا ما اتخذ صاحبۃ ولا ولدًا)۔

"جد" کے لغت میں بہت سے معانی ہیں منجملہ ان کے "عظمت"، "شدت"، "جدیت"، "حصہ و نصیب"، "نیا ہونا" اور اس کے مانند لیکن اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں نقل کیا ہے "قطع" کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر باعظمت وجود دوسرے

---

[1] علماء نحو کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "ان" جب مقول قول میں ہو تو اسے زیر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے اور اوپر والی آیات میں پہلے مرحلہ میں تو زیر کے ساتھ ہے، لیکن بعد والی آیات میں جن کا اس پر عطف ہے زبر کے ساتھ ہے۔ اس لیے بہت سے مفسرین اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ ان آیات میں مقدرات فرض کریں یا کچھ اور توجیہیں کریں۔ لیکن اس بات میں کیا حرج ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ نحوی قاعدہ استثناء بھی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن موارد میں مقول قول پر عطف ہو تو جائز ہے کہ اسے زبر کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی دلیل اس سورہ کی آیات ہیں۔

موجودات سے قطع اور جدا ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ لفظ عظمت کے معنی میں آیا ہے۔

اسی طرح اس کے باقی معانی کے بارے میں اسی تناسب کو نظر میں رکھا جا سکتا ہے اور اگر دادا یا نانا کو جد کہا جاتا ہے تو وہ بھی اس کی بزرگی مقام اور سن کے واسطہ سے ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہاں "جد" کے بہت ہی محدود معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اس کی "صفات" کے معنی میں، اور بعض نے "قدرت" کے معنی میں، بعض نے "ملک و حکومت" کے معنی میں، بعض نے "نعمت" کے معنی میں اور بعض نے "نام" کے معنی میں تفسیر کی ہے، جو سب کے سب عظمت کے معنی میں جمع ہیں۔

لیکن چونکہ یہ تعبیر "جد" کے مشہور معنی، جو وہی "دادا" اور "نانا" کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ گروہ جن نے نادانی کی بناء پر اس قسم کی غیر مناسب تعبیر کو انتخاب کیا یعنی تم لوگ خدا کے بارے میں ہرگز اس قسم کی تعبیر نہ کرو[1]

یہ حدیث ممکن ہے ایسے مواقع کے لیے ہو، جہاں اس قسم کا اظہار ہوتا ہو، ورنہ قرآن ان آیات میں، جنوں کی باتوں کو موافق لب و لہجہ میں نقل کرتا ہے اور انھیں صحیح و درست سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جیسا کہ خطبہ ۱۹۱ میں آیا ہے۔

الحمد لله الفاشی فی الخلق حمده والغالب جنده والمتعالی جده

"حمد و ستائش اس خدا کے لیے مخصوص ہے، جس کی حمد و ثناء نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہے اور اس کا لشکر ہر جگہ کامیاب ہے اور اس کی مجد و عظمت بلند ہے۔

بعض روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ "انس بن مالک" کہتے ہیں:۔

کان الرجل اذا قرء سورة البقرة جد فی اعیننا

جب کوئی شخص سورہ بقرہ کو یاد کر لیتا تھا اور اس کی قراءت کیا کرتا تھا، تو وہ ہماری نظر میں بزرگ اور باعظمت دکھائی دیتا تھا[2]

بہرحال مجد و بزرگی و عظمت کے معنی میں اس لفظ کا استعمال ایک ایسا مطلب ہے جو متون لغت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور موارد استعمال کے ساتھ بھی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان باتوں کے کہنے والے "جن" یہاں خصوصیت کے ساتھ اس مطلب پر تکیہ کرتے ہیں کہ خدا کی بیوی اور اولاد نہیں ہے اور احتمال یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بے ہودگی کی طرف اشارہ ہو جو عربوں میں موجود تھی، جو یہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ "ایک جن" بیوی سے۔ جسے خدا نے انتخاب کیا ہے۔

یہی معنی ایک احتمال کے عنوان سے سورۂ صافات کی آیہ ۱۵۸ کی تفسیر میں بھی آیا ہے "وجعلوا بینه و بین الجنة نسبًا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۶۸ و "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۲۵ "تفسیر علی بن ابراہیم" میں اس تعبیر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[2] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۸۰۱

"وہ خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری کے قائل تھے"۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: "اب ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا اور حق سے دور بات کیا کرتے تھے" (وانہ کان یقول سفیھنا علی اللہ شططًا)۔

یہاں ممکن ہے "سفیہ" کی تعبیر جنسی اور جمع کے معنی میں ہو، یعنی ہمارے سفہاء اور بے وقوف لوگ خدا کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، اور انھوں نے شبیہ و شریک بنالیا تھا اور راہِ حق سے منحرف ہو کر فضول اور بے ہودہ باتیں کہا کرتے تھے۔

بہت سے مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں "سفیہ" کا مفہوم وہی ایک فرد ہے اور ابلیس کی طرف اشارہ ہے، جس نے خدا کے فرمان کی مخالفت کرنے کے بعد، اس کی ساحت مقدس کی طرف بہت سی ناروا نسبتیں دیں، یہاں تک کہ اس نے آدمؑ کے سجدہ کے بارے میں، پروردگار کے حکم پر علی الاعلان اعتراض کیا، اور اسے حکمت سے دُور سمجھا، اور اپنے آپ کو آدم سے افضل و برتر خیال کیا۔

چونکہ "ابلیس" "جن" تھا۔ لہٰذا مومنین جن اس سے نفرت کا اظہار کر رہے ہیں، اور اس کی بات کو فضول اور حق سے دور کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ وہ ظاہراً عالم و عابد تھا۔ لیکن عالم بے عمل اور عابد خود خواہ و منحرف و مغرور، "سفیہ" کے واضح مصادیق میں سے ہے۔

"شطط" (بروزن وسط) حدِ اعتدال سے خارج ہو کر دور جا پڑنے کے معنی میں ہے۔ اس لیے وہ باتیں جو حق سے دور ہوں انھیں شطط کہا جاتا ہے اور اسی لیے ان بڑے دریاؤں کے کناروں کو جن کا فاصلہ پانی سے زیادہ دور ہو اور اس کی دیواریں بلند ہوں "شط" کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: "ہم یہ گمان کیا کرتے تھے کہ انسان اور جن ہرگز خدا پر جھوٹ نہیں باندھیں گے" (وانا ظننا ان لن تقول الانس والجن علی اللہ کذبًا)۔

ان کی یہ بات ممکن ہے اس اندھی تقلید کی طرف اشارہ ہو جو یہ گروہ اس سے پہلے دوسروں کی کیا کرتا تھا اور اس بناء پر وہ خدا کا شریک بناتے تھے اور اس کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ان مسائل کو دوسروں سے بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیا تھا تو وہ غلط فہمی کی بناء پر تھا۔ ہمیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ انسان اور جن اتنی جرأت کریں گے کہ اتنا بڑا جھوٹ خدا پر باندھیں گے۔ لیکن اب جبکہ ہم نے اس بات کی تحقیق کر لی ہے اور حق کو معلوم کر لیا ہے اور اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ لہٰذا ہم اب اس ناروا تقلید کو غلط سمجھتے ہیں، اور اس طرح اپنی غلطی اور مشرکین جن کے انحراف کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا: جنوں اور انسانوں کے انحرافات میں سے ایک یہ تھا کہ "انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ کی پناہ لیا کرتے تھے، اور وہ ان کی گمراہی، گناہ اور طغیان و سرکشی کی زیادتی کا سبب بنتے تھے" (وانہ کان رجال من الانس

یعوذون برجال من الجن فزادوھم رھقًا)۔

"رھق" (بروزن شفق) اصل میں کسی چیز کو قہر وغلبہ کے ذریعے چھپانے کے معنی میں ہے اور چونکہ گمراہی، گناہ، طغیان اور خوف انسان کے قلب وروح پر مسلط ہوجاتے ہیں اور اس کو چھپا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کا ان معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس جملہ کو ایک دوسری بیہودہ اور فضول بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں موجود تھی اور وہ یہ تھی کہ جب عربوں کے قافلے رات کے وقت کسی درّہ میں داخل ہوتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے۔

اعوذ بعزیز ھٰذا الوادی من شرّ سفھاء قومہ!

"میں اس سرزمین کے بزرگ ورئیس کی ——— اس کی قوم کے.....؟ اور بے وقوفوں کے شر سے ——— پناہ مانگتا ہوں"۔

اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس بات کے کہنے سے جنوں کا بزرگ ورئیس، ان کی نادان اور بیوقوف جنوں کے شر سے حفاظت کرے گا[1]

اور چونکہ خرافات اور بیہودہ باتوں سے انحطاط فکری خوف اور گمراہی بڑھتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں "فزادوھم رھقًا" کہا گیا ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں میں بھی مرد اور عورتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس میں "رجال من الجن" کی تعبیر آئی ہے[2]

لیکن آیت کا مفہوم بہرحال ایک وسیع مفہوم ہے۔ جو انسانوں کی جنوں سے ہر قسم کی پناہ لینے کو شامل ہے اور اوپر والی فضول اور بیہودہ بات اس کا ایک مصداق ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عربوں کے درمیان کاہن بہت تھے۔ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جنوں کے ایک گروہ کے ذریعہ بہت سی مشکلات کو حل کرتے ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر دیتے ہیں۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۶۹ و "روح المعانی" جلد ۲۸ ص ۵۔

[2] اوپر والی آیت کی تفسیر میں ایک اور بیان بھی آیا ہے جسے مفسرین کے ایک گروہ نے ایک احتمال کے عنوان سے آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت کا جنوں کی طرف پناہ حاصل کرنا، جنوں کے طغیان کا سبب بنا اور انھوں نے خود کو اہم کاموں کا مبداء ومنشاء خیال کرلیا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے (پہلی تفسیر کے مطابق "زادوا" میں ضمیر "جن" کی طرف لوٹتی ہے اور "ھم" کی ضمیر انسانوں کی طرف، دوسری تفسیر کے برعکس)۔

۷۔ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ

۸۔ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۙ

۹۔ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ

۱۰۔ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ

ترجمہ

۷۔ اور انھوں نے بھی یہی گمان کرلیا تھا، جیسا کہ تم گمان کرتے تھے، کہ خدا ہرگز کسی کو (نبوت پر) مبعوث نہیں کرے گا۔

۸۔ اور ہم نے آسمان میں جستجو کی، تو ہم نے سب کو قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے پُر پایا۔

۹۔ اور ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں بیٹھ جایا کرتے تھے، لیکن اب اگر کوئی چوری چھپے سننا چاہتا ہے، تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پاتا۔

۱۰۔ اور اب (ان حالات میں) ہم نہیں جانتے کہ اہلِ زمین کے بارے میں ان کے پروردگار نے کسی شر اور برائی کا ارادہ کیا ہے، یا ان کی ہدایت کا ارادہ کیا ہے۔

تفسیر

ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے، لیکن.....

یہ آیات اسی طرح سے "جن مومنین" کے بیان کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو اپنی قوم کو جمع کرتے وقت بیان کر رہے تھے، اور مختلف طریقوں سے انھیں اسلام اور قرآن کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ پہلے کہتے تھے: "انسانوں کا ایک گروہ، تمھاری طرح ہی یہ گمان کرتا تھا، کہ خدا کسی بھی انسان کو (موسیٰ و مسیح کے بعد) نبوت کے ساتھ مبعوث نہیں کرے گا" (وانهم ظنوا كما ظننتم ان لن يبعث الله احدًا)۔

لہٰذا وہ قرآن کے انکار اور پیغمبر اسلام کی نبوت کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن ہم نے جب غور سے اس کتاب آسمانی کی آیات کو سنا، تو ہم نے اس کی حقانیت کا واضح طور پر ادراک کر لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی مشرک انسانوں کی طرح کافر ہو جاؤ اور انھیں جیسی سرنوشت میں گرفتار ہو جاؤ۔

یہ تعبیر مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ جب جنوں کی منطق یہ ہے اور ان کا فیصلہ یہ ہے تو پھر وہ بیدار ہو جائیں اور قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کے دامن سے متمسک ہو جائیں۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "ان لن يبعث الله احدًا" کا جملہ معاد کے انکار کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ پیغمبر کی بعثت کے انکار کی طرف۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت کلی طور پر خدا کا کلام ہے، نہ کہ مومنین "جن" کا اور یہ جملہ با کے معترضہ کی صورت میں ان کی باتوں کے درمیان آیا ہے اور اس میں مخاطب مشرکین عرب ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہو گا کہ اے مشرکین عرب جن بھی تمھاری طرح ہی اس طرح کا گمان رکھتے تھے کہ خدا کسی بھی رسول کو مبعوث نہیں کرے گا۔ لیکن قرآن کو سننے کے بعد وہ اپنی غلطی کو سمجھ گئے۔ لہٰذا اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم بھی بیدار ہو جاؤ۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ جن مومنین کی گفتگو ہی چل رہی ہے اور اس میں "کافر جن" مخاطب ہیں۔

اس کے بعد مومنین جن، اپنی گفتگو کی صداقت کی ایک نشانی کی طرف ــــ جو عالم طبیعت میں تمام جنوں کے لیے قابل ادراک ہے ــــ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم نے آسمانوں میں جستجو کی، تو ہم نے ان سب کو نگہبانوں اور قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے بھرپور پایا[2] (وانا لمسنا السماء فوجدناها ملئت حرسًا شديدًا و شهبًا)[1]۔

ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور وہاں سے کچھ خبریں معلوم کر لیا کرتے تھے۔

---

[1] "لمسنا" "لمس" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی مشہور ہے، لیکن یہاں طلب و جستجو سے کنایہ ہے (مفردات راغب و تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی)۔

[2] "حرس" (بروزن قفس) جمع ہے "حارس" کی۔ جو نگہبان کے معنی میں ہے اور بعض اس کو اسم جمع سمجھتے ہیں۔

اور اپنے دوستوں کو ان کی اطلاع دے دیا کرتے تھے، لیکن اب معاملہ ایسا ہوگیا ہے کہ اب اگر کوئی چوری چھپے کچھ سننا چاہتا ہے تو وہ اپنی گھات میں ایک شہاب کو پاتا ہے جو اس کو نشانہ بنالیتا ہے"۔ (و انا کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الآن یجد له شهابا رصدا)۔

تو کیا یہ نئی وضع و کیفیت اس حقیقت کی دلیل نہیں ہے کہ اس پیغمبر کے ظہور اور اس کی کتاب آسمانی کے نزول سے عالم میں ایک عظیم تغیر پیدا ہوگیا ہے؟ آخر پہلے تم میں چوری چھپے سننے کی طاقت کیوں تھی اور اب تم میں سے کوئی بھی اس کام پر قدرت کیوں نہیں رکھتا؟ کیا اس وضع جدید اور نئی کیفیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شیطنت، کہانت اور مکر و فریب کا دور ختم ہوگیا ہے اور جہالت کی تاریک رات ڈھل گئی ہے اور وحی و نبوت کا آفتابِ عالم تاب طلوع ہوگیا ہے۔

"شہاب" اصل میں اس شعلہ کے معنی میں ہے جو آگ میں سے بھڑک کر نکلتا ہے اور اس آتشین شعلہ کو بھی جو ایک لمبے خط کی صورت میں آسمان سے ظاہر ہوتا ہے "شہاب" کہتے ہیں۔ موجودہ دور کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق وہ پتھروں کے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں، جو کرۂ زمین سے باہر کی فضا میں حرکت کر رہے ہوتے ہیں، جب وہ زمین کے قریب آتے ہیں تو اس کی قوت کشش کے زیر اثر آجاتے ہیں، اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف گرتے ہیں، جب وہ فضا یعنی زمین کے گرداگرد پھیلی ہوئی تہ بہ تہ ہوا میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کے ساتھ شدید ٹکراؤ کی وجہ سے جل کر آگ بن جاتے ہیں، اور جلانے والے شعلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور آخر کار ان کی راکھ زمین پر آگرتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ مسئلہ بارہا بیان ہوا ہے کہ "شہاب" وہ تیر ہیں جو ان شیاطین کی طرف، جو چوری چھپے باتیں سننے کا ارادہ کرتے ہیں، پھینکے جاتے ہیں۔

اس بارے میں کہ چوری چھپے سننے سے مراد کیا ہے؟ اور جن اور شیاطین آسمان سے کس طرح بھگائے جاتے ہیں؟ ہم نے سورۂ حجر کی آیہ ۱۸ کے ذیل میں (جلد ۸ ص ۴۰ کے بعد)، اور سورۂ صافات کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں (جلد ۱۹ ص ۱۵ کے بعد) تفصیلی مباحث پیش کیے ہیں۔

بہرحال لفظ "رصد" (بروزن حسد) کسی چیز کے انتظار میں آمادگی کے معنی میں ہے، جسے فارسی (اور اردو) میں "گھات لگا کر بیٹھنے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعض اوقات اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز یا وہ شخص جو گھات لگا کر بیٹھا ہو اور اوپر والی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا کہ ان اوضاع و حالات میں ہم نہیں جانتے، کہ کیا یہ چوری چھپے سننے کی ممنوعیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین پر رہنے والے لوگوں کے لیے کسی شر اور برائی کا ارادہ ہوا ہے، یا خدا یہ چاہتا ہے کہ انھیں اس طریقہ سے ہدایت کرے"

(و انا لا ندری اشر اريد بمن فی الارض ام اراد بهم ربهم رشدا)۔

دوسرے لفظوں میں ہم نہیں جانتے کہ کیا یہ امر خدا کی طرف سے نزولِ عذاب و بلا کا مقدمہ ہے یا ان کی ہدایت کی تمہید ہے۔

لیکن مومنین جن کو اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چوری چھپے سننے کی ممانعت، جو پیغمبرِ اسلام کے ظہور کے قریب ہوئی ہے، انسانوں کی

ہدایت کا مقدمہ ہے اور کہانت کے اداروں اور اسی جیسی خرافات کے ختم ہونے کی تمہید ہے ۔ اور یہ چیز تاریکی کے دور کے ختم ہونے اور ایک نورانی اور روشن دور کے آغاز کے اعلان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی ۔

لیکن چونکہ " جن " چوری چھپے سننے کے مسئلہ سے ایک خاص دلچسپی رکھتے تھے ۔ لہٰذا وہ بھی یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ محرومیت ایک قسم کی خیر و برکت ہے ۔ ورنہ یہ بات واضح ہے کہ زمانہ جاہلیت کے کاہن اسی چوری چھپے سننے کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے ، لوگوں کے ایک بہت بڑے حصہ کو گمراہ کیا کرتے تھے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ اس جملہ میں ہدایت کی نسبت تو خدا کی طرف دیتے ہیں ۔ لیکن شر کو فعلِ مجہول کی صورت میں ، خدا کی طرف نسبت دیئے بغیر ذکر کرتے ہیں ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ آتا ہے وہ خیر و ہدایت ہوتی ہے ۔ لیکن شر و فساد ، خود لوگوں کی طرف سے اور خدا کی نعمتوں اور مواہبِ آفرینش کے سوءِ استفادہ سے پیدا ہوتا ہے ۔

۱۱۔ وَ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ۙ۝

۱۲۔ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ۝

۱۳۔ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ۙ۝

۱۴۔ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝

۱۵۔ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ۝

ترجمہ

۱۱۔ اور یہ کہ ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم مختلف گروہ ہیں۔

۱۲۔ اور یہ کہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم زمین میں ہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے۔ اور نہ ہی اس کے پنجۂ قدرت سے فرار کر سکتے ہیں۔

۱۳۔ اور یہ کہ جب ہم نے قرآن کی ہدایت سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اور جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے پھر وہ نہ تو نقصان سے ڈرتا ہے اور نہ ہی ظلم سے۔

۱۴۔ اور یہ کہ ہم میں سے ایک گروہ تو مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم ہے اور جو شخص اسلام کو اختیار کرے، اس نے سیدھی راہ کو انتخاب کر لیا ہے۔

۱۵۔ اور ظالم تو ہیں ہی دوزخ کا ایندھن۔

تفسیر
ہم نے حق کو سنا اور سرِ تسلیم خم کر لیا

یہ آیات اسی طرح جن مومنین کی باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، یعنی وہ باتیں جو انھوں نے اپنی گمراہ قوم کو تبلیغ کرتے وقت کہی تھیں، پہلی آیت میں ان کی زبانی کہتا ہے: ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم میں مختلف گروہ ہیں" (وانا منا الصالحون ومنا دون ذالك كنا طرائق قددًا)۔

احتمال یہ ہے کہ انھوں نے اس جملہ کو اس لیے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "ابلیس" کا قبیلہ "جن" میں سے ہونا، ان میں سے ایک گروہ کے دل میں یہ توہم پیدا نہ کر دے، کہ جن کی طبیعت اور مزاج شر اور فساد، شیطنت پر ہے اور نورِ ہدایت ان کے دل میں ہرگز نہیں چمکتا۔

مومنین جن اس گفتگو سے یہ واضح کر رہے ہیں کہ اصل اختیار اور آزادی ارادہ ان پر بھی حکم فرما ہے، اور صالح اور غیر صالح دونوں قسم کے افراد ان میں موجود ہیں۔ اس بناء پر ہدایت کی استعداد ان میں بھی موجود ہے اور اصولی طور پر تبلیغ کی تاثیر کے عوامل میں سے ایک طرف مقابل کی شخصیت کو اجاگر کرکے اسے ہدایت و کمال کی استعداد کے موجود ہونے کی طرف توجہ دلانا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مومنین نے، چوری چھپے سننے کے سند سے، سورۂ استفادہ کے موضوع سے، ہدایت کے لیے کہی ہو، یعنی اگرچہ ہم میں سے بعض، وہ اخبار جو وہ چوری چھپے سنا کرتے تھے، انھیں شریر انسانوں کے پاس پہنچا کر گمراہی کا سبب بنے تھے۔ لیکن ہم میں سے تمام جن ایسے نہیں تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر جنوں کے بارے میں ہم انسانوں کی ذہنیتوں کی بھی اصلاح کرتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کے تصور میں لفظ "جن" شیطنت، فساد اور گمراہی کی ایک قسم کے ساتھ ہے۔ یہ آیت کہتی ہے کہ وہ بھی مختلف گروہ ہیں، صالح اور غیر صالح۔

لفظ "قدد" (بروزن پسر) "قد" (بروزن ضد) کی جمع ہے۔ جس کا معنی کٹا ہوا کے ہیں۔ اور مختلف گروہوں پر بھی۔ چونکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ٹکڑوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جن مومنین اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے دوسروں کو خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "ہمیں یقین ہے کہ ہم زمین میں، خدا کے ارادہ پر ہرگز غالب نہیں آ سکتے، اور نہ ہی اس کے پنجۂ قدرت سے فرار کر سکتے ہیں"۔ (وانا ظننا ان لن نعجز الله فی الارض ولن نعجزه هربًا)۔

اس بناء پر، اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ تم خدا کے عذاب سے بھاگ کر زمین کے کسی گوشہ میں یا آسمانوں کے کسی مقام میں نجات پا جاؤ گے، تو تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

اس طرح سے پہلا جملہ تو زمین میں خدا کے پنجۂ قدرت سے فرار کرنے کیلیے اور دوسرا جملہ مطلق فرار کرنے کی طرف اشارہ ہے، عام اس سے کہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم خدا پر غالب نہیں آسکتے، اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے پنجۂ عدالت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس بناء پر کہ نہ تو غلبہ کی کوئی راہ ہے اور نہ ہی بھاگنے کی، تو پھر اس کے فرمانِ عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

جن مومنین اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم نے جب قرآن کی ہدایت کو سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے"۔ (و انّا لمّا سمعنا الهدٰی اٰمنّا به)۔

اور اگر ہم تمھیں قرآن کی ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تو ہم نے خود پہلے اس پروگرام پر عمل کیا ہے۔ اس بناء پر ہم دوسروں کو کسی ایسی چیز کی دعوت نہیں دے رہے ہیں، جسے ہم نے خود چھوڑ رکھا ہو۔

اس کے بعد ایمان کے نتیجہ کو ایک مختصر سے جملہ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تو اسے نہ تو نقصان کا کوئی ڈر ہے اور نہ ہی ظلم کا"۔ (فمن یؤمن بربّه فلا یخاف بخسًا و لا رهقًا)۔

"بخس" (بروزن شخص) ظلم وستم کے ذریعہ نقصان کے معنی میں ہے اور "رهق" (بروزن شفق)۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں: "کسی چیز کے زور کے ساتھ چھیانے" کے معنی میں ہے۔

بعض نے ان دو تعبیروں کے درمیان فرق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "بخس" تو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کی "حسنات" اور نیکیوں میں سے کسی چیز میں کمی نہیں کی جائے گی اور "رهق" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے "سیئات" اور برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

بعض نے "بخس" کو "حسنات" کی کمی اور "رهق" کو "تکالیفِ شاقہ" کے معنی میں لیا ہے۔

بہرحال مراد یہ ہے کہ مومنین جس چھوٹے اور بڑے کام کو انجام دیں گے، وہ اس کا اجر و ثواب، بے کم و کاست حاصل کریں گے۔

یہ درست ہے کہ پروردگار کی عدالت مومنین پر منحصر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ غیر مومن کوئی عمل صالح رکھتے ہی نہیں، اس لیے ان کے اجر کی بات درمیان میں نہیں آئی۔

بعد والی آیت میں مومنوں اور کافروں کی سرنوشت کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کہتا ہے: "ہم نے قرآن کی ہدایت کے ذریعہ یہ جانتے ہیں کہ ہم میں سے ایک گروہ مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم و بیدادگر ہے"۔ (و انّا منّا المسلمون و منّا القاسطون)[1]

لیکن جو اسلام کو اختیار کر لیں تو انھوں نے راہِ راست کو انتخاب کیا ہے اور خدا کی ہدایت اور ثواب کی طرف قدم اٹھایا ہے۔

---

[1] "قاسط" "قسط" کے مادہ سے عادلانہ تقسیم کے معنی میں ہے۔ یہ مادہ جب باب "افعال" کی صورت میں "اقساط" آئے تو اجرائے عدالت کے معنی میں ہے اور جب ثلاثی مجرد کی صورت میں استعمال ہو۔ (مثلاً اوپر والی آیت) تو پھر ظلم اور راہِ حق سے انحراف کے معنی میں ہوتا ہے۔

(فمن اسلم فاولئك تحرّوا رشدًا)۔[۵۱]

"باقی رہے ظالم تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں" (و اما القاسطون فکانوا لجهنم حطبًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں "مسلم" "ظالم" کے مقابلہ میں آیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو جو چیز ظلم سے باز رکھتی ہے وہ ایمان ہی ہے۔ ورنہ ایک بے ایمان فرد تو بہر حال ظلم و ستم میں آلودہ ہوگا ہی، اور ضمنی طور پر بتاتا ہے کہ واقعی مومن وہ ہے جو ظلم و ستم سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

المؤمن من أمنه الناس على انفسهم واموالهم

"مومن وہ ہے کہ لوگ جس کی طرف سے اپنی جان و مال کے سلسلہ میں امان میں رہیں"[۵۲]

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده

"مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان آسودہ رہیں"[۵۳]

"تحرّوا رشدًا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ مومنین، توجہ، قصد و ارادہ اور تحقیق کے ساتھ ہدایت حاصل کرتے ہیں، آنکھیں بند کر کے اندھی تقلید کے طور پر نہیں، اور ان کا بالاترین اجر حقیقت کو پالینا ہی ہے، جس کے زیر سائے وہ خدا کی تمام نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں جبکہ ستم گروں کی بدترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن ہیں یعنی آگ ان کے وجود کے اندر سے شعلہ ور ہوگی۔

---

[۵۱] "تحرّوا" "تحری" کے مادہ سے کسی چیز کا قصد کرنے کے معنی میں ہے۔

[۵۲] تفسیر "روح البیان" جلد ۱۰ ص ۱۹۵

[۵۳] "اصول کافی" جلد ۲ ۔ باب المومن و علاماتہ وصفاتہ

۱۶۔ وَّاَنْ لَّوِاسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۙ

۱۷۔ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۙ

۱۸۔ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۙ

۱۹۔ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ؕ ۱۹

ترجمہ

۱۶۔ اور اگر وہ (جن وانس) ایمان کے طریقہ پر استقامت اختیار کریں، تو ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں۔

۱۷۔ مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں اس فراواں نعمت کے ذریعہ آزمائیں اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روزافزوں عذاب میں گرفتار کرے گا۔

۱۸۔ اور یہ کہ مساجد خدا ہی کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔

۱۹۔ اور یہ کہ جب خدا کا بندہ (محمدؐ عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور اسے پکارتا، تو کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ اس کے گرد جمع ہوجاتے۔

تفسیر

ہم تمھیں ان فراواں نعمتوں کے ذریعے آزمائیں گے

یہ آیات ظاہراً جن مومنین کی اپنی قوم سے گفتگو کو جاری رکھے ہوئے ہیں (اگرچہ کچھ مفسرین نے اسے خدا کا کلام سمجھا ہے، جو جملہ معترضہ کے طور پر جنوں کی گفتگو کے درمیان آیا ہے)۔ لیکن چونکہ اس کا جملہ معترضہ ہونا خلاف ظاہر ہے اور آیات کی تعبیر گزشتہ آیات کے لب ولہجہ سے زیادہ

مشابہ ہے، جو جن مومنین کی گفتگو تھی، لہذا اس کا جنوں کا کلام نہ ہونا بعید ہے[1]

بہرحال گزشتہ آیات میں، قیامت میں مومنین کے لیے اجر وثواب کے بارے میں گفتگو تھی، اور ان آیات میں ان کے دنیاوی اجر وثواب کی گفتگو ہے۔ فرماتا ہے: "اگر وہ (جن وانس) ایمان کے طریقہ پر استقامت کریں، تو ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے"۔ (وان لواستقاموا علی الطریقة لاسقیناھم ماءً غدقًا)۔

ہم ان پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل کریں گے، اور حیات بخش پانی کے منابع اور چشمے ان کے اختیار میں دے دیں گے اور جہاں پانی کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں پر ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے۔ لہذا اس طرح سے ہم انھیں انواع واقسام کی نعمتوں سے نوازیں گے۔

"غدق" (بروزن شفق) فراواں پانی کے معنی میں ہے۔

قرآن مجید نے اس مطلب پر کئی بار تکیہ کیا ہے، کہ "ایمان وتقوٰی" نہ صرف معنوی برکات کا سرچشمہ ہیں، بلکہ مادی ارزاق کی زیادتی، نعمتوں کی کثرت، آبادی وعمران اور مادی برکت کی زیادتی کا موجب بھی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک تفصیلی بحث، اسی جلد میں سورۂ نوح کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں "ایمان وتقوٰی کا عمران وآبادی سے رابطہ" کے عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس بیان کے مطابق، وہ چیز جو نعمت کی زیادتی کا سبب بنتی ہے، ایمان پر استقامت ہے، نہ کہ اصل ایمان کیونکہ وقتی اور جلدی گزر جانے والے ایمان سے اس قسم کی برکات ظاہر نہیں ہوتیں۔ لہذا اہم چیز ایمان، تقوٰی پر استقامت ہے، جس میں بہت سوں کے پاؤں لنگ کرنے لگتے ہیں اور لرزاں ہو جاتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اسی سلسلہ میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں وفور نعمت کے ذریعہ آزمائیں" (لنفتنھم فیہ)۔

آیا نعمت کی زیادتی ان کے غرور وغفلت کا سبب بنتی ہے یا بیداری، شکر گزاری اور خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کا سبب ہوتی ہے۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی امتحان کے اہم اسباب میں سے ایک وفور نعمت ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ نعمت کے ذریعہ جو آزمائش ہوتی ہے، وہ عذاب کے ذریعہ ہونے والی آزمائش سے زیادہ سخت اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ کیونکہ نعمت کی زیادتی کا مزاج، سستی، کاہلی، غفلت اور لذائذ وشہوات میں غرق ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے۔ اور

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا وہ چیز جو اس بات کا سبب بنی ہے کہ مفسرین کا یہ گروہ اسے خدا کا کلام اور جملہ معترضہ سمجھیں "متکلم مع الغیر" کی ضمیریں ہیں، جو ان آیات میں استعمال ہوئی ہیں، ایک جگہ کہتا ہے کہ ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے، دوسری جگہ فرماتا ہے کہ، ہدف ومقصد یہ ہے کہ ہم انھیں آزمائیں۔ لیکن اگر ہم ان تعبیروں کو نقل بالمعنی جان لیں تو پھر کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ٹھیک اس بات کے مشابہ ہے کہ کوئی اپنے دوست سے نقل کرے اور کہے کہ، فلاں آدمی کا عقیدہ یہ ہے کہ میں اچھا آدمی ہوں۔ البتہ اس نے لفظ "میں" استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے "وہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن کہنے والا اس قسم کی تعبیر استعمال کرتا ہے۔

میدان کو شیطان کی فعالیت کے لیے آمادہ کر دیتی ہے۔ صرف وہی لوگ وفورِ نعمت کی زیادتی کے غیر مطلوب عوارض سے امان میں رہ سکتے ہیں، جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہیں اور اس کے ذکر کو فراموش نہ کریں اور دائمی یاد کے ذریعہ خانۂ دل کو شیاطین کے نفوذ سے محفوظ رکھیں[1]

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے: "جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا" (ومن یعرض عن ذکر ربہ یسلکہ عذابًا صعدًا)۔

"صعد" (بروزن سفر) صعود کرنے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات "گھاٹی" کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ گھاٹیوں سے اوپر جانے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ لفظ "مشقت اٹھانے والے کاموں" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا بہت سے مفسرین نے اوپر والی آیت کی اسی طرح تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد "مشقت والا عذاب" ہے۔ اس کے مشابہ جو سورۂ مدثر کی آیہ ۱۷ میں آیا ہے۔ جس میں بعض مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے: "سارھقہ صعودًا"۔ "میں اسے مشقت والے عذاب میں دھانپ لوں گا"۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والی تعبیر، اس عذاب کے مشقت بار ہونے کے بیان کے ضمن میں، اس کے روز افزوں ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو۔

اس طرح اوپر والی آیات ایک طرف تو ایمان و تقویٰ کا، زیادتی نعمت سے تعلق بیان کرتی ہے، اور دوسری طرف نعمت کی زیادتی کا، خدا کی آزمائشات کے ساتھ تعلق بیان کرتی ہیں اور تیسری طرف خدا کی یاد سے روگردانی کا سخت ترین اور روز افزوں عذاب سے تعلق ظاہر کرتی ہیں، اور یہ ایسے حقائق ہیں، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۲۴ میں آیا ہے: ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکًا: "جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے گا تو اس کی زندگی تنگ اور سخت ہو جائے گی"۔

اور سورۂ نمل کی آیہ ۴۰ میں حضرت سلیمان کی زبانی بیان ہوا ہے: ھٰذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر: "یہ میرے پروردگار کا فضل ہے، وہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں"۔

اور سورۂ انفال کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے: واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ: "جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہیں"۔

بعد والی آیت میں جن مومنین کی زبانی، دوسروں کو توحید کی طرف دعوت دینے کے موقع پر اس طرح کہتا ہے: "مساجد خدا کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو" (وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدًا)۔

اس بارے میں کہ یہاں "مساجد" سے کیا مراد ہے، گوناگوں تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

---

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ اوپر والی آیت میں "طریقہ" سے مراد وہی کفر کی راہ ہی ہے، اور اس راہ میں استقامت کے بعد نعمت میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ حقیقت میں عذاب کا ایک مقدمہ اور نعمت میں استدراج کا مصداق ہوتا ہے، لیکن یہ تفسیر زیرِ بحث آیت اور اس سے قبل و بعد کی آیات کے لب و لہجہ سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مکان اور جگہیں ہیں کہ جن میں خدا کے لیے سجدہ ہوتا ہے جس کا مصداق اکمل، مسجد الحرام ہے اور اس کا دوسرا مصداق باقی مساجد ہیں اور زیادہ وسیع مصداق وہ تمام جگہیں ہیں جہاں انسان نماز پڑھتا ہے اور خدا کے لیے سجدہ کرتا ہے، اور پیغمبر کی معروف حدیث کے مطابق، جس میں آپ نے فرمایا:

جعلت لی الارض مسجدًا و طهورًا

"تمام روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور (تیمم کرنے کے لیے) طہارت کا ذریعہ قرار دی گئی ہے"[1]

اس میں ہر جگہ شامل ہے اور اس طرح سے یہ مشرکین عرب، اور ان جیسے لوگوں کے اعمال کا، جنھوں نے خانہ کعبہ کو بت کدہ بنا رکھا تھا، ایک جواب یہ ہے، اور منحرف عیسائیوں کے اعمال کا بھی، جنھوں نے "تثلیث" کو اپنا لیا تھا اور اپنے گرجوں میں تین خداؤں کی پرستش کرتے تھے قرآن کہتا ہے، تمام عبادت گاہیں خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان عبادت گاہوں میں خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے غیر کی پرستش ممنوع ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ مساجد سے مراد، سجدہ کے سات اعضاء ہیں۔ ان اعضاء کو صرف خدا کے لیے زمین پر رکھنا چاہیے اور اس کے غیر کی لیے جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث میں نویں امام محمد بن علی الجوادؑ سے نقل ہوا ہے کہ "معتصم عباسی" نے ایک مجلس میں جس میں اہل سنت کے علماء جمع تھے، سوال کیا کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیے؟ بعض نے کہا کہ کلائی سے، اور اس نے تیمم والی آیت سے استدلال کیا، بعض دوسروں نے کہا کہ کہنی سے اور انھوں نے وضو والی آیت سے استدلال کیا، معتصم نے آپ سے اس سلسلہ میں وضاحت کی درخواست کی تو پہلے تو حضرت نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنے سوال سے صرف نظر کرے، جب اس نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ان حضرات نے کہا ہے وہ سب غلط ہے صرف چار انگلیاں جڑ سے کاٹی جانی چاہییں۔ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگوٹھا چھوڑ دینا چاہیے۔ جب معتصم نے اس کی دلیل طلب کی تو امام نے پیغمبرؐ کے اس ارشاد سے استدلال کیا کہ سجدہ سات اعضاء پر ہونا چاہیے۔ پیشانی، دو ہاتھ، دونوں گھٹنوں کے سرے اور پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے اور اس کے بعد مزید فرمایا کہ اگر کلائی یا کہنی سے کاٹا جائے گا تو ہاتھ اس کے لیے باقی نہیں رہے گا کہ جس پر وہ سجدہ کرے۔ جبکہ خدا نے یہ فرمایا ہے وانّ المساجد للّٰہ یعنی یہ سات اعضاء خدا کے لیے ہیں اور جو چیز خدا کے ساتھ مخصوص ہو اسے قطع نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات پر معتصم کو بہت تعجب ہوا اور اس نے حکم دیا کہ آنحضرتؑ کے حکم کے مطابق چور کا ہاتھ چاروں انگلیوں کی جڑ سے کاٹا جائے[2]

اس مضمون کی اور دوسری احادیث بھی نقل ہوئی ہیں[3]

لیکن جو احادیث اس سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں وہ عام طور پر سند کے بغیر ہیں، یا ان کی سند ضعیف ہے اور اس سے قطع نظر ان میں ایسا نقص پایا جاتا ہے جن کا جواب آسان نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے فقہاء کے درمیان یہ بات مسلّم ہے کہ اگر "چور" دوبارہ چوری کرے (جبکہ اس پر حد جاری ہو چکی ہو) تو اس کے پاؤں کے اگلے حصّہ کو قطع کریں گے اور پاؤں کی ایڑی کو سالم رہنے دیں گے۔ حالانکہ پاؤں کا انگوٹھا بھی سجدہ کے سات

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۲ ص ۹۰۰ حدیث ۳

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۴۹۰ (ابواب حد السرقہ باب ۴ حدیث ۵)

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۹ ۔ ۴۴۰

مقامات میں سے ایک ہے اور اسی طرح "محارب" (ڈر کے ڈرنے والے) کے بارے میں جس کی سزاؤں میں سے ایک اس کے ہاتھ پاؤں کے ایک حصہ کو قطع کرنا ہے۔

تیسرا یہ کہ "مساجد" سے مراد وہی سجود ہے یعنی سجدہ ہمیشہ خدا کے لیے ہونا چاہیے اور اس کے غیر کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ احتمال بھی آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے، اور اس پر کوئی بھی شاہد موجود نہیں ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ آیت کے ظاہر کے موافق ہے وہ پہلی تفسیر ہی ہے اور توحید اور عبادت کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کے بارے میں، قبل و بعد کی آیات سے مکمل مناسبت رکھتی ہے اور دوسری تفسیر آیت کے مفہوم میں وسعت کی قسم سے ہے لیکن تیسری تفسیر پر کوئی شاہد نہیں ہے۔

اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے، قرآن مجید اور پیغمبرؐ کی عبادت کی، حد سے زیادہ تاثیر کو بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "جس وقت خدا کا بندہ ——— محمدؐ ——— عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور خدا کو پکارتا ہے تو جنوں کا ایک گروہ شدت سے اس کے اطراف میں جمع ہو جاتا ہے" (و انه لمّا قام عبد الله یدعوه کادوا یکونون علیه لبدًا)۔[1]

"لبد" (بروزن پدر) اس چیز کے معنی میں ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ رکھے گئے ہوں، اور یہ تعبیر اس پہلی ملاقات میں، قرآن سننے کے لیے، جن مومنین کے عجیب و غریب ہجوم کو بیان کرتی ہے، اور اسی طرح پیغمبرؐ کی نماز کے حد سے زیادہ قوت جذب کو بیان کرتی ہے۔

اس آیت کے لیے دو اور تفاسیر بھی بیان ہوئی ہیں پہلی یہ کہ مومنین جن پیغمبر کے اصحاب کی حالت کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ اتنی کم تعداد ہونے کے باوجود جو مکہ میں ان کی تھی۔ پیغمبرؐ کے ارشادات کو سننے کے لیے کس طرح سر اور کندھے سے بھی اوپر چلے جاتے تھے۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ گروہ جن انھیں نمونہ بنا کر ایمان کی طرف آئیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین عرب کی حالت کا بیان ہے کہ جس وقت پیغمبر نماز اور قرآن میں مشغول ہوتے تھے تو وہ آپ کے اطراف کو سختی سے گھیر لیتے تھے اور استہزاء کرتے، مذاق اڑاتے اور آپ کو تکلیف و آزار پہنچاتے۔

لیکن آخری تفسیر جن مبلغین کے ہدف و مقصد کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ دوسروں کو ایمان کا شوق دلائیں لہٰذا مناسب گزشتہ دو معانی میں سے کوئی ایک ہی ہے۔

ایک نکتہ

آیہ "ان المساجد لله" کی تفسیر میں تحریف

پیغمبر اور اولیاء دین سے "توسل" کا مسئلہ یعنی ان حضرات کو بارگاہِ خدا میں وسیلہ اور شفیع قرار دینا ایک ایسا مفہوم ہے جو نہ حقیقتِ توحید سے

---

[1] اس تفسیر کے مطابق اور اس بناء پر کہ یہ جملہ جن مومنین کی گفتگو میں سے ہو، "مستکم" کی بجائے "غائب" کی ضمیر لانا باب "التفات" سے ہے۔ یا یہ اس لحاظ سے ہے کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کی حالت کو بیان کر رہا تھا۔ (غور کیجیے)

منافات رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی آیات سے، بلکہ یہ تو توحید پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ہر چیز خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید کی آیات میں بھی مسئلہ شفاعت اور اسی طرح مومنین کے لیے پیغمبر کی استغفار اور طلب بخشش کے مسئلہ کا بار بار اشارہ ہوا ہے[1]

اس کے باوجود بعض ایسے لوگوں کا ——— جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات سے دور ہیں ——— اصرار یہ ہے کہ ہر قسم کے توسل اور شفاعت کا انکار کردیں اور اپنے مقصود کو ثابت کرنے کے لیے کچھ دستاویزات لائے ہیں۔ منجملہ ان کے اوپر والی آیت (و ان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدًا) ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے مطابق قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ کسی شخص کا نام نہ لو اور اس کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔ اور کسی سے شفاعت طلب نہ کرو۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ اس آیت کا اس مفہوم کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ہدف اور مقصد شرک کی نفی ہے۔ یعنی کسی چیز کو خدا کے ساتھ عبادت کرنے میں یا حاجت طلب کرنے میں شریک قرار دینا۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی واقعی طور پر خدا کے کام غیر خدا سے چاہے اور اس کو صاحب اختیار اور ان کے انجام دینے میں مستقل شمار کرے تو وہ مشرک ہے۔ جیسا کہ لفظ "مع" (فلا تدعوا مع الله)" کے جملہ میں اس معنی کی گواہی دیتا ہے کہ کسی کو خدا کا شریک اور "مستقل تاثیر کا مبدء" نہیں جاننا چاہیے۔

لیکن اگر کوئی خدا کے انبیاء سے شفاعت چاہے یا پروردگار کی بارگاہ میں وساطت کا تقاضا کرے۔ تو یہ نہ صرف اس کی نفی نہیں کرتا، بلکہ قرآن بعض اوقات خود پیغمبر کو اس بات کی دعوت دیتا ہے، اور کبھی دوسروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیغمبر سے شفاعت طلب کریں۔

سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: خذ من اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها و صل عليهم ان صلاتك سكن لهم "ان کے مال سے زکوٰۃ لے تاکہ تم اس کے ذریعہ انھیں پاک کردو اور (زکات وصول کرتے وقت) ان کیلیے دعا کرو، کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے۔

اور سورۂ یوسف کی آیہ ۹۷ میں ان کے بھائیوں کی زبانی باپ کو خطاب کرتے ہوئے یہ آیا ہے: يا ابانا استغفر لنا ذنوبنا انا كنا خاطئين "اے اباجان! ہمارے لیے استغفار کیجیے کیونکہ ہم خطاکار تھے۔

یعقوب نے بھی۔ اس تقاضے کا نہ صرف انکار نہیں کیا بلکہ ان کی درخواست کی موافقت میں یہ وعدہ دیا اور کہا: سوف استغفر لكم ربي "میں بہت جلد تمھارے لیے بارگاہِ خدا سے بخشش کا تقاضا کروں گا"۔

اس بناء پر توسل اور شفاعت طلب کرنے کا مسئلہ اس مفہوم کے ساتھ، جو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے صریح احکام میں سے ہے۔

---

[1] ہم نے "قرآن و حدیث کی نظر میں شفاعت" کے مسئلہ کے بارے میں۔ پہلی جلد سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں اور "توسل" کی حقیقت کے بارے میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۳۵ جلد ۴ میں۔ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

۲۰۔ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ○
۲۱۔ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ○
۲۲۔ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○
۲۳۔ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ○
۲۴۔ حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ○

ترجمہ

۲۰۔ کہہ دیجیے: میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا۔
۲۱۔ کہہ دیجیے! میں تمھارے لیے کسی نقصان یا ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔
۲۲۔ کہہ دیجیے! (اگر میں بھی اس کے حکم کے خلاف کروں گا) تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا اور اس کے علاوہ مجھے اور کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔
۲۳۔ میری ذمہ داری تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغِ رسالت اور اس کے پیغاموں کو پہنچانا ہے، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنّم کی آگ ہے۔ وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔
۲۴۔ (کفار کی یہ کارشکنی اسی طرح جاری رہے گی) جب تک کہ وہ اسے دیکھ نہ لیں، جس کا انھیں وعدہ دیا گیا ہے اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار زیادہ ضعیف ہیں اور کس کی جمعیت بہت ہی کم ہے۔

تفسیر

کہہ دیجیے: میں کسی کے سود وزیاں کا مالک نہیں ہوں

ان آیات میں توحید کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے لیے ـــــ جس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا تھا ـــــ پہلے پیغمبر کو حکم دیا جاتا ہے: "کہہ دیجیے میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں، اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا" (قل انما ادعوا ربی ولا اشرک بہ احدًا)۔

اس کے بعد حکم ہے: "کہہ دیجیے میں تمھارے لیے سود وزیاں کا مالک نہیں ہوں اور ہدایت دوسرے کے ہاتھ میں ہے" (قل انی لا املک لکم ضرًا ولا رشدًا)۔

پھر مزید کہتا ہے: "کہہ دیجیے: اگر میں بھی خدا کے حکم کے خلاف کام کروں گا تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا، اور میں اس کے علاوہ کوئی اور ملجاء اور پناہ گاہ نہیں پاؤں گا" (قل انی لن یجیرنی من اللہ احد ولن اجد من دونہ ملتحدًا)۔[1]

اس طرح سے نہ تو کوئی مجھے پناہ دے سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی چیز میری پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ یہ باتیں ایک طرف تو خدا کی بارگاہ میں مکمل عبودیت کا اعتراف ہے، اور دوسری طرف سے پیغمبرؐ کے بارے میں ہر قسم کے غلو کی نفی کرتی ہیں اور تیسری طرف سے یہ بتاتی ہیں کہ نہ حرف باتوں سے ہی کوئی کام نہیں ہوپاتا بلکہ خود پیغمبرؐ بھی اس عظمت کے باوجود عذابِ خدا کے مقابلہ میں ملجاء اور مستقل پناہ نہیں ہوسکتے۔ اور چوتھی طرف سے ان بہانہ جوئیوں اور بے محل توقعات کو ـــــ جو ہٹ دھرم لوگ پیغمبرؐ سے رکھتے تھے، اور ان سے خدائی کاموں کے تقاضے کرتے تھے ـــــ ختم کرتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ توسل اور شفاعت بھی اذنِ خدا سے ہی ہے۔

"ملتحدًا" مطمئن پناہ گاہ کے معنی میں ہے اور اصل میں "لحد" (بروزنِ مہد) کے مادہ سے اس گڑھے کے معنی میں ہے جو ایک کنارے پر بنایا گیا ہو، جیسا کہ مردوں کے لیے قبر کی گہرائی میں کھودا جاتا ہے، جو قبر کی گہرائی میں ایک طرف کو زیادہ مقدار میں کھودتے ہیں اور مُردے کے جسم کو اس میں رکھتے ہیں تاکہ اس پر مٹی نہ گرے اور جانوروں کے آسیب سے بھی زیادہ محفوظ رہے، اس کے بعد ہر دوسری مطمئن جگہ اور پناہ گاہ پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ان تعبیرات کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ خدا کے مقابلہ میں اور مستقل طور پر کوئی نقش و اثر

---

[1] بعض نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش نے پیغمبرؐ سے کہا کہ تم اپنے دین سے پھر جاؤ تاکہ ہم تمھیں پناہ دیں تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا (تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۲۹۳)

نہیں رکھتے، اس کے باوجود وہ خدا سے لوگوں کے لیے مشکلات کے حل کا تقاضا کر سکتے ہیں، یا شائستہ اور لائق افراد کے لیے ہدایت کی درخواست کر سکتے ہیں اور یہ عین توحید ہے نہ کہ شرک۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں "ضر" (نقصان) کے مقابلہ میں "رشد" (ہدایت) کو قرار دیا گیا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی سود اور نفع ہدایت میں ہے۔ جیسا کہ جنات کی باتوں میں بھی گزشتہ آیات میں "شر" اور "رشد" کے مقابلہ میں قرار پایا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "میرا وظیفہ تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ اور اس کے پیغامات کو پہنچانا ہے" (الا بلاغاً من اللہ و رسالاتہ)[1]

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جس کی طرف آیاتِ قرآنی میں بار بار اشارہ ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۹۲ میں آیا ہے: (انما علی رسولنا البلاغ المبین) "پیغمبر کے ذمہ تو صرف واضح طور پر ابلاغ کرنا (اور پہنچا دینا ہے)۔

اور سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ میں آیا ہے:

قل لا املك لنفسي نفعاً ولا ضراً الا ما شاء الله ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسني السوء ان انا الا نذير و بشير لقوم يؤمنون

"کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے لیے بھی سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں، اور اگر میں غیب کی خبر رکھتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سا نفع جمع کر لیتا اور کوئی بھی خرابی مجھے نہ پہنچتی۔ میں تو صرف اس گروہ کے لیے جو ایمان لے آتے ہیں، ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں"۔

اس جملہ کے لیے بہت سے مفسرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنی نجات کے لیے دعوتِ حق کے ابلاغ اور اس کی رسالت کے ادا کرنے کے سوا، کسی قسم کی کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتا[2]

یہ بات کہ "بلاغ" اور "رسالات" میں کیا فرق ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "بلاغ" تو اصول دین کے ابلاغ کی طرف اشارہ ہے اور "رسالات" فروعِ دین کے بیان کی طرف۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ "بلاغ" احکامِ الٰہی کے معنی میں ہے اور "رسالات" ان کے اجراء کے معنی میں۔

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتیں اور یہ ایک دوسرے کی تاکید ہوں، اور قرآن کی بہت سی آیات اس طرح ہیں، جو ان دونوں کو ایک ہی معنی کی صورت میں بیان کرتی ہیں، مثلاً سورۂ اعراف کی آیہ ۶۲، جو یہ کہتی ہے "ابلغكم رسالات ربي"

---

[1] چونکہ "بلاغ" "صرف" "عن" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اس لیے بعض نے "من" کو "عن" کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے "کائناً" کا لفظ مقدر سمجھا ہے (الا بلاغاً کائناً من اللہ)

[2] اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ گزشتہ جملے ولن اجد من دونہ ملتحداً سے استثناء ہے اور پہلی تفسیر کے مطابق گزشتہ آیات سے استثناء ہے۔

"میں اپنے پروردگار کی رسالتیں تمھیں پہنچاتا ہوں" (اور دوسری متعدد آیات)

بہرحال آیت کے آخر میں خبردار کرتا ہے کہ "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی معصیت اور نافرمانی کرے گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا" (ومن یعص اللہ و رسولہ فان لہ نار جھنم خالدین فیھا ابدًا)۔

یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد ہر گنہگار نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد مشرکین اور کافرین ہیں، کیونکہ ہر گنہگار ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہنے کا مستحق نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: کفار و مشرکین کی یہ وضع و کیفیت، کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کا استہزاء کرتے اور انھیں ضعیف اور کمزور شمار کرتے ہیں اس وقت تک یونہی جاری رہے گی، جب تک کہ وہ اس چیز کو نہ دیکھ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ جانیں گے کہ کس کے مددگار زیادہ ہیں، اور کس کی جمعیت کم ہے" (حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون فسیعلمون من اضعف ناصرًا و اقل عددًا)۔[1]

اس بارے میں کہ "ما یوعدون" کے جملہ سے دنیا کا عذاب مراد ہے یا آخرت کا یا دونوں؟ بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، لیکن مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی عام اور وسیع ہو، خاص طور پر جبکہ تعداد کی زیادتی اور کمی، اور ناصر و مددگار کا ضعف و قدرت زیادہ تر دنیا کے ساتھ مربوط ہے۔ لہٰذا بہت سے مفسرین نے اس کی جنگِ بدر کے مسئلہ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی قدرت و قوت آشکار ہوئی تھی اور بہت سی روایات میں مہدی (ارواحنا فداہ) کے ظہور کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ اس بناء پر اگر ہم آیت کی اس کے وسیع معنی کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ سب باتیں شامل ہوں گی۔

علاوہ ازیں سورۂ مریم کی آیہ ۷۵ میں بھی آیا ہے: حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون اما العذاب و اما الساعۃ فسیعلمون من ھو شر مکانًا و اضعف جندًا - یہ کیفیت اسی طرح برقرار رہے گی جب تک کہ وہ خدا کے وعدے کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے یا اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب، اس دن وہ جان لیں گے کہ کس شخص کی حیثیت بدتر اور کس کا لشکر زیادہ کمزور و ناتوان ہے"۔

بہرحال آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ دشمنانِ اسلام اپنے افراد کی قدرت اور کثرت پر ناز کیا کرتے تھے اور انھیں ضعیف و ناتواں شمار کرتے تھے، قرآن اس ذریعہ سے مومنین کو تسلی دیتے ہوئے اور ان کی دلداری کرتے ہوئے انھیں خوشخبری دیتا ہے کہ آخر کار ان کی کامیابی اور دشمنوں کی شکست و ناتوانی کا دن آپہنچے گا۔

---

[1] "حتّٰی" عام طور پر کسی چیز کی غایت اور نہایت کے لیے آتا ہے اور یہاں اس کے لیے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں پہلا یہ کہ یہ ایک محذوف جملہ کی غایت ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے "ولا یزالون یستھزءون و یستضعفون المؤمنین حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون" اور دوسری یہ کہ "یکونون علیہ لبدًا" کی غایت ہو، جو پہلے کی چند آیات میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

چند نکات

۱۔ خدائی رہبروں کی صداقت

خدائی رہبروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ "شیطانی رہبروں" کے برخلاف ہرگز لمبے چوڑے دعوے نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے اور متکبر و مغرور نہیں ہوتے۔

جبکہ فرعون انا ربکم الاعلیٰ "میں تمھارا اعلیٰ اور بلند تر خدا ہوں" وھٰذہ الانھار تجری من تحتی: "اور دریائے نیل کی بڑی بڑی شاخیں سب میری نظروں کے سامنے جاری ہیں"۔ کی احمقانہ فریاد بلند کرتا تھا، اور رہبران الٰہی، تواضع اور فروتنی سے، اپنے آپ کو خدا کے بندوں میں سے ایک چھوٹا سا بندہ بتلاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ وہ اس کے ارادہ کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی قدرت نہیں رکھتے۔

سورۂ کہف کی آیہ ۱۱۰ میں آیا ہے: قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ: کہہ دیجیے میں تو تم جیسا ہی ایک بشر ہوں، سوائے اس کے کہ میری طرف وحی ہوتی ہے۔

اور دوسری جگہ آیا ہے: وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ وما انا الا نذیر مبین: میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمھارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی ہوتی ہے اور میں ایک واضح ڈرانے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں" (احقاف ـــــ ۹)

ایک اور دوسری آیت میں [illegible] لا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک [illegible] کہتا ہوں کہ میرے پاس ہیں یہ غیب کی [illegible] سوائے اس کے جس کی خدا مجھے تعلیم دیتا ہے) اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں" (انعام ـــــ ۵۰)

اگر وہ مادی قدرت کی انتہائی بلندی پر بھی پہنچ جاتے تو بھی ہرگز آپے سے باہر نہ ہوتے اور سلیمان کی طرح کہتے: ھٰذا من فضل ربی: "یہ قدرت و شوکت میرے پروردگار کا فضل ہے" (نمل ـــــ ۴۰)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد آیات میں سخت قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں، جن میں پیغمبر کی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں عتاب کرتا ہے، اور اس بات کی تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کا خیال رکھیں۔

[illegible] اور گزشتہ آیات کا مجموعہ جن کی تعداد قرآن میں کم نہیں ہے، اس پیغمبر کی حقانیت پر ایک زندہ سند ہے۔ ورنہ اس میں کونسی رکاوٹ تھی کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جو آپ کے لیے ہر قسم کے مقام اور منزلت کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، اپنے لیے بڑے سے بڑے مقام کا دعویٰ کرتے، جو فکر بشر کی دسترس سے بھی بالاتر ہوتا اور ہر قسم کے چون و چرا سے دور بھی۔ جیسا کہ تاریخ نے شیطانی رہبروں کے بارے میں اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔

ہاں! زیرِ بحث آیات اور ان ہی جیسی آیات کی تعبیریں رسول اللہ کی دعوت کی حقانیت کے زندہ شواہد ہیں۔

۲۔ جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں، جمعیت کا ایمان اہم ہے۔

قرآنی آیات میں یہ مطلب بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ ہر زمانے کے طاغوت اپنی جمعیت اور افرادی قوت کی دوسروں پر زیادتی پر فخر کرتے تھے اور انبیاء کے مقابلے میں اتراتے تھے۔

فرعون موسیٰؑ کے طرف داروں کی تحقیر کے لیے کہتا تھا: "ان هٰؤلاء لشرذمة قليلون" "یہ بہت ہی تھوڑے سے آدمی ہیں"۔ (شعراء ـــــ ۵۴)

اور مشرکینِ عرب یہ کہا کرتے تھے: "نحن اكثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبين" "ہم بہت مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا" (سبا ـــــ ۳۵)

اور کبھی ایک بے ایمان آدمی ایک مومن آدمی کے مقابلہ میں اپنی ثروت اور افرادی قوت پر فخر کرتے ہوئے کہتا: "انا اكثر منك مالا واعز نفرا" "میرے پاس تجھ سے زیادہ دولت و ثروت اور زیادہ قوی افراد ہیں" (کہف ـــــ ۳۴) لیکن اس کے مقابلہ میں، افراد مومن، انبیاء اور خدائی رہبروں کی پیروی میں، جمعیت کی زیادتی اور افرادی قوت پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی منطق یہ تھی: "كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله" "کتنے ہی چھوٹے گروہ ایسے ہوئے ہیں جو خدا کے حکم سے بڑے بڑے گروہوں پر کامیاب ہوئے ہیں" (بقرہ ـــــ ۲۴۹)

امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں:

ایها الناس لاتستوحشوا فی طریق الهدی لقلة اهله

اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے ہرگز وحشت نہ کرو[1]

تاریخ انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی تاریخِ زندگی، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور بکثرت جمعیتیں، ہر قسم کی قدرت رکھنے کے باوجود، مومنین کے تھوڑے سے یاور و انصار کے مقابلہ میں کس طرح سے شکست اور درماندگی کا شکار ہوئے۔ قرآن مجید میں "بنی اسرائیل" و "فرعون" اور "طالوت" و "جالوت" کی داستان میں اور "جنگ بدر" و "احزاب" سے مربوط آیات میں بھی یہ معنی اچھی طرح منعکس ہوئے ہیں۔

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۰۱

۲۵۔ قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ○

۲۶۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ○

۲۷۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○

۲۸۔ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ○

ترجمہ

۲۵۔ کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے، یا میرا پروردگار اس کے لیے کوئی وقت قرار دے گا۔

۲۶۔ عالم الغیب وہی ہے اور وہ کسی شخص کو بھی اپنے غیب کے اسرار پر آگاہ نہیں کرتا۔

۲۷۔ مگر ان رسولوں کو، جنھیں اس نے منتخب کرلیا ہے، اور وہ ان کے لیے، ان کے آگے بھی اور پیچھے بھی نگران مقرر کردیتا ہے۔

۲۸۔ تاکہ وہ جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر احاطہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کا حساب کر رکھا ہے۔

تفسیر

عالم الغیب خدا ہے

چونکہ گزشتہ آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ اس گروہ کا استہزاء اور سرکشی اسی طرح سے جاری رہے گی، جب تک

عذاب کا خدائی وعدہ نہیں آپہنچتا اور اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ جیسا کہ مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں بیان کیا ہے، کہ بعض مشرکین نے "نضر بن حارث" کے مانند، گزشتہ آیات کے نزول کے بعد اسی سوال کو پیش کیا تھا۔ قرآنِ مجید اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"کہہ دیجیے! میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (دنیا کا عذاب اور قیام قیامت) قریب ہے یا میرا پروردگار، اس کے لیے کوئی زمانہ قرار دے گا" (قل ان ادری اقریب ماتوعدون ام یجعل له ربی امدًا)۔

یہ علم خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس نے یہ چاہا ہے کہ یہ اس کے بندوں سے پوشیدہ رہے۔ تاکہ مخلوق کے امتحان اور آزمائش کا موضوع مکمل ہو، کیونکہ اگر وہ یہ جان لیں کہ وہ دور ہے یا نزدیک ہے تو دونوں صورتوں میں امتحان کا اثر کم ہو جائے گا۔

"امد" (بروزن صمد) زمانہ کے معنی میں ہے، اس فرق کے ساتھ کہ "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق کہ "زمان" تو ابتداء اور انتہاء دونوں کو شامل ہوتا ہے، لیکن "امد" صرف کسی چیز کی انتہاء کے زمانہ کو کہتے ہیں۔

اہلِ لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ "امد" اور "ابد" معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ "ابد" تو غیر محدود مدت کو بھی شامل ہوتا ہے جبکہ "امد" صرف محدود مدت چاہے وہ جتنی بھی طولانی ہو۔

بہرحال، قرآن مجید کی آیات میں بارہا یہ مطلب ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب بھی قیامت کے زمانہ کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو پیغمبر اکرمؐ اس سے بے اطلاع ہونے کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ "اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے"۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "جبرئیل" ایک بدو عرب کی صورت میں پیغمبرؐ کے سامنے ظاہر ہوئے۔ اور ان سوالات میں سے جو انھوں نے آنحضرتؐ سے کیے، ایک یہ تھا کہ:

اخبرنی عن الساعة

"بتلائیے قیامت کب برپا ہوگی"؟

پیغمبرؐ نے فرمایا:

ما المسئول عنها باعلم من السائل

"جس سے سوال کر رہے ہو وہ (اس مسئلہ میں) سوال کرنے والے سے زیادہ آگاہ نہیں ہے"۔

اس مردِ عرب نے دوبارہ بلند آواز میں کہا:

یا محمدؐ متی الساعة؟

"اے محمدؐ! قیامت کب آئے گی"؟

پیغمبرؐ نے فرمایا:

ویحك انها کائنة فما اعددت لها؟

"وائے ہو تجھ پر قیامت تو آکر رہے گی، یہ تو بتا کہ تو نے اس کے لیے کون سی چیز تیار کر رکھی ہے"۔

اعرابی نے کہا:

"میں نے نماز و روزہ تو کوئی زیادہ فراہم نہیں کیا لیکن خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا:

فانت مع من احببت

"پس تو اس کے ساتھ رہے گا جسے تو دوست رکھتا ہے"۔

اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک صحابی "انس" کہتے ہیں:

فما فرح المسلمون بشیء فرحهم بهذا الحدیث

"مسلمان کسی حدیث پر اتنا خوش نہیں ہوئے، جتنا کہ اس حدیث پر خوش ہوئے"[1]

اس کے بعد بحث کو جاری رکھتے ہوئے، علم غیب کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "عالم الغیب خدا ہے وہ کسی کو بھی اپنے غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں کرتا" (عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احداً)[2]

اس کے بعد اس کلی مسئلہ سے استثناء کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "مگر وہ رسول کہ جسے اس نے برگزیدہ کیا ہے اور اس سے وہ راضی ہے"۔ (الا من ارتضی من رسول)۔

وہ اسے جتنا چاہتا ہے علم غیب کی تعلیم دیتا ہے اور وحی کے ذریعہ اس تک پہنچاتا ہے۔

"پھر اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے نگہبان بھیجتا ہے"۔ (فانه یسلك من بین یدیه و من خلفه رصداً)۔

"رصد" اصل میں "مصدری" معنی رکھتا ہے اور کسی چیز کی نگرانی اور نگہبانی کے لیے آمادگی کے معنی میں ہے اور "اسم فاعل" اور "مفعول" پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ مفرد و جمع دونوں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ایک نگرانی کرنے والا اور نگہبان فرد، یا نگرانی کرنے والے اور نگہبانوں کی ایک جماعت، دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنھیں خدا نزولِ وحی کے بعد حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے پیغمبر کا ہر طرف سے احاطہ کیے رہیں۔ اور شیاطین، جن و انس اور ان کے وسوسوں سے، اور ان چیزوں سے، جو وحی کی اصالت کو خدشہ دار کرتی ہیں، محافظت اور پاسداری کریں، تاکہ اللہ کا پیغام کمی و زیادتی اور کسی معمولی سے معمولی خدشہ کے بغیر بندوں تک پہنچ جائے۔

اور یہ بات خود پیغمبر کے معصوم ہونے کی ایک دلیل ہے کہ وہ غیبی قوتوں اور خدائی امدادوں اور اس کے فرشتوں کی نگرانی کے ذریعہ لغزشوں اور خطاؤں سے

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۹ ص ۱۰۵

[2] "عالم الغیب" ایک مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر "هو العالم الغیب" ہے اور بعض نے اسے "ربی" کی صفت یا بدل قرار دیا ہے، جو گزشتہ آیت میں ہے۔

مامون و محفوظ ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں جو اس سورہ کی آخری آیت ہے، ان نگرانی کرنے والے نگہبانوں کے وجود کی دلیل کو اس طرح بیان کرتا ہے "مقصد یہ ہے کہ خدا جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات بے کم و کاست پہنچا دیئے ہیں، اور جو کچھ ان کے پاس ہے، خدا اس پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس نے ہر ایک چیز کا باریکی کے ساتھ شمار کیا ہے" (لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بما لدیھم واحصی کل شیء عددًا)۔[1]

یہاں "علم" سے مراد علم فعلی ہے اور دوسرے لفظوں میں آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے بارے میں کسی چیز کو نہیں جانتا تھا اور بعد میں اس نے جانا ہے۔ کیونکہ خدا کا علم ازلی و ابدی اور بے پایاں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ علم الٰہی خارج میں تحقق پائے اور عینی صورت اختیار کرے۔ یعنی پیغمبر اس کی رسالت کی عملی طور پر تبلیغ کریں اور اتمام حجت کریں۔

چند نکات

علمِ غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق

قرآن کی مختلف آیات میں غور کرنے سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ علمِ غیب کے سلسلہ میں دو قسم کی آیات موجود ہیں، پہلی قسم کی آیات تو وہ ہیں جو علمِ غیب کو خدا کے ساتھ مخصوص بتاتی ہیں، اور اس کے غیر سے اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۵۹، وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو: غیب کی چابیاں خدا ہی کے پاس ہیں، اس کے سوا کوئی شخص انھیں نہیں جانتا اور سورۂ نمل کی آیہ ۶۵ قل لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ، کہہ دیجیے کہ آسمانوں اور زمین میں سے کوئی شخص بھی غیب کو نہیں جانتا، سوائے خدا کے۔

اور پیغمبرؐ کے بارے میں سورۂ انعام کی آیہ ۵۰ میں جو کچھ آیا ہے، مثلاً، قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب: کہہ دیجیے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں، اور میں غیب کو نہیں جانتا۔

اور سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ میں آیا ہے: ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر: "اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو میں بہت سی خیر فراہم کرلیتا" اور آخر میں سورۂ یونس کی آیہ ۲۰ میں یہ آیا ہے: فقل انما الغیب للہ

---

[1] بہت سے مفسرین نے "لیعلم" کی ضمیر کو پیغمبر اسلامؐ کی طرف لوٹایا ہے اور انھوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا اسرارِ وحی و رسالت کے لیے حافظ اور نگہبان قرار دیتا ہے، تاکہ پیغمبرؐ جان لے کہ انھوں نے دقت کے ساتھ، وحیِ الٰہی کو اس کے پاس پہنچا دیا ہے اور کسی قسم کا شک اور تردد وحیِ الٰہی کی اصالت میں نہ کرے لیکن تفسیر۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ رسالت تو پیغمبر کا کام ہے، نہ کہ فرشتوں کا، اور "رسول" کی تعبیر گزشتہ آیت میں اور "رسالات" کی تعبیر چند گزشتہ آیات میں، خود پیغمبرؐ کی ذات کے بارے میں آئی ہے۔ بعید نظر آتی ہے، اور حق وہی پہلی تفسیر ہے۔

"کہہ دیجیے کہ غیب تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے"۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات۔

دوسرا حصہ ان آیات کا ہے جو وضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اولیاءِ خدا "اجمالی طور پر" علمِ غیب سے آگاہی رکھتے تھے، جیسا کہ آلِ عمران کی آیہ ۱۷۹ میں آیا ہے: وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء خدا تم کو تو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرے گا لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کے لیے) منتخب کر لیتا ہے (اور اسرارِ غیب کا ایک حصہ انھیں عطا کر دیتا ہے)۔

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معجزات میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا: وانبئکم بما تأکلون وما تدخرون فی بیوتکم: "میں تمھیں اس کی جو تم کھاتے ہو یا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، خبر دیتا ہوں"۔

(آلِ عمران ـــــ ۴۹)

زیرِ بحث آیت بھی، اس استثناء کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو اس میں آیا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا علمِ غیب کا ایک حصہ اپنے برگزیدہ رسولوں کو عطا فرماتا ہے (کیونکہ نفی سے استثناء ہمیشہ اثبات ہوتا ہے)۔

دوسری طرف قرآن کی وہ آیات جو غیب کی خبروں پر مشتمل ہیں، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ روم کی دوسری آیت سے لے کر چوتھی تک غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین: "رومی مغلوب ہو گئے ہیں، اور یہ شکست نزدیک کی سرزمین میں واقع ہوئی ہے، لیکن وہ اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب ہوں گے، چند ہی سالوں کے اندر اندر"۔ اور سورۂ قصص کی آیت ۸۵ جو کہتی ہے: ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد: "وہ ہستی جس نے قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے، وہ تجھے تیری جگہ (مکہ) کی طرف دوبارہ پلٹائے گا"۔

اور سورۂ فتح کی آیہ ۲۷ جو کہتی ہے: لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ اٰمنین: "انشاءاللہ تم مسجد الحرام میں انتہائی امن و امان کے ساتھ، داخل ہو گے"۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات۔

اصولی طور پر آسمانی وحی جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے، ایک قسم کا غیب ہی ہے جو انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیب سے آگاہی نہیں رکھتے جبکہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ہمارے پاس بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر غیب کا علم رکھتے تھے اور بعض اوقات اس کی خبر دیا کرتے تھے۔ مثلاً فتح مکہ کی داستان اور "حاطب بن ابی بلتعہ" کے واقعہ میں جس میں مکہ کے لوگوں کو خط لکھا تھا اور وہ خط مشرکینِ مکہ کے پاس پہنچانے کے لیے "سارہ" نامی عورت کے حوالے کیا گیا تھا، تاکہ وہ انھیں لشکرِ اسلام کے قریب الوقوع حملہ سے آگاہ کر دے۔ اور اس عورت نے وہ خط اپنے گیسوؤں کے درمیان چھپا کر مکہ کی طرف چل پڑی تھی۔ پیغمبرؐ نے علیؑ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو اس کے پیچھے بھیجا، اور فرمایا: تمھیں ایک منزل گاہ پر جس کا نام روضہ "خاج" ہے ایک عورت ملے گی اس کے پاس "حاطب" کا خط ہے، جو مشرکینِ مکہ کے نام ہے۔ تم اس سے وہ خط لے لو، جب وہ سب کے سب وہاں پہنچے تو انھیں وہ

عورت مل گئی ، شروع میں اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا ، لیکن آخر کار اس نے اعتراف کر لیا اور انھوں نے وہ خط اس سے لے لیا[۱]

اس کے علاوہ جنگِ "موتہ" کا واقعہ اور جعفر اور لشکرِ اسلام کے بعض دوسرے کمانداروں کی شہادت کی خبر دینا ۔ جبکہ پیغمبر نے ، مدینہ میں مسلمانوں کو ، اسی لمحہ میں ، جبکہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا ، خبر دی تھی[۲] اور اس قسم کے اخبارِ غیب کی مثالیں پیغمبرؐ کی زندگی میں کم نہیں ہیں ۔

نہج البلاغہ میں بھی آئندہ کے واقعات کی بہت سی پیشین گوئیاں نظر آتی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ علیؑ ان اسرارِ غیب کو جانتے تھے ۔ مثلاً وہ باتیں جو خطبہ ۱۲ میں اہلِ بصرہ کی مذمت میں بیان ہوئی ہیں ۔ جس میں آپ فرماتے ہیں :

کانی بمسجدکم کجؤجؤ سفینۃ قد بعث اللہ علیھا العذاب من فوقھا ومن تحتھا وغرق من فی ضمنھا

"گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان و زمین سے خدا کا عذاب تم پر نازل ہو رہا ہے اور تم سب کے سب اس میں غرق ہو گئے ہو ، صرف تمھاری مسجد کی چوٹی کشتی کے سینہ کی طرح پانی کے اوپر نمایاں ہے"

اور دوسری روایات میں بھی جو علمائے اہل سنت اور شیعہ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں ، آئندہ کے واقعات کے بارے میں آنحضرتؐ سے بہت سی پیشین گوئیاں آئی ہیں ، جیسا کہ "ہجر بن قیس" کے بارے میں ہے کہ آپ نے فرمایا : تجھے میرے بعد لعنت کرنے پر مجبور کریں گے[۳]

اور جو کچھ آپ نے "مروان" کے بارے میں فرمایا کہ وہ بڑھاپے کے بعد ضلالت و گمراہی کا پرچم کندھے پر اٹھائے گا[۴]

اور جو کچھ "کمیل بن زیاد" نے حجاج سے کہا تھا کہ امیر المومنین علیؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ تو میرا قاتل ہے[۵]

اور جو کچھ آپ نے خوارج نہروان کے بارے میں فرمایا تھا ، کہ ان سے جنگ میں ہمارے گروہ کے دس آدمی بھی نہیں مارے جائیں گے ، اور ان میں سے دس آدمی بھی نجات نہیں پائیں گے اور حقیقتاً اسی طرح واقع ہوا[۶]

اور جو کچھ امام حسینؑ کی قبر کی جگہ کے بارے میں سرزمین کربلا کے قریب سے عبور کے وقت" اصبغ بن نباتہ سے فرمایا[۷]

کتاب فضائل الخمسہ میں ، اہل سنت کی کتابوں سے ، علیؑ کے علم کی حد سے زیادہ وسعت کے بارے میں ، بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں ، ان سب کا یہاں بیان طول کا باعث ہوگا[۸]

---

[۱] اس واقعہ کی تفصیل حوالہ کے ساتھ اسی جلد میں سورۂ ممتحنہ کی تفسیر میں ہے ۔

[۲] "کامل ابن اثیر" جلد ۲ ص ۲۲۷ (واقعہ غزوۂ موتہ)

[۳] مستدرک الصحیحین جلد ۳ ص ۴۵۸

[۴] طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۳۰

[۵] الاصابہ ابن حجر ، جلد ۵ قسم ۳ ص ۳۲۵

[۶] "ہیثمی" نے "مجمع" جلد ۶ ص ۲۴۱ پر

[۷] "الریاض النظرہ" جلد ۲ ص ۲۲۲

[۸] "فضائل الخمسہ" جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۵۲

اہلِ بیت کی روایات میں بھی متعدد حدیثوں میں آئمہ معصومین کے لیے علمِ غیب کا اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے کتاب کافی جلد اوّل کے متعدد ابواب میں اس بارے میں تصریح یا اشارے نظر آتے ہیں۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحارالانوار کی جلد ۲۶ میں، اس سلسلہ میں بہت سی احادیث جو ۲۲ حدیثوں تک پہنچتی ہیں نقل کی ہیں۔

مجموعی طور پر پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین کے لیے اسرارِ غیب سے آگاہی کے سلسلہ میں روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ ان روایات و آیات کے درمیان، جن میں سے بعض غیر خدا سے علمِ غیب کی نفی کرتی ہیں اور بعض اثبات کرتی ہیں کس طرح جمع کی جائے؟

یہاں جمع کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں۔

جمع کے طریقوں میں سے مشہور ترین طریقہ یہ ہے کہ علمِ غیب کے خدا کے ساتھ اختصاص سے مراد علمِ ذاتی و استقلالی ہے۔ اس بناء پر اس کا غیر مستقل طور پر ہرگز علمِ غیب سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا، اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کے الطاف و عنایت سے ہے اور تبعی جنبہ رکھتا ہے۔

اس جمع کا شاہد یہی زیرِ بحث آیت ہے، جو کہتی ہے: خدا کسی کو بھی اپنے اسرارِ غیب سے آگاہ نہیں کرتا، مگر وہ رسول جس سے وہ راضی ہے۔

"نہج البلاغہ" میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جب علیؑ آئندہ کے واقعات کی خبر دے رہے تھے (اور اسلامی ممالک پر مغلوں کے حملہ کی پیشین گوئی کر رہے تھے) اور آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: اے امیرالمومنین کیا آپ علمِ غیب جانتے ہیں؟ حضرت ہنسے اور فرمایا:

لیس هو بعلم غیب، و انما هو تعلم من ذی علم

"یہ علمِ غیب نہیں ہے، یہ ایک ایسا علم ہے جو صاحبِ علم (پیغمبرؐ) سے میں نے حاصل کیا ہے"[1]

اس جمع کو بہت سے علماء و محققین نے قبول کیا ہے۔

۲۔ اسرارِ غیب دو قسم کے ہیں، ایک قسم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً قیامِ قیامت اور اسی قسم کے دوسرے امور، اور ایک قسم وہ ہے کہ جس کی وہ انبیاء و اولیاء کو تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ نہج البلاغہ میں اسی خطبہ کے ذیل میں جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے، آیا ہے کہ:

و انما علم الغیب علم الساعة و ما عدده الله سبحانه بقوله: ان الله عنده علم الساعة، و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام، و ما تدری نفس ماذا تکسب غدًا و ما تدری نفس بای ارض تموت

"علمِ غیب تو صرف قیامت کا علم ہے اور وہ ہے جسے خدا نے اس آیت میں شمار کیا ہے، جیسا کہ فرمایا،

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸۔

ہے: قیامت کے وقت سے آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہی بارش کو نازل کرتا ہے، اور جو کچھ ماؤں کے رحم میں ہے، اسے جانتا ہے اور کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا، اور کس سرزمین میں مرے گا"۔

اس کے بعد امام نے اس معنی کی تشریح میں مزید فرمایا:

"خداوند اس سے جو رحموں میں برقرار ہے، آگاہ ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی، بدصورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل، سعادت مند ہے یا شقی و بدبخت، اہل دوزخ ہے یا اہل جنت؟..... یہ سب علوم غیب ہیں، جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور ان کے علاوہ وہ علوم ہیں جن کی خدا نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دی ہے اور انھوں نے ان کی مجھے تعلیم دی ہے"[1]

۲۔ ان دونوں قسم کی آیات و روایات کے درمیان جمع کرنے کا ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ اسرار غیب دو جگہ ثبت ہیں "لوح محفوظ" (علم خدا کے مخصوص خزانہ) میں، جس میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر رونما نہیں ہوتا، اور اس سے کوئی بھی شخص آگاہ نہیں ہے اور (لوح محو و اثبات) جو مقتضیات کا علم ہے نہ کہ علت تامہ کا۔ اور اسی بناء پر وہ تغیر اور تبدیلی کے قابل ہے اور جسے دوسرے نہیں جانتے وہ اسی حصہ سے مربوط ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان اللہ علمًا لم یعلمہ الّا ھو، وعلمًا اعلمہ ملائکتہ ورسلہ فما اعلمہ ملائکتہ وانبیاءہ ورسلہ فنحن نعلمہ

"خدا کا ایک علم تو ایسا ہے جسے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ اور ایک علم ایسا ہے، جس سے اس نے فرشتوں اور انبیاء کو آگاہ کیا ہے، جو کچھ اس نے فرشتوں، انبیاء اور رسولوں کو دیا ہے، اسے ہم بھی جانتے ہیں"[2]

امام علی بن الحسینؑ سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لولا اٰیۃ فی کتاب اللہ لحدثتکم بما کان وما یکون الی یوم القیامۃ! فقلت لہ ایۃ اٰیۃ؟ فقال قول اللہ: یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب

"اگر قرآن مجید میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تمھیں اس سے بھی جو کہ پہلے گزر چکا ہے، اور ان واقعات کی بھی جو قیامت تک ہونے والے ہیں خبر دے دیتا، راوی کہتا ہے، میں نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

[2] بحار الانوار جلد ۲۶ ص ۱۶۰ (حدیث ۵) اس سلسلہ میں دوسری متعدد روایات بھی اس مادہ میں نقل ہوئی ہیں۔

فرمایا: خدا فرماتا ہے: یمحوا اللہ ما یشاء (خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے)، ام الکتاب (اور لوحِ محفوظ) اسی کے پاس ہے۔"[1]

اس جمع کے مطابق علوم کی تقسیم ان کے حتمی و یقینی ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر ہے، اور گزشتہ جمع میں معلومات کی مقدار کی بنیاد پر ہے۔ (غور کیجیے)

۴۔ ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ خدا تو تمام اسرارِ غیب سے بالفعل آگاہ ہے، لیکن انبیاء و اولیاء ممکن ہے بہت سے اسرارِ غیب کو بالفعل نہ جانتے ہوں، لیکن جب وہ ارادہ کرتے ہیں تو خدا انھیں ان کی تعلیم دے دیتا ہے، اور یقیناً یہ ارادہ بھی خدا کے اذن و رضا سے ہی انجام پاتا ہے۔

اس بناء پر ان آیات و روایات میں جو یہ بتلاتی ہیں کہ وہ نہیں جانتے، تو وہ بالفعل نہ جاننے کی طرف اشارہ ہے، اور جو یہ کہتی ہیں کہ وہ جانتے ہیں وہ ان کے جاننے کے امکان کی طرف اشارہ ہے

اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک خط کسی آدمی کو دے کہ وہ اسے دوسرے تک پہنچا دے، تو یہاں یہ کہا جا سکتا ہے اسے خط کے مضمون کا کوئی علم نہیں ہے، حالانکہ وہ خط کو کھول کر پڑھ سکتا ہے، کبھی تو صاحبِ خط نے اسے مطالعہ کی اجازت دی ہوئی ہوتی ہے، اس صورت میں اسے ایک لحاظ سے خط کے مضمون کا عالم سمجھا جا سکتا ہے اور کبھی اسے اجازت دی ہوئی نہیں ہوتی۔

اس جمع کی شاہد وہ روایات ہیں جو کتاب کافی کے ایک باب میں ان الائمۃ اذا شاؤا ان یعلموا علموا: "ائمہ جب کسی چیز کو جاننا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا علم دے دیا جاتا ہے" کے عنوان کے تحت وارد ہوئی ہیں:[2]

منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

اذا اراد الامام ان یعلم شیئا اعلمه الله بذالك

"جب امام کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اسے اس کی تعلیم دے دیتا ہے۔"

جمع کی یہ وجہ، پیغمبرؐ اور امام کے علم کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کو حل کر دیتی ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ اس پانی اور کھانے کو جس میں زہر ملا ہوا ہوتا ہے، کس طرح کھا لیتے ہیں، حالانکہ یہ بات جائز نہیں ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لیے خطرے کا موجب ہو، ایسے مواقع کے لیے یہ کہنا پڑے گا کہ پیغمبر یا امام کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کا ارادہ کریں کہ اسرارِ غیب ان پر آشکار ہوں

اسی طرح بعض اوقات مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر یا امام کسی مطلب پر آگاہ نہ ہوں، یا کوئی امتحان اور آزمائش ایسی صورت پذیر ہو جو ان کے تکامل و ارتقاء کا موجب بنے، جیسا کہ "لیلۃ المبیت" کی داستان میں آیا ہے کہ علیؑ پیغمبرؐ کے بستر پر سوئے، حالانکہ خود آنجناب سے نقل ہوا ہے کہ آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ صبح کے وقت جب مشرکینِ قریش اس بستر پر حملہ کریں گے تو شہید ہو جائیں گے یا جان سلامت رہے گی۔ یہاں مصلحت یہ ہے کہ امام اس کام کے انجام سے آگاہ نہ ہو، تاکہ خدائی آزمائش اور امتحان پورا ہو جائے اور اگر امام جانتے کہ وہ پیغمبر کے

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۱۲ (حدیث ۱۶۰)

[2] کتاب کافی باب ان الائمۃ اذا شاؤا ان یعلموا علموا (حدیث ۲) اسی مضمون کی دوسری روایات بھی اسی باب میں نقل ہوئی ہیں۔

بستر پر سوئیں گے اور صبح کو صحیح و سالم اٹھیں گے، تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں تھی اور آیاتِ قرآنی اور دیگر روایات میں اس ایثار و قربانی کی اہمیت کے سلسلہ میں جو کچھ وارد ہوا ہے کچھ زیادہ قابلِ توجہ نظر نہیں آتا۔

ہاں علم ارادی کا مسئلہ، اس قسم کے تمام اشکالات و اعتراضات کا جواب ہے۔

۵۔ علمِ غیب کے سلسلہ میں مختلف روایات کے لیے جمع کی ایک اور صورت بھی موجود ہے (اگرچہ یہ راہ ان روایات کے ایک حصّہ پر بھی صادق آتی ہے) اور وہ یہ ہے کہ ان روایات میں مخاطب مختلف تھے۔ وہ لوگ جو آئمہ کے بارے میں علمِ غیب کے مسئلہ کی قبولیت کی استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں، انھیں تو حق مطلب بیان کر دیا جاتا تھا لیکن مخالف یا ضعیف و کم استعداد افراد کے لیے۔ سننے والے کی سمجھ کے مطابق بات کی جاتی ہے۔

مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ ابوبصیر اور امام صادقؑ کے بزرگ اصحاب میں سے کچھ اور افراد ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امام غصّہ میں بھرے ہوئے مجلس میں وارد ہوئے، جب آپ بیٹھ گئے تو حاضرینِ مجلس سے فرمایا:

یا عجبا لاقوام یزعمون انا نعلم الغیب! ما یعلم الغیب الا اللہ عزوجل، لقد هممت بضرب جاریتی فلانة، فهربت منی فما علمت فی ای بیوت الدار هی

"تعجب ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم علمِ غیب جانتے ہیں (حالانکہ) خدا کے سوا کوئی بھی علمِ غیب نہیں جانتا۔ میں اپنی ایک کنیز کو تادیب کرنا چاہتا تھا، وہ میرے آگے سے بھاگ گئی اور مجھے یہ علم نہ ہوا کہ وہ گھر کے کس کمرے میں ہے"[1]

حدیث کا راوی کہتا ہے کہ جس وقت امام اس مجلس سے اٹھے، تو میں اور کچھ دوسرے اصحاب آپ کی منزل میں داخل ہوئے اور ہم نے کہا: ہم آپ پر قربان ہوں، آپ نے اپنی کنیز کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت سے علوم ہیں، اور ہم علمِ غیب کا تو کوئی نام نہیں لیتے؟

امام نے اس کے بعد اس سلسلہ میں تشریح کی جس کا مفہوم اسرارِ غیب پر آپ کی آگاہی تھا۔

واضح رہے کہ اس مجلس میں کچھ ایسے افراد تھے، جو ان معانی کے ادراک اور مقامِ امام کی معرفت کے لیے ضروری استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ان پانچوں طریقوں میں آپس میں کوئی منافات نہیں ہے اور سب ہی صادق ہو سکتے ہیں۔

(غور کیجیے)

۲۔ ائمہ کے علمِ غیب کو ثابت کرنے کی ایک اور راہ

یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ پیغمبرؐ اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر اسرارِ غیب سے آگاہ تھے دو اور راستے بھی موجود ہیں:

---

[1] اصول کافی جلد ۱ باب نادر فیہ ذکر الغیب حدیث ۲

پہلا یہ کہ ان کی ماموریت کسی خاص مکان و زمان میں محدود نہیں تھی، بلکہ پیغمبر کی رسالت اور آئمہ کی امامت جہانی اور جاودانی ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی وسیع ماموریت اور ذمہ داری رکھتا ہو، اور وہ اپنے محدود زمانہ اور ماحول کے سوا کسی قسم کی آگاہی نہ رکھتا ہو؟ کیا وہ شخص، جو مثلاً کسی ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کی امارت اور گورنری پر مامور ہو، اس علاقہ سے باخبر ہو سکتا ہے اور پھر یوں وہ اپنی ماموریت کو اچھی طرح انجام دے سکتا ہے؟

دوسرے الفاظ میں: پیغمبرؐ اور امام کو اپنی مدتِ حیات میں، احکامِ الٰہی کو اس طرح بیان و اجراء کرنا چاہیے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر مکان کے تمام انسانوں کی ضروریات کے لیے جواب دہ ہوں اور یہ ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسرارِ غیب کے ایک حصّہ کو جانتے ہوں۔

دوسرا یہ کہ: قرآنِ مجید میں تین آیات ایسی ہیں کہ اگر ہم انھیں ایک دوسری کے ساتھ رکھ دیں تو اس سے پیغمبرؐ اور آئمہ کے علم کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی یہ کہ قرآن اس شخص کے بارے میں جو "ملکہ سبا" کا تخت آنکھ جھپکنے میں سلیمان کے پاس لے آیا (یعنی آصف بن برخیا) کہتا ہے:

قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اٰتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک فلما رآہ مستقرًّا عندہ قال ھٰذا من فضل ربی

"اس شخص نے، جو کتاب میں سے کچھ علم رکھتا تھا، کہا: میں اس کو آنکھ جھپکنے سے پہلے تجھ کو لے آؤں گا، جب سلیمان نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے" (نمل ـــــ ۴۰)

دوسری آیت میں یہ آیا ہے:

قل کفٰی باللہ شھیدًا بینی و بینکم ومن عندہ علم الکتاب

"کہہ دیجیے میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے خدا اور وہ شخص جس کے پاس علمِ کتاب ہے کافی ہے" (رعد ـــــ ۴۳)

دوسری طرف بہت سی احادیث میں، جو اہلِ سنت اور شیعہ کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، اس طرح آیا ہے کہ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا سے "الذی عندہ علم من الکتاب" کے معنی پوچھے، تو آپ نے فرمایا: وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی تھا تو میں نے کہا "ومن عندہ علم الکتاب" کون ہے، تو آپ نے فرمایا:

ذاک اخی علی بن ابی طالب

"وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں"[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "علم من الکتاب" جو "آصف" کے بارے میں آیا ہے، علمِ جزئی کو بیان کرتا ہے، اور "علم الکتاب" جو علی کے بارے میں آیا ہے، وہ علمِ کلی کو بیان کرتا ہے، اس سے "آصف" اور علیؑ کے مقامِ علمی کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے

---

[1] "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۲۸۰ ـ ۲۸۱، اور "نور الثقلین" جلد ۲ ص ۵۲۲ کی طرف رجوع کریں۔

تیسری طرف سورۂ نحل کی آیہ ۸۹ میں آیا ہے: ونزلنا علیك الکتاب تبیانًا لکل شیء "ہم نے قرآن کو تجھ پر نازل کیا ہے، جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے"۔

واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی کتاب کے اسرار کا عالم ہو اسے غیب کے اسرار کو جاننا چاہیے اور یہ اس چیز پر ایک واضح اور آشکار دلیل ہے کہ اولیاء خدا میں سے کوئی انسان حکم خدا سے اسرار غیب پر آگاہ ہو سکتا ہے۔

علم غیب کے سلسلہ میں ہم نے سورہ انعام کی آیہ ۵۰، ۵۹ (جلد ۵ ص ۲۴۵، ۲۶۰) اور آیہ ۱۸۸ سورۂ اعراف (جلد ۷ ص ۴۶) کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

۳۔ "جن" کی خلقت کے بارے میں تحقیق

"جن" جیسا کہ اس لفظ کے لغوی مفہوم سے معلوم ہوتا ہے ایک ایسا نظر نہ آنے والا موجود ہے جس کے بہت سے مشخصات قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ ایک ایسا وجود ہے جو آگ کے شعلہ سے پیدا ہوا ہے، انسان کے برخلاف جو مٹی سے پیدا ہوا ہے (وخلق الجانّ من مارج من نار) (الرحمٰن ـــــ ۱۵)

۲۔ وہ علم و ادراک اور حق و باطل کی پہچان، اور منطق و استدلال کا حامل ہے (سورۂ جن کی مختلف آیات)

۳۔ وہ تکلیف و مسئولیت (فرائض و وظائف) رکھتا ہے، (سورۂ جن اور سورۂ رحمٰن کی آیات)

۴۔ ان میں سے ایک گروہ مومن و صالح اور ایک گروہ کافر ہے۔ (وانّا منا الصالحون ومنا دون ذٰلك) (جن ـــــ ۱۱)

۵۔ وہ حشر و نشر اور معاد و قیامت رکھتے ہیں (واما القاسطون فکانوا لجهنم حطبًا) (جن ـــــ ۱۵)

۶۔ وہ آسمانوں میں نفوذ کرنے، اور وہاں سے خبریں لینے اور چوری چھپے سننے کی قدرت رکھتے تھے، لیکن پھر انھیں روک دیا گیا۔ (وانّا کنّا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الآن یجد له شهابًا رصدًا) (جن ـــــ ۹)

۷۔ وہ بعض انسانوں کے ساتھ رابطہ پیدا کر لیا کرتے تھے، اور اس محدود آگاہی کے ذریعہ جو وہ بعض پوشیدہ اسرار کے بارے میں رکھتے تھے، انسانوں کو گمراہ کرتے تھے۔ (وانه کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقًا) (جن ـــــ ۶)

۸۔ ان میں کچھ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں، جو بہت زیادہ طاقت رکھتے ہیں، جیسا کہ انسانوں میں بھی ایسے افراد ہیں (قال عفریت من الجن انا آتیك به قبل ان تقوم من مقامك) ایک سرکش جن نے سلیمان سے کہا: "میں ملکہ سبا کا تخت، اس سے پہلے کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے (دربار برخواست کرے) اس کی سرزمین سے یہاں لے آؤں گا" (نمل ـــــ ۳۹)

۹۔ وہ انسانوں کے بعض ضروری کاموں کے انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں (ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ.....یعملون لہ مایشاء من محاریب و تماثیل و جفان کالجواب) "جنات کا ایک گروہ خدا کے حکم سے سلیمان کے سامنے کام کیا کرتا تھا اور اس کے لیے..... عبادت خانے، تصویریں اور بڑے بڑے برتن تیار کیا کرتے تھا" (سبا ـــــ ۱۲۔۱۳)

۱۰۔ ان کی خلقت روئے زمین پر انسانوں کی خلقت سے پہلے تھی (والجان خلقناہ من قبل) (حجر ـــــ ۲۷) اور کچھ دوسری خصوصیات۔

اس کے علاوہ قرآنی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ عام لوگوں میں مشہور ہے اور وہ انھیں "ہم سے بہتر" سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف انسان ایک ایسی نوع ہے جو ان سے بہتر اور برتر ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام خدائی پیغمبر انسانوں میں سے انتخاب ہوئے، اور وہ پیغمبر اسلام پر جو نوعِ بشر میں سے تھے، ایمان لائے اور آپ کی تبعیت اور پیروی کی، اور اصولی طور پر شیطان پر آدم کے سامنے سجدہ کا واجب ہونا جو قرآن کی تصریح کے مطابق اس وقت گروہِ جن (کے بزرگوں) میں سے تھا۔ (کہف ـــــ ۵۰) نوعِ انسان کی جن پر فضیلت پر دلیل ہے۔

یہاں تک تو ان مطالب سے گفتگو تھی، جو قرآن مجید سے، اس نظر نہ آنے والے موجود کے بارے میں معلوم ہوتے ہیں، جو ہر قسم کی بے ہودگی اور غیر علمی مسائل سے خالی ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ عامۃ الناس نے بہت سی خرافات اس موجود کے بارے میں گھڑی ہوئی ہیں، جو عقل و منطق کے ساتھ سازگار نہیں ہیں اور اسی بناء پر ایک خرافاتی اور غیر منطقی چہرہ اس موجود کو دیا گیا ہے کہ جونہی لفظ "جن" بولا جاتا ہے تو چند ایک خرافات بھی اس کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ انھیں عجیب و غریب اور وحشت ناک شکلوں اور دمدار دم دار و موذی و پرآزار، کینہ پرور و بدرفتار سمجھتے ہیں جو گرم پانی کے ایک برتن کو کسی خالی جگہ میں انڈیلنے سے گھروں کو آگ لگا سکتے ہیں۔ اور اسی قسم کے دوسرے موہومات۔

حالانکہ اگر وجود جن کو ان خرافات سے الگ کیا جائے تو اصل مطلب مکمل طور پر قابلِ قبول ہے، کیونکہ زندہ موجودات کے صرف ان ہی چیزوں میں منحصر ہونے پر، جنھیں ہم دیکھتے ہیں، کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ علماء اور علوم طبیعی کے ماہرین کہتے ہیں کہ وہ موجودات، جنھیں انسان اپنے حواس کے ساتھ درک کرسکتا ہے، ان موجودات کے مقابلہ میں، جو حواس کے ساتھ قابلِ ادراک نہیں ہیں کچھ بھی نہیں ہیں۔

ان آخری ایام تک جب تک کہ خوردبین سے زندہ موجودات کا انکشاف نہیں ہوا تھا، کوئی شخص یہ یقین نہیں کرتا تھا کہ پانی کے ایک قطرہ میں، یا خون کے ایک قطرہ میں ہزارہا زندہ جاندار موجود ہیں، جن کو دیکھنے کی انسان میں قدرت نہیں ہے۔

نیز ماہرین کہتے ہیں: ہماری آنکھ نہ صرف محدود رنگوں کو ہی دیکھتی ہے، اور ہمارا کان محدود صوتی امواج کو ہی سنتا ہے، وہ رنگ اور آوازیں جو ہماری آنکھ اور کان سے قابلِ ادراک نہیں ہیں، ان سے بہت ہی زیادہ ہیں جو قابلِ ادراک ہیں۔

جب عالم کی وضع و کیفیت اس طرح کی ہو، تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے، کہ انواع و اقسام کے زندہ موجودات اس عالم میں موجود ہوں، جنھیں ہم اپنے حواس کے ساتھ درک نہ کرسکتے ہوں، اور جب پیغمبر اسلام جیسا مخبر صادق ان کے متعلق خبر دے، تو ہم

اسے قبول کیوں نہ کریں ؟

بہرحال ایک طرف تو قرآن نے ، جو کلام ناطق صادق ہے ، جنات کے وجود کی ان خصوصیات کے ساتھ ، جو اوپر ذکر ہوئی ہیں ، خبر دی ہے ، اور دوسری طرف کوئی عقلی دلیل اس کی نفی پر موجود نہیں ہے ، لہذا اس کو قبول کرلینا چاہیے اور غلط دنا روا توجیہات سے بچنا چاہیے ، اور اسی طرح سے عوام کے خرافات سے اس سلسلہ میں اجتناب کرنا چاہیے ۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ " جن " کبھی ایک زیادہ وسیع مفہوم پر بولا جاتا ہے ، جو نظر نہ آنے والے کئی موجودات کے انواع کو شامل ہے ۔ عام اس سے کہ وہ عقل وادراک کے حامل ہو یا عقل وادراک نہ رکھتے ہوں ۔ یہاں تک کہ حیوانات کا وہ گروہ بھی ، جو آنکھ سے نظر آتا ہے اور عام طور پر گھونسلوں میں چھپا رہتا ہے ، اس وسیع معنی میں داخل ہے ۔

اس بات کی شاہد وہ روایت ہے جو پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے ، آپ نے فرمایا :

خلق اللہ الجن خمسة اصناف ، صنف کالریح فی الھواء ، وصنف حیات وصنف عقارب ، وصنف حشرات الارض ، وصنف کبنی آدم علیھم الحساب والعقاب

" خدا نے جنوں کو پانچ اقسام میں پیدا کیا ہے : ایک صنف تو ہوا کی طرح فضا میں ہے (جو نظر نہیں آتی) ۔ ایک صنف سانپوں کی صورت میں ہے ، ایک صنف بچھوؤں کی صورت میں ہے ، ایک صنف حشرات زمین ہیں اور ایک صنف ان میں سے انسان کی مانند ہے ، جس پر حساب وعتاب ہے "[1]

اس روایت اور اس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سی مشکلات ، جو روایات وحکایات میں ، جنات کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں ، حل ہوجائیں گی ۔

مثلاً بعض روایات میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

لا تشرب الماء من ثلمة الاناء ولا من عروته فان الشیطان یقعد علی العروة والثلمة

برتن کے ٹوٹے ہوئے حصہ اور اس کے دستے والی طرف سے پانی نہ پیو ، کیونکہ شیطان اس کے دستہ اور ٹوٹے ہوئے حصہ پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے "[2]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ " شیطان " " جنوں " میں سے ہے ، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ ، اور اسی طرح اس کا دستہ انواع واقسام کے جراثیم کی اجتماع کی جگہ ہوتا ہے ، یہ بعید نظر نہیں آتا کہ " جن وشیطان " " عام مفہوم " کے لحاظ سے اس قسم کے موجودات کو بھی شامل ہوں ، اگرچہ اس کا ایک خاص معنی بھی ہے ، جو ایک ایسا موجود ہے جو فہم وشعور اور مسئولیت و

---

[1] " سفینۃ البحار " جلد اول ص ۱۸۶ (مادہ جن)

[2] " کتاب کافی " جلد ۶ ص ۲۸۵ کتاب الاشربہ باب الاوانی حدیث ۵

تکلیف (فرائض و وظائف) رکھتا ہے، اور اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں۔[1]

پروردگارا! اس دن جس میں جن وانس تیری دادگاہ عدل میں حاضر ہوں گے، اور سب بدکار اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، تو ہمیں اپنے سایہ لطف میں قرار دے۔

خداوندا! تیرہ ملک کا دامن وسیع اور کشادہ ہے اور ہماری معلومات اور ہماری معرفت محدود ہے، ہمیں لغزشوں، خطاؤں اور غیر حق فیصلے کرنے سے مصئون و محفوظ رکھ۔

بارالہا! تیرے پیغمبر کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی دعوت کو انسانوں کے علاوہ جن و پری نے بھی قبول کیا ہے، ہمیں اس کی دعوت پر ایمان لانے والوں میں سے قرار دے۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ جن

روز جمعہ ۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

۱۳۶۵/۷/۴

اختتام ترجمہ

بروز جمعہ یکم صفر ۱۴۰۸ھ

مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء

بوقت تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح

۸۱ رای ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

---

[1] کتاب "دین وانش گاہ و آخرین پیغمبر" کی پہلی جلد میں اس سلسلہ میں تقریباً تیس روایات جمع کی گئی ہیں۔

سُورۂ مزمل

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی بیس ۲۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

۵/۷/۱۳۶۵

سورۂ مزمل کے مضامین و مطالب

سورہ کی آیات کا لب و لہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ "مکی" سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح اس کے "مدنیہ" میں نزول کا احتمال، جیسا کہ بعض نے کہا ہے، بعید نظر آتا ہے۔ لیکن آغاز و انجام کی آیات کے لب و لہجہ کا فرق یہ بتاتا ہے کہ ان آیات کے درمیان قابلِ ملاحظہ زمانہ کا فاصلہ تھا۔ جسے بعض مفسرین نے "آٹھ ماہ" بعض نے "ایک سال" اور بعض نے "دس سال" تک لکھا ہے[1]

اس سورہ کی بہت سی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر اپنی اعلانیہ دعوت کا آغاز کر چکے تھے اور مخالفین آپ کے مقابلہ میں مخالفت اور تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا پیغمبر کو یہ حکم ملتا ہے کہ اس مرحلہ میں نرمی اور مدارات سے کام لیں۔

اس لیے یہ احتمال کہ تمام سورۂ پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں نازل ہوا ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس کی ابتدائی آیات اس طرح کی ہوں، لیکن مسلم طور پر اس کی تمام آیات اس طرح کی نہیں ہیں، کیونکہ اس کی تعبیریں، اسلام کے پھیلنے اور کم از کم مکہ کی حد تک۔ مخالفین کی مخالفت اور مبارزہ کے لیے قیام کی نشاندہی کرتی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آغازِ دعوت کے تین سالوں میں، اسی قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

وہ شانِ نزول، جو اس سورہ یا اس کی آیات کے ایک حصہ کے لیے، روایات میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مختلف ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب پیغمبر پر سب سے پہلی وحی ہوئی اور پیغامِ الٰہی پہنچا، آپ وحشت زدہ ہو کر خدیجہ کے پاس آئے (چونکہ جسمانی ناراحتی محسوس کر رہے تھے لہٰذا کچھ آرام کرنا چاہا) اور فرمایا: "مجھے کوئی کپڑا اوڑھا دو" اس موقع پر جبرئیل نازل ہوئے اور "یا ایھا المزمل" کا پیغام پیغمبر کے لیے لائے[2]

جبکہ دوسری آیات میں یہ آیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ پیغمبر اپنی دعوت کو آشکار اور ظاہر کر چکے تھے۔ اور "قریش" "دار الندوہ" میں جمع ہوئے تاکہ وہ پیغمبر کے معاملہ میں غور و فکر کریں اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی نام اور شعار (نعرہ) کا انتخاب کریں، بعض نے کہا کہ وہ "کاہن" ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اس پیش نہاد کی مخالفت کی، بعض دوسروں نے کہا وہ "مجنون" ہے۔ لیکن پھر ایک گروہ نے مخالفت کی بعض نے "ساحر" کے عنوان کو ترجیح دی، تو اسے بھی انھوں نے قبول نہ کیا۔

آخر کار انھوں نے کہا، جو کچھ بھی ہے "وہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتا ہے (اس بنا پر ساحر ہے) اس کے بعد مشرکین اس جلسے

---

[1] تفسیر "درالمنثور" جلد ۶ ص ۲۷۶ و "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۷

[2] "روح المعانی" جلد ۲۸ ص ۱۰۱، اور نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۶

منتشر ہو گئے ۔

یہ بات پیغمبر تک پہنچی تو آپؐ نے اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹ لیا (اور آرام کرنے لگے) اس وقت جبرئیل آئے "یاایھا المزمل" اور "یاایھا المدثر" کو آپ کے پاس آکر پڑھا۔[1]

نتیجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، یہ سورہ ظاہراً مکہ میں نازل ہوئی ہے، اور یقینی طور پر اس کا ایک حصہ اسلام کے اعلانیہ اظہار، اور نسبتاً مکہ میں نفوذ کے بعد نازل ہوئی ہے، اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ سورہ کی کچھ ابتدائی آیات اوائل بعثت میں نازل ہوئی ہوں۔

بہرحال اس سورہ کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ :۔ سورہ کی ابتدائی آیات ہیں جو پیغمبرؐ کو عبادت اور تلاوت کے لیے رات کو قیام کی دعوت دیتی ہیں، اور ایک سنگین اور سخت پروگرام کو قبول کرنے کے لیے آمادگی پر آمادہ کرتی ہیں۔

دوسرا حصہ :۔ انھیں صبر و شکیبائی اور اس خاص علاقہ میں مخالفین کے ساتھ مقاومت و مقابلہ اور مدارات و نرمی کی دعوت دیتا ہے۔

تیسرے حصہ میں :۔ معاد و قیامت کے بارے میں مباحث ہیں، اور موسیٰ بن عمران کو فرعون کی طرف بھیجنے اور اس کی سرکشی اور پھر اس کے دردناک عذاب کو بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے حصہ میں :۔ ان سخت احکام کو، جو سورہ کی ابتداء میں، رات کے وقت قیام کے سلسلہ میں آئے تھے مسلمانوں کی مشکلات کی بناء پر ان میں تخفیف کرتا ہے۔

اور پانچویں حصہ میں :۔ یعنی اس سورہ کے آخری حصہ میں دوبارہ تلاوتِ قرآن، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور استغفار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے :

من قرأ سورة المزمل رفع عنه العسر في الدنيا والآخرة

"جو شخص سورۂ مزمل کو پڑھے گا تو دنیا و آخرت کی سختیاں اس سے اٹھ جائیں گی"۔[2]

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۶ ص ۲۷۶

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۵

اور ایک دوسری حدیث میں امام صادق ؑ سے آیا ہے:

من قرأ سورة المزمل فی العشاء الأخرة، او فی أخر اللیل کان له اللّیل والنهار شاهدین مع السورة واحیاه الله حیاة طیبة واماته میتة طیبة

"جو شخص سورۂ مزمل کو دوسری نمازِ عشاء (نمازِ عشاء ہی مراد ہے، کیونکہ بعض اوقات مغرب کو پہلی عشاء کہا جاتا ہے) یا آخر شب میں پڑھے، تو رات اور دن اور اسی طرح یہ سورہ قیامت کے دن اس کے گواہ ہوں گے اور خدا اسے پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ موت دے گا"۔[1]

یقیناً یہ عظیم فضائل اس صورت میں ہیں جبکہ سورت کے مضامین، رات کے قیام، قرآن کی تلاوت، صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور انفاق پر عمل کیا جائے گا نہ کہ وہ تلاوت جو عمل سے خالی ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۲۷۵

سورہ مزمل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۙ
۲۔ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ
۳۔ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِیۡلًا ۙ
۴۔ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡهِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ
۵۔ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے۔
۲۔ رات کو، تھوڑے سے حصّہ کے سوا، قیام کیا کر۔
۳۔ آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا کم کر دے۔
۴۔ یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے، اور قرآن کو دقت و تامل کے ساتھ پڑھا کر۔
۵۔ کیونکہ ہم عنقریب ایک سنگین و ثقیل بات کا تجھ پر القاء کریں گے۔

تفسیر

اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا

جیسا کہ اس سورۃ کے آغاز کے لب و لہجہ سے پتہ چلتا ہے، یہ پیغمبرؐ کو استقامت کے لیے اور ایک عظیم و سنگین ذمہ داری کو قبول کرنے

کے لیے آمادگی کی ایک آسمانی دعوت ہے کہ جسے پہلے سے خود کو تیار کیے بغیر انجام دینا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے: "اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے" (یا ایھا المزمل)[1]

"رات کو تھوڑے سے حصہ کے سوا قیام کیا کر" (قم اللیل الا قلیلاً)۔

"آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا سا کم کردے" (نصفہ او انقص منہ قلیلاً)۔

"یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کردے" (او زد علیہ)۔

"اور قرآن کو انتہائی غور و خوض سے اور انتہائی وضاحت و فصاحت کے ساتھ تلاوت کیا کر" (ورتل القرآن ترتیلاً)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب پیغمبرؐ ہیں لیکن "یا ایھا الرسول" اور "یا ایھا النبی" کے عنوان سے نہیں بلکہ "یا ایھا المزمل" کے عنوان سے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنے اوپر کپڑا لپیٹ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہنے کا دور نہیں ہے، بلکہ یہ کھڑے ہونے اور خود کو تیار کرنے اور عظیم رسالت کو انجام دینے کے لیے آمادگی کا دور ہے۔

اور اس کام کے لیے رات کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ:

اولاً دشمنوں کی آنکھ اور کان نیند کی حالت میں ہیں، اور

ثانیاً زندگی کے کاروبار بند ہیں، اور اس بناء پر انسان غور و فکر اور تربیتِ نفس کے لیے زیادہ سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے۔

اسی طرح اس پروگرام کے لیے متن اصلی کے عنوان سے "قرآن" کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ یہ اس سلسلہ کے تمام ضروری اسباق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ ایمان کی تقویت، استقامت، تقویٰ اور پرورشِ نفوس کا بہترین وسیلہ ہے۔

"ترتیل" کی تعبیر جو اصل میں موزوں "تنظیم" و "ترتیب" کے معنی میں ہے اور یہاں آیاتِ قرآنی کو تانی (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) ضروری نظم، حروف کی صحیح ادائیگی، الفاظ کو وضاحت کے ساتھ پڑھنا، آیات کے مفاہیم میں دقت و تامل اور ان کے نتائج میں غور و فکر کرنا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی اس طرح سے تلاوت انسان کو معنوی نشوونما، اخلاقی شہامت اور تقویٰ و پرہیزگاری سرعت کے ساتھ بخش سکتی ہے اور اگر بعض مفسرین نے اس کی نماز پڑھنے کے معنی میں تفسیر کی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا ایک اہم حصہ "تلاوتِ قرآن" ہی ہے۔

"قم اللیل" کے جملہ میں "قیام" کی تعبیر، سونے کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ صرف پاؤں پر

---

[1] "مزمل" اصل میں "متزمل" تھا۔ "تزمل" کے مادہ سے جس کا معنی اپنے اوپر کپڑا لپیٹنا ہے اور "زمیل" جو ہم ردیف کے معنی میں ہے (وہ شخص جو کسی کے پیچھے سواری پر ہو) اور اس کے بعد رفیق اور ساتھی کے معنی میں آیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ وہ ارتباط اور قریبی تعلق رکھتا ہے۔

کھڑا ہونے کے معنی میں ہے ۔

لیکن ان آیات میں " شبِ زندہ داری " کی مقدار کے بارے میں جو مختلف تعبیریں آئی ہیں ، وہ حقیقت میں " اختیار " کو بیان کرنے کے لیے ہیں ، اور وہ پیغمبر کو یہ اختیار دیتی ہیں کہ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بیدار رہیں اور قرآن کی تلاوت کریں ۔ پہلے مرحلہ میں " ساری رات " سوائے تھوڑی سی مقدار کے ذکر کرتا ہے ، اور اس کے بعد اس میں تخفیف کرکے آدھی رات تک پہنچاتا ہے ، اور اس کے بعد آدھے سے بھی کم ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے " دو تہائی " " آدھی " اور " ایک تہائی " رات کے درمیان تخییر مراد ہے ۔ اس آیت کے قرینہ سے جو اسی سورہ کے آخر میں آئے گی جس میں فرماتا ہے : (ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثى الليل و نصفه و ثلثه)

ضمنی طور پر سورہ کے آخر کی اسی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبرؐ اس رات کے قیام میں اکیلے نہیں تھے ، بلکہ مومنین کا ایک گروہ بھی اس خود سازی و تربیتی اور آمادگی کے پروگرام میں پیغمبر کے ساتھ تھا اور انھوں نے اس راہ میں آپ کو ایک اسوہ اور نمونہ کے طور پر قبول کیا ہوا تھا ۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ " قم الليل الا قليلا " کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بعض راتوں کے سوا تمام راتوں میں قیام کیا کر ، اور اس طرح سے استثناء رات کے حصوں میں نہیں ہے ، بلکہ راتوں کے افراد میں ہے ۔ لیکن یہ تفسیر " کے مفرد ہونے اور " نصف " (آدھی) اور اس سے کمتر کی تعبیر کے ساتھ درست نظر نہیں آتی ۔

اس کے بعد اس سخت اور اہم حکم کے " ہدف نہائی " اور " مقصد اصلی " کو اس طرح بیان کرتا ہے : " ہم عنقریب ایک سخت بات تجھ کو القاء کریں گے " (انا سنلقى عليك قولا ثقيلا) ۔

اگرچہ مفسرین " قول ثقیل " کے بارے میں الگ الگ بیان رکھتے ہیں ، جو مسئلہ کے ایک ہی پہلو کو پیش کرتے ہیں ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کا سنگین ہونا ، جس سے بلاشک و شبہ قرآن مجید مراد ہے ، مختلف پہلوؤں سے ہے ۔

آیات کے مفہوم اور مطالب کے لحاظ سے سنگین ۔

دلوں پر تحمل کے لحاظ سے سنگین ، یہاں تک کہ خود قرآن کہتا ہے : لو انزلنا هذا القرآن على جبل لرأيته خاشعا متصدعا من خشية الله : " اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کرتے ، تو تو اسے خاشع اور شگافتہ دیکھتا " (حشر ـــ ۲۱)

دھمکیوں اور وعیدوں ، ذمہ داریوں اور مسئولیتوں کے بیان کے لحاظ سے سنگین ۔

تبلیغ اور دعوت کی راہ کی مشکلات کے لحاظ سے سنگین ۔

ترازوئے عمل اور عرصۂ قیامت میں سنگین

اور آخر میں پروگرام پیش کرنے اور اس کے مکمل اجراء کے لحاظ سے سنگین ۔

ہاں ! اگرچہ قرآن کا پڑھنا سہل و آسان اور زیادہ دلنشیں ہے لیکن اس کے مفاد اور معانی کو عمل میں لانا اسی نسبت سے سنگین اور مشکل ہے

خصوصاً پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں، اور آپ کے مکہ میں قیام کرنے کے وقت، جب ماحول کو جہالت، بت پرستی اور خرافات کے تیرہ و تاریک بادلوں نے گھیر رکھا تھا، لیکن پیغمبر اکرمؐ اور ان کے تھوڑے سے ساتھی، قرآن مجید کی تربیت سے مدد لیتے ہوئے، اور نمازِ شب سے اعانت طلب کرتے ہوئے اور پروردگار کی پاک ذات کے تقرب سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے اور اس "قول ثقیل" کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔

چند نکات

۱۔ تلاوتِ قرآن اور دعا و عبادت کے لیے رات کو اٹھنا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر کی ذاتِ اقدس ہے۔ لیکن سورہ کا متن اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مومنین بھی اس پروگرام میں پیغمبر کی ذات کے ساتھ ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ کیا یہ قیام اور شب زندہ داری، پیغمبرؐ کی دعوت کے آغاز میں سب پر واجب تھی یا نہیں؟

بعض مفسرین کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ امر واجب تھا، بعد میں سورہ کی آخری آیت نے آکر اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اس میں تقریباً ایک سال کا فاصلہ تھا۔

یہاں تک کہ بعض کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ حکم پنجگانہ نمازوں کی تشریع سے پہلے تھا اور جب پنجگانہ نمازیں مشروع قرار دے دی گئیں تو اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

لیکن ——— جیسا کہ مرحوم "طبرسی" نے بھی "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے ——— اس سورہ کی آیات کے ظاہر میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو "نسخ" کے اوپر دلیل ہو اور بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ قیام و عبادت مستحب اور سنت مؤکدہ ہے اور اس میں ہرگز وجوب کا پہلو تھا ہی نہیں، سوائے پیغمبر اکرمؐ کی ذات کے لیے، کیونکہ قرآن کی بعض دوسری آیات کے مطابق نمازِ شب آپ پر واجب تھی اور اس میں کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ مسئلہ پیغمبرؐ کے لیے واجب اور مسلمانوں پر مستحب ہو، اور اس سے قطع نظر اوپر والی آیات میں جو کچھ آیا ہے وہ "نمازِ شب" میں منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ نمازِ شب تو آدھی رات یا دو تہائی رات یا ایک تہائی رات تک کو بھی شامل نہیں رکھتی، جو کچھ آیت میں بیان ہوا ہے وہ تو ترتیلِ قرآن کے لیے اٹھنا ہے۔

اس بناء پر یہ کام ابتداء میں مستحب مؤکد کی صورت میں تھا اور اس کے بعد اس میں تخفیف کر دی گئی اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہر کام کے آغاز میں، خصوصاً ایک عظیم انقلاب کی ابتداء میں، ہمیشہ زیادہ قوت و توانائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ پیغمبر اور مسلمانوں کو، اس قسم کا فوق العادہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ رات کا زیادہ حصہ بیدار رہیں اور اس جدید پروگرام اور اس کی انقلابی تعلیمات سے آشنا ہوں، اور اس سے آگاہی کے علاوہ خود کو اس پر عمل کرنے کے لیے روحانی طور پر تیار کریں۔

۲۔ ترتیل کا معنی

اوپر والی آیات میں جس چیز پر تکیہ کیا گیا ہے وہ قرآن کی قراءت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ "ترتیل" کا مسئلہ ہے۔

"ترتیل" کی تفسیر میں معصومینؑ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کے وسیع ابعاد و جہات میں سے کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے:

بینه بیانًا ولا تهذه هذّ الشعر ولا تنثره نثر الرمل، ولکن اقرع به القلوب القاسیة ولا یکونن هم احدکم آخر السورة

"ترتیل" یعنی اس کو واضح طور پر بیان کر، نہ تو اشعار کی طرح جلدی اور یکے بعد دیگرے پڑھ، اور نہ ہی ریت کے ذرّوں کی طرح اس کو بکھیر دے۔ لیکن اس طرح پڑھ کہ اس سے سخت اور سنگین دلوں کو نرم کر دے، اور انھیں بیدار کر دے، ہرگز تمھارا مقصد یہ نہ ہو کہ تم لازمی اور حتمی طور پر آخر سورہ تک پہنچو اور اسے ختم کر کے رہو (بلکہ اہم بات یہ ہے کہ تم آیات مطالب اور معانی کو سمجھو)[۱]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے "ترتیل" کی تفسیر میں یہ آیا ہے:

اذا مررت بآیة فیها ذکر الجنة فاسأل الله الجنة، واذا مررت بآیة فیها ذکر النار فتعوذ بالله من النار

"جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جنت کا ذکر ہو تو رُک کر خدا سے جنت کا سوال کرو (اور اپنی اس کے لیے اصلاح کرو) اور جب تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو خدا سے اس سے پناہ مانگو (اور خود کو اس سے دور رکھو)[۲]

ایک اور روایت میں اسی امامؑ سے آیا ہے کہ آپ نے "ترتیل" کی تفسیر میں فرمایا:

هو ان تتمکث فیه وتحسن به صوتك

"ترتیل" یہ ہے کہ تو آیات کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور انھیں اچھی آواز میں پڑھے۔"[۳]

ایک اور حدیث میں انھیں حضرت سے اس طرح نقل ہوا ہے:

ان القرآن لا یقرأ هذرمة، ولکن یرتل ترتیلا اذا مررت بآیة فیها

---

[۱] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۴۰۸، یہ حدیث اصول کافی جلد ۲۔ باب "ترتیل القرآن بالصوت الحسن" اور دوسری کتابوں میں بھی مختصر فرق کے ساتھ آئی ہے۔

[۲] وہی مدرک

[۳] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۴۰۸

ذکر النار و قفت عندها و تعوذت باللہ من النار

"قرآن کو جلدی جلدی، سرعت اور تیزی کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو وہاں رک جاؤ، اور خدا سے جہنم کی آگ سے پناہ مانگو"[1]

اور آخری بات یہ ہے کہ پیغمبر کے حالات میں نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ آیات کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے پڑھتے تھے اور اپنی آواز کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے[2]

یہ روایات، اور وہ دوسری روایات جو اسی مفہوم کی اصولِ کافی، نور الثقلین، درمنثور اور حدیث و تفسیر کی تمام کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آیاتِ قرآنی کو اس طرح نہیں پڑھنا چاہیے، جو مطالب و مضامین اور پیام سے خالی ہوں بلکہ ان تمام امور کی طرف توجہ رکھنی چاہیے، جو پڑھنے اور سننے والوں میں اس کی تاثیر کو گہرا کر دے، اور اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اللہ کا پیام ہے اور اس کا مقصد اس کے مطالب و مضامین کو تحقق بخشنا (اور عملی جامہ پہنانا ہے)

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان اس واقعیت سے بہت دُور ہو گئے ہیں، اور انھوں نے قرآن کے صرف الفاظ پر اکتفا کر لیا ہے، اور ان کا مقصد صرف سورت اور قرآن کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ یہ جانیں کہ یہ آیات کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں؟ اور کس پیام کی تبلیغ کر رہی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ بھی محترم ہیں، اور ان کو پڑھنا بھی فضیلت رکھتا ہے؟ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ الفاظ اور تلاوت ان کے مطالب و مضامین کو بیان کرنے کا مقدمہ اور تمہید ہے۔

۲۔ نمازِ شب کی فضیلت

یہ آیات دوبارہ شب زندہ داری، نمازِ شب، اور اس وقت ——— جبکہ غافل لوگ خوابِ غفلت میں پڑے سوئے ہوئے ہوتے ہیں ——— قرآن کی تلاوت کی اہمیت کو گوشزد کرتی ہیں، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ رات کو عبادت کرنا، خصوصاً سحر کے وقت، اور طلوعِ فجر کے نزدیک، روح کی صفائی، تہذیبِ نفوس اور انسان کی معنوی تربیت، پاکیزگیِ قلب، دل کی بیداری، ایمان و ارادہ کی تقویت اور انسان کے دل و جان میں تقویٰ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں حد سے زیادہ اثر رکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک ہی مرتبہ کی آزمائش سے، انسان اس کے آثار، واضح طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

اسی بنا پر آیاتِ قرآنی کے علاوہ روایاتِ اسلامی میں بھی اس مطلب پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔

منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان من روح اللہ تعالیٰ ثلاثۃ: التہجد باللیل و افطار الصائم

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۴۷

[2] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں

و لقاء الاخوان

" تین چیزیں خدا کی مخصوص عنایات میں سے ہیں، شبانہ عبادت (نمازِ تہجد) روزہ داروں کو افطار کرانا اور مسلمان اور مومن بھائیوں کی زیارت و ملاقات کرنا" [1]

ایک اور حدیث میں انھیں جناب سے آیا ہے کہ آپ نے آیہ "ان الحسنات یذھبن السیئات" (نیک کام بُرے کاموں کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں) کی تفسیر میں فرمایا:

صلاۃ اللیل تذھب بذنوب النھار

" نمازِ تہجد ان کے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے" [2]

سُورہ اسراء کی آیہ ۷۹ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اور ہم نے وہاں پر نمازِ تہجد کی اہمیت کے بارے میں بہت عمدہ روایات نقل کی ہیں [3]

---

[1]، [2] "بحار الانوار" جلد ۸۷ ص ۱۴۳

[3] "تفسیر نمونہ" جلد ۱۲ ص ۲۲۷

۶۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝

۷۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝

۸۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝

۹۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝

۱۰۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝

ترجمہ

۶۔ یقیناً شبانہ (عبادت) کا پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے۔

۷۔ اور دن میں تو تمھارے لیے مسلسل اور طولانی کوششیں جاری رہیں گی۔

۸۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیے جاؤ اور صرف اسی کے ساتھ دل کو لگائے رکھو۔

۹۔ وہی مشرق و مغرب کا پروردگار، جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ پس تم اسی کو اپنا نگہبان اور کارساز مانو

۱۰۔ اور جو کچھ وہ (دشمن) کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور شائستہ طور پر ان سے دوری اختیار کرو۔

تفسیر

رات کے وقت کی عبادت کا اثر

یہ آیات اسی طرح رات کی عبادت اور رات کی تاریکی میں قرآن کی تلاوت کے ذریعے، معنوی تعلیمات کے سلسلہ میں، بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اور حقیقت میں جو کچھ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے۔ یہ اس کی دلیل کے طور پر آئی ہیں "یہ عبادت اور رات کی تلاوت کا حکم اس بناء پر ہے کیونکہ (عبادت اور تعلیم کا) یہ پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے (اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا)۔[1]

---

[1] "ناشئة" اسم فاعل ہے لیکن یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ مصدر ہو "عافیة" کی طرح۔

"ناشئة" "نشئ" (بروزن نثر) کے مادہ سے "حادثہ" کے معنی میں ہے، اور یہ بات کہ یہاں اس سے کیا مراد ہے اس کے تین تفاسیر بیان ہوئی ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد رات کی گھڑیاں ہیں، جو یکے بعد دیگرے حادث ہوتی ہیں۔ یا خصوصیت کے ساتھ آخر شب اور سحر کی گھڑیاں ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ اس سے مراد نماز و عبادت اور تلاوت کے لیے قیام کا پروگرام ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

هی القیام فی آخر اللیل الی صلاة اللیل

اس سے مراد آخر شب میں نمازِ تہجد کے لیے قیام کرنا ہے [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے اس آیہ کی تفسیر میں آیا ہے:

قیامه عن فراشه لا یرید الا الله

اس سے مراد بستر سے کھڑا ہونا ہے جس کا مقصد خدا کے سوا اور کچھ نہ ہو [2]

تیسری یہ ہے کہ اس سے مراد "معنوی و روحانی حالات" اور "ملکوتی نشاط و جذبہ" ہے، جو انسان کے دل و جان میں رات کی ان مخصوص گھڑیوں میں پیدا ہوتا ہے جس کے اثرات روحِ انسانی میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں اور ان کا دوام زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

البتہ یہ تفسیر اور اس سے پہلے والی تفسیر ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں اور یہ مناسب ہے کہ یہ دونوں ہی آیت میں جمع ہوں۔

"وطئا" اصل میں قدم رکھنے اور اسی طرح موافقت کرنے کے معنی میں ہے۔

"اشد وطئا" کی تعبیر یا تو مشقت و زحمت کے معنی میں ہے جو شبانہ قیام اور عبادت میں ہوتی ہے یا پھر ثابت و راسخ تاثیرات کے معنی میں ہے جو ان عبادات کے سایے میں انسان کی روح اور جان میں پیدا ہوتی ہے (البتہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے)

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس زیادہ موافقت کے معنی میں ہے جو ان لمحات میں انسان کے دل آنکھ اور کان کے درمیان ہوتی ہے اور ان سب کے اجتماع سے عبادت کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

"اقوم" "قیام" کے مادہ سے محکم و مضبوط اور زیادہ صاف کے معنی میں ہے اور "قیل" بات کرنے کے معنی میں ہے، یہاں ذکر خدا اور تلاوتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو "شبانہ عبادت" اور سحر گاہی دعا ثنا، اور ایسے لمحات میں جبکہ ہر وقت کی نسبت، دلی فراغت کے اسباب زیادہ فراہم ہوتے ہیں ——— محبوب کے ساتھ راز و نیاز کی رساترین باتوں کو اپنی معنی خیز تعبیروں کے ساتھ بیان کرتی ہے اور اسی طرح سے انسان کی تہذیبِ نفس، اور روحِ جان کی پرورش میں اس کی تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۷۸

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۸ حدیث ۱۹

انسان کی روح، ان لمحات میں دعاء و مناجات اور ذکر و فکر کے لیے ایک خاص قسم کی آمادگی رکھتی ہے۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ دن میں تو تمہیں مسلسل اور بہت زیادہ سعی و کوشش اور جد و جہد کرنی پڑے گی (ان لك فی النهار سبحاً طویلاً)۔

تم ہمیشہ مخلوق کی ہدایت اور پروردگار کی رسالت کی تبلیغ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے مشکلات کو حل کرنے میں لگے رہتے ہو، اور عبادت اور مناجات کے لیے کافی وقت نہیں ملتا، لہذا اس کی بجائے رات کو عبادت کیا کرو۔

ایک اور احتمال بھی جو آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور کئی جہات سے زیادہ بہتر اور قبل و بعد کی آیات کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے، یہ ہے کہ چونکہ تم دن بھر میں سنگین وظائف، بھاری ذمہ داریوں اور بہت زیادہ جد و جہد کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہو، لہذا تمہیں رات کی عبادت کے ساتھ خود کو تقویت دینی چاہیے اور ان عظیم فعالیتوں کے لیے اس قیام شب کے ذریعہ ضرور تیار ہونا چاہیے۔

"سبح" (بروزن "مدح") اصل میں حرکت اور آمد و رفت کے معنی میں ہے اور بعض اوقات تیرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے

گویا وہ انسانی معاشرے کو ایک بے کراں سمندر سے تشبیہ دیتا ہے، جس میں ایک گروہ کثیر غرق ہونے کی حالت میں ہے، اسکی امواجِ خروشاں ہر طرف حرکت میں ہیں، سرگرداں کشتیاں اس میں پناہ گاہ تلاش کرتی پھرتی ہیں اور پیغمبر اسلامؐ اس سمندر میں غرق ہونے والوں کے لیے، اکیلے نجات دہندہ ہیں اور آپ کا قرآن اس سمندر میں اکیلی نجات کی کشتی ہے۔

اس عظیم تیراک کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی شبانہ عبادات کے ذریعہ اس روزانہ کی عظیم ماموریت اور رسالت کے لیے آمادہ کرے۔

رات کی عبادت کے قیام کے حکم، اور اس کے عمیق اور گہرے آثار کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد پانچ احکام کا، جو ان کی تکمیل کرتے ہیں، ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرو اور اس کا ذکر کرو" (واذکر اسم ربك)۔

مسلمہ طور پر اس سے مراد صرف خدا کے نام کا ذکر کرنا نہیں ہے بلکہ معنی کی طرف توجہ ہے، کیونکہ لفظی ذکر قلبی یاد کا ایک مقدمہ اور تمہید ہے اور قلبی ذکر روح و جان کو صفا بخشتا ہے اور دل میں معرفت و تقوی کے نہال کی آبیاری کرتا ہے۔

"رب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت تم اس کے مقدس نام کا ورد کرو تو اس کی بے پایاں نعمتوں اور اپنے لیے اس کی مسلسل تربیت کی طرف توجہ رکھو۔

ایک مفسر نے پروردگار کے ذکر کے کچھ مراحل بیان کیے ہیں۔

پہلا مرحلہ اس کے نام کے ذکر کا ہے، جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد والے مرحلہ میں اس کی پاک ذات کی دل میں یاد آوری کی نوبت آتی ہے، جو سورۂ اعراف کی آیہ ۲۰۵ میں بیان ہوئی ہے "واذکر ربك فی نفسك تضرعا و خیفة" "اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع اور خوف کے

ساتھ یاد کرو۔"

آخر کار تیسرا مرحلہ آن پہنچتا ہے، اس مرحلہ میں خدا کی ربوبیت کے مرحلے سے اوپر چلا جاتا ہے اور خدا کے صفاتِ جمال وجلال کے مجموعہ کے مقام تک ——— جو اللہ میں جمع ہے ——— پہنچ جاتا ہے، جیسا سورہ احزاب کی آیہ ۴۱ میں فرماتا ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا

"اے ایمان لانے والو! خدا کو کثرت سے یاد کیا کرو"

اور اس طرح سے یونہی یہ ذکر جاری وساری رہے گا اور مرحلہ بہ مرحلہ تکامل وارتقاء پیدا کرتا رہے گا اور ذکر کرنے والوں کو اوجِ کمال تک پہنچا دے گا۔[1]

دوسرے حکم میں فرماتا ہے: خدا ہی کے ساتھ اپنے دل کو لگاؤ اور اس کے غیر سے امید کو قطع کر لو اور خلوص کے ساتھ عبادت کے لیے کھڑے ہو جاؤ: (و تبتل الیہ تبتیلًا)۔[2]

"تبتل" "بتل" (بروزن حتم) کے مادہ سے اصل میں انقطاع کے معنی میں ہے اور اسی لیے مریم کو "بتول" کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے لیے کوئی شوہر انتخاب نہیں کیا اور اگر بانوئے اسلام فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کو بھی بتول کہا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے اعمال وکردار اور معرفت کے لحاظ سے جدا اور برتر تھیں اور انقطاع الی اللہ کی حالت تک پہنچی ہوئی تھیں۔

بہرحال "تبتل" یہ ہے کہ انسان اپنے پورے دل کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو اور اللہ کے سوا ہر کسی سے منقطع ہو جائے، اور اپنے اعمال صرف اسی کے لیے بجالائے اور اخلاص میں غرق ہو۔

اور اگر ایک روایت میں پیغمبر گرامی اسلام سے یہ نقل ہوا ہے کہ:

لا رھبانیۃ، ولا تبتل فی الاسلام

"اسلام میں نہ تو رہبانیت ہے اور نہ ہی تبتل"۔[3]

تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے ترکِ دنیا کرنا، جو عیسائی راہبوں میں رائج ہے، وہ اسلام میں موجود نہیں ہے وہ ترکِ دنیا کے لیے شادی بیاہ کو بھی ترک کرتے ہیں اور ہر قسم کی اجتماعی فعالیت کو بھی، لیکن اگر واقعی اور حقیقی مسلمان، قلبِ اجتماع میں زندگی بسر کرنے کے باوجود تمام تر خدا ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۱۷۷ (اقتباس)

[2] قاعدہ کے مطابق یہاں "مفعول مطلق" "تبتل" ہونا چاہیے جو باب "تفعل" کا مصدر ہے، لیکن اس کی جگہ یہاں پر باب تفعیل کا مصدر آیا ہے۔ یہ امر اس بات کے علاوہ کہ یہ آیات کے آخر میں ہم آہنگی کو محفوظ رکھتا ہے، ممکن ہے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو اور وہ یہ ہے کہ "انقطاع الی اللہ" نہ سارا کا سارا اکتسابی ہے اور نہ ہی تمام کا تمام موہوبی۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو پرہیزگار بندہ کی سعی وکوشش شرط ہے اور دوسری طرف سے پروردگار کا لطف۔

[3] "مفردات" و "مجمع البحرین" مادہ "تبتل"

بعض روایات میں، آئمہ معصومین سے نقل ہوا ہے کہ " تبتل " کا معنی حالت نماز میں ہاتھ کو بلند کرنا ہے[۱] لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ حقیقت میں اخلاص اور انقطاع الی اللہ کے ایک مظہر کا بیان ہے۔

بہرحال پروردگار کی وہ یاد اور یہ اخلاص، مخلوقِ خدا کی ہدایت کے سنگین و سخت پروگرام میں مردانِ خدا کا عظیم سرمایہ ہے۔

اس کے بعد تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: " وہی مشرق و مغرب کا پروردگار، جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے، اسی کو اپنا محافظ اور کارساز مانو " (رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلاً)۔

یہاں " ذکر اللہ " اور " اخلاص " کے مرحلہ کے بعد، توکل اور تمام کاموں کو خدا کے سپرد کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی جہانِ ہستی کا سارا مجموعہ، اسی کی حکومت و ربوبیت کے زیر تسلط ہے اور پرستش کے لائق وہی یکہ و تنہا معبود ہے، یہ تعبیر حقیقت میں، توکل برخدا کے موضوع پر، ایک دلیل کے طور پر آئی ہے، انسان اس پر توکل کیسے نہ کرے اور اپنے معاملات کو اس کے سپرد کیوں نہ کرے، حالانکہ اس وسیع عالم ہستی میں اس کے علاوہ کوئی اور حاکم، فرمانروا، منعم، مربی اور معبود نہیں ہے۔

آخر جو تھے اور پانچویں حکم میں فرماتا ہے: " دشمن جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر و شکیبائی اختیار کرو، اور ان سے شائستہ اور عمدہ طریقہ سے دوری اختیار کرلو " (واصبر علیٰ ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً)۔

اور اس طرح سے یہاں " صبر " اور " ہجران " کا مقام آپہنچتا ہے، کیونکہ حق کی طرف دعوت کی راہ میں، دشمنوں کی بدگوئی اور ان کا اذیت و آزار پہنچانا بہت زیادہ، اور اگر باغبان کوئی پھول توڑنا چاہتا ہے تو اسے کانٹے کی زبان کے مقابلہ میں صبر کرنا پڑے گا۔

اس کے علاوہ بعض اوقات یہاں بے اعتنائی اور دوری ضروری ہوجاتی ہے، تاکہ ایک تو ان کے شر سے محفوظ رہے، دوسرے اس طرح سے انھیں ایک سبق بھی دے، لیکن یہ ہجران و دوری، تربیتی پروگراموں اور خدا کی طرف تبلیغ و دعوت کے قطع کرنے کے معنی میں نہیں ہونی چاہیے۔

اس طرح سے اوپر والی آیات، پیغمبر اسلامؐ اور ان تمام لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں ایک جامع اور کامل نسخہ دیتی ہیں کہ وہ رات کی عبادات اور بوقت سحر پروردگار سے دعا و مناجات سے مدد حاصل کریں اور پھر اس پودے کی یادِ خدا، اخلاص، توکل، صبر اور ہجرانِ جمیل کے پانی سے آبیاری کریں۔ کیسا جامع اور عمدہ نسخہ ہے؟

" رب المشرق والمغرب " (مشرق و مغرب کے پروردگار) کی تعبیر تمام عالم ہستی پر اس کی حاکمیت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں: فلاں شخص نے زمین کے مشرق و مغرب پر اپنا تسلط جمالیا ہے، یعنی تمام روئے زمین کو، نہ کہ صرف مشرق و مغرب کے نقطہ کو۔

" ھجر جمیل " (شائستہ دوری و جدائی)، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ دلسوزی اور حق کی طرف دعوت و تبلیغ سے تو ام ہجران و دوری کے معنی میں ہے، جو خاص خاص علاقوں میں ایک تربیتی روش شمار ہوتی ہے اور دوسرے علاقوں میں " جہاد " کے مسئلہ کے

---

[۱] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۵ حدیث ۲۰

ساتھ بالکل منافات نہیں رکھتی، کیونکہ ہر ایک کی ایک جگہ ہے اور ہر نقطہ کا ایک مقام ہے، دوسرے لفظوں میں یہ دوری بے اعتنائی نہیں ہے، بلکہ خود ایک قسم کی اعتناء اور پرواہ کرتا ہے، بہرحال یہ جو بعض نے اوپر والی آیت کو آیات جہاد سے منسوخ سمجھا ہے، صحیح نہیں ہے۔

مرحوم "طبرسی" "مجمع البیان" میں اس آیہ کے ذیل میں کہتے ہیں:

وفی ھٰذا دلالۃ علی وجوب الصبر علی الاذی، لمن یدعو الی الدین و والمعاشرۃ باحسن الاخلاق واستعمال الرفق لیکونوا اقرب الی الاجابۃ

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مبلغین اور قرآن کی طرف دعوت دینے والے تکالیف اور اذیتوں میں صبر اختیار کریں، اور حسن خلق و مدارات کے ساتھ لوگوں میں معاشرت کریں، تاکہ ان کی باتیں جلدی قبول ہوں"[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۷۹

۱۱۔ وَذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا ○
۱۲۔ اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا ۙ
۱۳۔ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًا ۙ
۱۴۔ یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِیْبًا مَّهِیْلًا ○
۱۵۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○
۱۶۔ فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ○
۱۷۔ فَكَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا ۝۱۷
۱۸۔ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ○
۱۹۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ۝ع ○

ترجمہ

۱۱۔ مجھے ان جھٹلانے والے صاحبانِ نعمت (سے بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دو اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔
۱۲۔ کیونکہ ہمارے پاس غل وزنجیر اور (جہنم کی آگ) ہے۔
۱۳۔ اور گلوگیر غذا اور دردناک عذاب ہے۔

۱۴۔ اس دن زمین اور پہاڑ شدّت سے لرز رہے ہوں گے اور پہاڑ (اس طرح ریزہ ریزہ ہوں گے کہ) ریت کے تودوں کی شکل میں نرم ہوجائیں گے

۱۵۔ ہم نے تمھاری طرف ایسا ہی ایک پیغمبر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔

۱۶۔ فرعون اس رسول کی مخالفت اور نافرمانی کے لیے کھڑا ہوگیا تو ہم نے اسے سخت سزا دی۔

۱۷۔ تو اگر تم بھی کافر ہوگئے، تو تم (خدا کے شدید عذاب سے) اس دن جو بچوں کو بوڑھا کردے گا، کس طرح خود کو بچاؤ گے۔

۱۸۔ اس دن آسمان پھٹ پڑے گا اور اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

۱۹۔ یہ تو ایک تنبیہ اور نصیحت ہے پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے۔

تفسیر

ان مستکبرین کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے

گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں دشمنانِ اسلام کی کارشکنیوں، ناروا باتوں اور اذیت و آزار کی طرف اشارہ تھا۔ زیر بحث آیات میں انھیں خدا کی طرف سے، دنیا و آخرت کے عذابوں کی شدید تہدیدیں اور دھمکیاں دی گئی ہیں اور انھیں اپنے شوم و منحوس پروگراموں میں تجدید نظر کی دعوت دی ہے اور صدر اوّل کے مسلمانوں کی ان دشمنوں کے سخت ہجوم کے مقابلہ میں دلداری کی ہے اور انھیں پامردی بخشی ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "مجھے ان تکذیب کرنے والے، ثروت مند اور صاحبانِ نعمت افراد کے ساتھ (بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دے اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے دے"۔ (وذرنی والمکذبین اولی النعمة ومهلهم قلیلاً)۔

یعنی ان کا مدمقابل تو نہیں ہے، میں ہوں! ان کی سزا و عذاب کا معاملہ خود مجھ پر چھوڑ دے، اور تھوڑی سی انھیں مہلت دے دے، تاہم اتمامِ حجت بھی ہوجائے اور وہ اپنی ماہیت کو ظاہر و آشکار بھی کردیں، اور اپنی پشت کو بارِ گناہ سے سنگین اور بوجھل کریں۔ تو اس وقت میرا عذاب ان کا گلا دبالے گا۔

اور ہم جانتے ہیں کہ تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ مسلمان طاقت ور ہوگئے اور انھوں نے جنگ "بدر" و "حنین" و "احزاب" وغیرہ میں اپنی سخت اور توڑنے والی ضربیں دشمن کے پیکر پر لگائیں، نیز زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یہ سرکشی کرنے والے دنیا سے چلتے بنے اور برزخ میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے اور قیامت کا عذاب بھی ان سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

ضمنی طور پر "اولی النعمة" (صاحبانِ نعمت) کی تعبیر مال و دولت اور مادی امکانات و وسائل کی زیادتی سے پیدا ہونے والے غرور و غفلت کی طرف اشارہ ہے، جو ایسے لوگوں کو اکثر دامن گیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی طول تاریخ میں ——— جیسا کہ قرآن شاہد و گواہ

ہے ——— یہ گروہ ہمیشہ مخالفین کی صفِ اوّل میں رہا ہے ۔

حقیقت میں یہ آیت سورۂ سبا کی آیت ۳۴ کے مشابہ ہے، جو کہتی ہے: وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون: "ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی انذار کرنے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ ان کے مترفین (جو ناز و نعمت میں مست تھے) نے کہا: تم جس چیز کے ساتھ بھیجے گئے ہو ہم اس سے کافر ہیں، انکار کرتے ہیں"۔

حالانکہ اس قسم کے افراد کو دوسروں سے پہلے منادیانِ حق کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے، تاکہ اس طریقے سے ان سب خدائی نعمتوں کا شکر بجا لائیں ۔

اس کے بعد اسی تہدید کو جاری رکھتے ہوئے اور زیادہ صریح صورت میں کہتا ہے: "ہمارے پاس نمل و زنجیر اور جہنم کی آگ ہے" (ان لدینا انکالا و جحیما)۔

"انکال" "نکل" (بروزنِ فکر) کی جمع ہے اور بوجھل زنجیروں کے معنی میں ہے اور اصل میں "نکول" کے مادہ سے، ضعف و ناتوانی کے معنی میں لیا گیا ہے اور چونکہ وہ زنجیر جو ہاتھ پاؤں اور گردن میں ڈالتے ہیں، انسان کو حرکت کرنے سے روک دیتی ہے، اور ناتواں بنا دیتی ہے، اس لیے یہ لفظ "زنجیر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ہاں! بے قید و شرط آزادی اور اس ناز و نعمت کے مقابلہ میں جو وہ اس دنیا میں رکھتے تھے، وہاں ان کا حصہ قید اور آگ ہی ہوگی ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور گلوگیر ہونے والی غذا اور دردناک عذاب": (و طعاما ذا غصۃ و عذابا الیما)۔

وہ غذا، ان کی دنیا کی چرب و شیریں غذاؤں سے ——— جو آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے اتر جاتی تھیں اور مزے دار ہوتی تھیں ——— برعکس ہوگی اور اس جہان کے خود غرض، مغروروں اور متکبروں کی بے حساب آسائش کے مقابلہ میں دردناک زندگی ہوگی ۔

اگرچہ سخت اور گلوگیر غذا خود ایک دردناک عذاب ہے لیکن اس کے بعد عذابِ الیم کو الگ ذکر کرتا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آخرت کے عذابِ الیم کے ابعاد و جہات اور مختلف پہلو، شدت و عظمت کے لحاظ سے خدا کے علاوہ کسی اور شخص کو معلوم نہیں ہیں اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن ایک مسلمان اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا، اور پیغمبر کان دھر کر سن رہے تھے کہ اچانک اس شخص نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔[1]

ایک اور حدیث میں یہ آیا ہے کہ خود پیغمبر اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کی ایسی حالت ہوئی۔[2]

یہ غذا گلوگیر کیوں نہ ہوگی؟ جبکہ سورۂ غاشیہ کی آیہ ۶ میں یہ آیا ہے: لیس لھم طعام الا من ضریع:

---

[1] "مجمع البیان"، جلد ۱۰، ص ۳۸۰

[2] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۰۷

" ان کی غذا جانگداز کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہو گی "۔

اور سورۂ دخان کی آیہ ۴۳، ۴۴ میں یہ آیا ہے: ان شجرت الزقوم طعام الاثیم: " زقوم کا درخت (دبی تلخ، بدبودار بدذائقہ، کڑوا اور مار ڈالنے والا پودا) گنہ گاروں کی غذا ہے۔

اس کے بعد اس دن کی تشریح کرتے ہوئے جس میں یہ عذاب ظاہر ہوں گے، فرماتا ہے: "یہ اس دن ہو گا جس دن زمین اور سب پہاڑ شدت کے ساتھ لرزنے لگیں گے اور پہاڑ اس طرح سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے ریت کے تودوں کی طرح نرم ہو جائیں گے"۔ (یوم ترجف الارض والجبال وکانت الجبال کثیبًا مهیلًا)۔

"کثیب" تہ بہ تہ پڑی ہوئی ریت (ٹیلہ) کے معنی میں ہے اور "مهیل" هیل (بروزن کیل) کے مادہ سے، ریت اور آٹے جیسی کسی نرم چیز کو دوسری چیز پر ڈالنا، یہاں وہ نرم ریت مراد ہے جسے کبھی قرار نہیں ہوتا۔

اس معنی کی بناء پر قیامت میں اس طرح سے بکھر جائیں گے کہ ایسی نرم ریت کی صورت اختیار کر لیں گے کہ اگر اس پر پاؤں رکھیں گے تو وہ اس میں دھنس جائیں گے۔

قیامت کے دن کے لیے قرآن نے پہاڑوں کی قسمت کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جو سب کی سب ان کی نابودی اور ان کے نرم خاک میں تبدیل ہو جانے کی حکایت کرتی ہیں (پہاڑوں کی نابودی کے مختلف مراحل کی مزید تشریح اور اس سلسلے میں قرآن کی مختلف تعبیریں سورہ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں آئی ہیں)۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کی بعثت اور منہ زور عربوں کی مخالفت کا موسیٰ بن عمران کے فرعون کے مقابلہ میں قیام سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے تمھاری طرف ایسا ہی پیغمبر بھیجا ہے، جو تم پر گواہ ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا" (انا ارسلنا الیکم رسولًا شاهدًا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولًا)۔

اس کا ہدف و مقصد تمھاری ہدایت اور تمھارے اعمال پر نظر رکھنا ہے، جیسا کہ موسیٰ بن عمران کا ہدف فرعون اور فرعونیوں کی ہدایت اور ان کے اعمال پر نظر رکھنا تھا۔

" لیکن فرعون اس رسول کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو گیا تو ہم نے بھی اسے شدید عذاب اور سزا میں گرفتار کر دیا" (فعصی فرعون الرسول فاخذناه اخذًا وبیلًا)۔

نہ تو اس کا عظیم لشکر ہی اسے خدا کے عذاب سے بچا سکا اور نہ ہی مملکت کی وسعت اور حکومت کی قدرت اور ان کے دولت مند اس کام کو روک سکے، اور آخر کار وہ سب کے سب نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں ——— جن پر وہ فخر کیا کرتے تھے ——— غرق ہو گئے، تو تم جو ان سے بہت ہی پست سطح پر ہو اور تعداد اور تیاری کے لحاظ سے فرعون اور فرعونیوں سے کئی درجے زیادہ ضعیف ہو اپنے بارے میں

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۲ ص ۲۰۲

کیا سوچتے ہو؟ اور اس مختصر سے مال اور افراد پر کس طرح سے مغرور ہوتے ہو؟

"وبیل" "وبل" کے مادہ سے اصل میں شدید اور سنگین بارش کے معنی میں ہے اور اس کے بعد ہر شدید و سنگین چیز پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔ خصوصاً عذاب کے بارے میں اور زیر بحث آیت میں بھی شدتِ عذاب کی طرف ہی اشارہ ہے، گویا لوگوں کو شدید بارش کی طرح اپنے طوفان اور بارش میں قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ کے کفار کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے، انھیں اس طرح خبردار کرتا ہے: "اگر تم کافر ہو گئے تو اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب سے کس طرح بچا سکو گے، وہ دن تو ایسا ہو گا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا" (فکیف تتقون ان کفرتم یوماً یجعل الولدان شیبا)۔[۱]

ہاں! اس دن کا عذاب اتنا زیادہ سنگین، شدید، ہولناک اور کمر شکن ہے، جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اور یہ اس کی شدت سے کنایہ ہے۔

آخرت کا عذاب تو آسمان ہے، بعض نقل کرتے ہیں کہ اسی دنیا میں بعض اوقات جب انسان حد سے زیادہ شدید سختی اور تنگی سے گزرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلدی اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔

بہرحال اوپر والی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بالفرض اگر تم اس جہان میں فرعونیوں کی طرح نابود کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ بھی ہوئے، تب بھی قیامت اور قیامت کے عذاب کا ذکر کیا کرو گے۔

بعض والی آیت میں اس وحشت ناک دن کے بارے میں مزید حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس دن آسمانی کرّے پھٹ جائیں گے اور خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا" (السماء منفطر بہ کان وعدہ مفعولاً)۔

قیامت اور "اشراط الساعۃ" کی بہت سی آیات (وہ واقعات جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز میں، صورت پذیر ہوں گے) عظیم انفجارات، شدید زلزلوں اور سریع تبدیلیوں کا حال بیان کرتی ہیں جبکہ زیر بحث آیت انھی کے صرف ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب آسمان اور آسمانی کرّے، اس عظمت کے باوجود اس دن کے عظیم حوادث کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے تو اس ضعیف و ناتواں انسان سے کیا ہو سکتا ہے۔[۲]

---

[۱] "یوماً" "تتقون" کا مفعول ہے، اور اس دن سے بچنے کا معنی، اس دن کے عذاب سے بچنا ہے، بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ "تتقون" کا ظرف یا "کفرتم" کا مفعول ہے، لیکن یہ دونوں بعید نظر آتے ہیں۔

[۲] "شیب" (بروزن سیب) "اشیب" کی جمع ہے جو بوڑھے کے معنی میں ہے اور اصل میں شیب (بروزن عیب) کے مادہ سے لیا گیا ہے اور شیب بالوں کے سفید ہونے کے معنی میں ہے۔

[۳] "منفطر" "انفطار" کے مادہ سے انشقاق اور پھٹ جانے کے معنی میں ہے اور "بہ" کی ضمیر یوم کی طرف لوٹتی ہے، یعنی آسمان اس دن کی وجہ سے پھٹ جائے گا۔ (توجہ رہے کہ سماء مذکر کی صورت میں بھی اور مؤنث مجازی کی صورت میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اس بحث کے آخر میں تمام گزشتہ تنبیہوں اور انذاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ نصیحت اور یاد دلانے کے لیے ہے" (انّ ھٰذہ تذکرۃ)۔

تم راستہ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہو: "اور جو شخص چاہے کہ اس کی ہدایت ہو اور وہ سعادتِ ابدی کا طالب ہو تو وہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ انتخاب کر لیتا ہے" (فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلاً)۔

اگر اس راستہ کو طے کرنا جبر و اکراہ کے ذریعہ ہو تو وہ نہ کوئی افتخار کی بات ہے اور نہ ہی فضیلت کی، فضیلت کی بات تو یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اس راستہ کا انتخاب کرے اور پھر اسے طے کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے راہ اور چاہ کی نشاندہی کر دی ہے اور دیکھنے والی آنکھ اور روشنی بخشنے والا سورج اختیار میں دے دیا ہے اور لوگوں کو یہ صلاحیت بخش دی ہے کہ وہ اس کے فرمان کی اطاعت میں ارادہ و اختیار کے ساتھ عمل کریں۔

اس بارے میں کہ "انّ ھٰذہ تذکرۃ" (یہ نصیحت اور یاد آوری ہے) کا جملہ کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟ مفسّرین نے کئی احتمال دیئے ہیں: کبھی تو انھوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ان مواعظ کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں اور کبھی یہ کہا گیا کہ یہ پوری سورت کی طرف اشارہ ہے یا تمام قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے یہ حکم نماز اور رات کی عبادت کی طرف اشارہ ہو جو اس سورہ کی پہلی آیات میں آئے ہیں، اور اس میں مخاطب پیغمبر تھے، یہ جملہ چاہتا ہے کہ اسے باقی مسلمانوں کے لیے وسعت دے کر عام کر دے، اس بناء پر بعد والے جملے میں بھی "سبیل" (راستہ) سے مراد نماز تہجد ہی ہے، جو پروردگار کی طرف اہم راستوں میں سے ہے، جیسا کہ سورۂ دہر کی آیہ ۲۶ میں رات کی عبادت کا حکم دینے کے بعد (ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلاً طویلاً) مختصر سے فاصلہ کے بعد فرماتا ہے (انّ ھٰذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلاً) جو بالکل وہی زیر بحث آیت ہے[1]

یقیناً یہ ایک مناسب تفسیر ہے لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور اس سورہ میں جتنے انسان ساز پروگرام میں تمام کو احاطہ کیے ہوئے ہو، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ایک نکتہ

عذابِ الٰہی کے چار مرحلے

اوپر والی آیات میں مغرور اور نعمت میں مست تکذیب کرنے والوں کو چار دردناک عذابوں کی تہدید کرتا ہے:

طوق اور زنجیریں: (انکال)

جہنم کی جلانے والی آگ (جحیم)

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۴۷

سخت گلوگیر ہونے والی مرگبار غذائیں: (وطعامًا ذا غصة)

اور دوسرے انواع واقسام کے دردناک عذاب جو انسانی فکر میں بھی نہیں آسکتے: (وعذابًا الیمًا)

یہ سزائیں حقیقت میں اس دنیاوی زندگی میں ان کی وضع وکیفیت کا نقطہ مقابل ہیں۔

ایک طرف ایسی آزادی کا ملنا جس کی کوئی حد اور سرحد نہ ہو

دوسری طرف سے مرفہ اور خوشحال زندگی

تیسری طرف خوشگوار غذائیں اور کھانے

چوتھی طرف سے انواع واقسام کے آرام اور آسائشیں

اور چونکہ ان تمام چیزوں کو دوسروں کے حقوق پر ظلم وتجاوز اور کبر وغرور اور خدا سے غفلت کی قیمت پر حاصل کیا ہے، لہذا وہ قیامت میں اس قسم کی سرنوشت میں گرفتار ہوں گے۔

۲۰۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع

ترجمہ

۲۰۔ تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہے، رات کی دو تہائی کے قریب یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتے ہیں اور خدا رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم اس کی مقدار کی (دقت کے ساتھ) اندازہ نہیں کر سکتے، اس لیے اس نے تمھیں بخش دیا، اب تم قرآن کی صرف اتنی ہی مقدار جو تمھارے لیے میسر ہو، تلاوت کرو، وہ جانتا ہے کہ عنقریب تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہو جائے گا اور ایک گروہ فضل خدا حاصل کرنے (اور روزی کمانے کے لیے) سفر پر جائے گا اور ایک گروہ راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ پس جتنی مقدار تمھارے لیے ممکن ہو، اس کی تلاوت کرو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو، اور خدا کو قرضِ حسنہ دو (اس کی راہ میں خرچ کرو) اور (یہ جان لو) کہ جو کارِ خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے اور خدا سے طلبِ مغفرت کرو کہ خدا غفور و رحیم ہے

تفسیر

جتنا تمھارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو

یہ آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے بہت سے ایسے مسائل پر مشتمل ہے جو گزشتہ آیات کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ آیت اس سورہ کی ابتدائی آیات کے احکام کی ناسخ ہے، یا یہ ان کی توضیح و تفسیر ہے، اور اسی طرح یہ کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے یا مدینہ میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔

ان سوالات کا جواب آیت کی تفسیر کے بعد واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں، تقریباً رات کی دو تہائی یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتا ہے۔ خدا اس سے آگاہ کیوں نہ ہوگا، جبکہ رات اور دن کا اندازہ وہی کرتا ہے۔ (ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثى الليل ونصفه وثلثه وطائفة من الذين معك والله يقدر الليل والنهار)[1]

یہ اسی حکم کی طرف اشارہ ہے، جو سورہ کے آغاز میں پیغمبر کو دیا گیا ہے صرف ایک چیز جس کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس عبادت شبانہ میں مومنین کا ایک گروہ بھی پیغمبر کے ہمراہ ہوتا تھا (ایک استحبابی حکم کے عنوان سے یا احتمالاً ایک وجوبی حکم کی بناء پر، کیونکہ آغازِ اسلام کے حالات کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ تلاوتِ قرآن کے ذریعہ، جو انواع و اقسام کے اعتقادی، عملی اور اخلاقی درسوں پر مشتمل ہے، اور اسی طرح عباداتِ شبانہ کے ذریعہ اپنی تربیت اور اصلاح کریں، اور اسلام کی تبلیغ اور اس کے دفاع کے لیے خود کو آمادہ اور تیار کریں)

لیکن جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، بہت سے مسلمان ایک تہائی، آدھی رات اور دو تہائی رات کا حساب رکھنے میں مشکل اور دردِ سری میں گرفتار ہو جاتے ہیں (کیونکہ اس زمانے میں وقت کی مقدار اور اندازہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا) اور اسی بناء پر وہ مجبوراً احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس وجہ سے کبھی تو وہ ساری رات بیدار رہتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاؤں عبادتِ شبانہ کے قیام میں ورم کر جاتے ہیں۔

لہٰذا خدا نے ان پر اس حکم میں تخفیف کر دی اور فرمایا: وہ جانتا ہے کہ تم مذکورہ مقدار کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے، اس بناء پر اس نے تمھیں بخش دیا ہے۔ لہٰذا اب قرآن میں سے جتنی مقدار تمھارے لیے میسر اور آسان ہو اتنی تلاوت کرو" (علم ان لن تحصوه فتاب عليكم فاقرءوا ما تيسر من القرآن)۔

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "نصفه" اور "ثلثه" کا عطف "ادنیٰ" پر ہے نہ کہ "ثلثی اللیل" پر اس بناء پر اس جملہ کا مفہوم یہ ہے تقریباً رات کی دو تہائی یا ٹھیک آدھی رات کی مقدار یا ایک تہائی رات۔ ضمنی طور پر توجہ کرنی چاہیے کہ لفظ "ادنیٰ" عام طور پر نزدیک مکان کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں قریبی زمانہ کی طرف اشارہ ہے۔

"لن تحصوہ" "احصاء" کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، یعنی تم پورے طور پر دقت کے ساتھ رات کا وقت دو تہائی، آدھی رات اور ایک تہائی کی مقدار کے لحاظ سے تعین نہیں کر سکتے اور زحمت میں پڑ جاتے ہو۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس کام پر سال کے سارے دنوں میں مداومت نہیں کر سکتے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں بھی جب کہ کئی وسائل کے ذریعہ موقع پر نیند سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ سارے سال میں ان مقداروں کی دقت کے ساتھ تعین ـــــ خصوصاً رات اور دن میں مسلسل فرق پڑتے رہنے کے ساتھ ـــــ کوئی آسان کام نہیں ہے

"تاب علیکم" کے جملہ کو اکثر مفسرین نے "اس تکلیف اور ذمہ داری کی تخفیف" کے معنی میں بیان کیا ہے، نہ کہ "گناہ سے توبہ" کے معنی میں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جب وجوب کا حکم اٹھ جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور نتیجہ میں خدا کی بخشش کے مانند ہوگا۔

اس بارے میں کہ "فاقرءوا ما تیسر من القرآن" جو کچھ قرآن میں سے تمھارے لیے میسر پڑھو" کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے اس کی نماز تہجد سے تفسیر کی ہے، کیونکہ اس میں حتمی طور پر قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہی تلاوتِ قرآن ہے، چاہے وہ نماز کے اندر نہ ہو، اس کے بعد بعض نے اس کی مقدار پچاس آیات، بعض نے سو آیات اور بعض نے دو سو آیات کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی تعداد کے لیے کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جتنی مقدار سے انسان زحمت و تکلیف میں نہ پڑے اتنا قرآن پڑھے۔

یہ بات واضح ہے کہ "تلاوتِ قرآن" سے مراد یہاں وہ تلاوت ہے، جو درس و خودسازی اور ایمان و تقویٰ کی پرورش میں تعلیم کے عنوان سے ہو۔

اس کے بعد اس تخفیف کے لیے ایک اور دلیل کے بیان کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا جانتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہوں گے اور دوسرا گروہ تحصیل معاش اور خدا کے فضل کی تلاش میں سفر کی راہ اختیار کرے گا اور تیسرا گروہ راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ یہ امور اس چیز سے مانع ہوں گے کہ رات کی عبادت کو اس حساب اور نصاب سے جو پہلے معین ہوا ہے، ہمیشہ کے لیے انجام دیتے رہیں" (علم ان سیکون منکم مرضٰی واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ واٰخرون یقاتلون فی سبیل اللہ)۔

اور یہی چیز اس پروگرام میں تخفیف کا ایک سبب ہے لہٰذا دوبارہ تکرار کرتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو جس قدر تمھارے لیے ممکن ہے اور جتنی تم میں طاقت ہے بس اتنا رات کو قرآن کی تلاوت کرو" (فاقرءوا ما تیسر منہ)۔

یہ بات واضح ہے کہ بیماری اور ضروری سفروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کا ذکر، نمایاں مذابوں کی تین مثالوں میں سے ہے۔ لیکن انھیں تک منحصر نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ خدا جانتا ہے کہ تم دن میں زندگی کے مختلف مشکلات میں گرفتار ہوگے اور یہ چیز اس سنگین پروگرام کو دائمی رکھنے میں مانع ہے۔ لہٰذا اس نے تمھارے لیے اس میں تخفیف کر دی ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ حکم، اس چیز کو، جو سورہ کے آغاز میں آئی ہے، منسوخ کرتا ہے؟ یا اس کے لیے استثنائی صورت میں ہے؟ آیات کا ظاہر حکم سابق کے نسخ کو بتاتا ہے۔ حقیقت میں یہ بات ضروری تھی کہ یہ پروگرام ایک مدت تک جاری رہے، اور وہ

جاری رہا، اور اس حکم کا مقصد، جو ایک موقت اور فوق العادۃ پہلو رکھتا تھا وہ حاصل ہوگیا اور اس مدت کے ختم ہونے کے بعد تخفیف کی صورت میں باقی رہ گیا، کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ معذور افراد کے موجود ہونے کی وجہ سے، اس حکم کی سب کے لیے تخفیف ہوگئی، نہ کہ صرف معذور لوگوں کے لیے، اس طرح سے یہ استثناء نہیں ہوسکتی، بلکہ اسے نسخ ہونا چاہیے (غور کیجیے)

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ: کیا قرآن میں سے ممکن مقدار کی تلاوت، جس کا اس آیت میں دو مرتبہ امر ہوا ہے، واجب ہے، یا مستحب ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ یقینی طور پر مستحب ہے اور بعض نے وجوب کا احتمال دیا ہے، کیونکہ قرآن کی تلاوت، توحید کے دلائل، ارسال رسل اور اس آسمانی کتاب کے اعجاز سے آگاہی اور باقی واجباتِ دین کی تعلیم حاصل کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس بناء پر تلاوتِ قرآن مقدمہ واجب ہے لہٰذا یہ واجب ہوگیا۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ اس صورت میں ضروری نہیں ہے کہ قرآن کو رات کو ہی پڑھے، یا نماز تہجد کے درمیان پڑھے۔ بلکہ ہر مکلف (بالغ و عاقل) پر واجب ہے کہ بمقدار لازم، تعلیم و تربیت اور اصول و فروعِ اسلام سے آگاہی کے لیے، اور اسی طرح قرآن کو محفوظ رکھنے اور اسے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے، تلاوت کرے، بغیر اس کے کہ کوئی خاص وقت اور زمانہ اس میں پیشِ نظر ہو۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ "فاقرءوا ....." کے جملہ میں ظاہر امر وجوب ہے (جیسا کہ اصولِ فقہ میں بیان ہوا ہے)، مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ "امر" عدم وجوب پر فقہاء کے اجماع کی بناء پر ایک امر استحبابی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آغازِ اسلام میں تو حالات و شرائط کی بناء پر یہ تلاوت اور شبانہ عبادت واجب تھی اور بعد میں مقدار کے لحاظ سے بھی اور حکم کے لحاظ سے بھی اس میں تخفیف کردی گئی ہے اور اس نے ایک استحبابی حکم کی صورت اختیار کرلی ہے اور وہ بھی اتنا جتنا کہ آسانی سے ہوسکے، لیکن بہرحال پیغمبر اسلام پر نماز تہجد کا وجوب آخر عمر تک ثابت رہا۔ (تمام آیات قرآن اور روایات کے قرینہ سے)۔

ایک روایت میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

"دو تہائی رات یا آدھی رات یا ایک تہائی رات سے مربوط حکم منسوخ ہوگیا ہے، اور اس کی جگہ "فاقرءوا ما تیسر من القرآن" قرار پایا ہے"[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں تین قسم کے عذر بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک تو جسمانی پہلو رکھتا ہے (بیماری) اور دوسرا مالی پہلو رکھتا ہے (معاش کے لیے مسافرت) اور تیسرا دینی جنبہ رکھتا ہے (راہِ خدا میں جہاد) لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی تلاش اور اس کے لیے کوشش کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کے ہم ردیف ہے۔

اور اس جملہ کو اس بات کی بھی ایک دلیل سمجھا ہے کہ خاص یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ مکہ میں جہاد کا وجوب نہیں تھا، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ فرماتا ہے: سیکون: (عنقریب ہوگا)، ممکن ہے یہ جملہ آئندہ زمانہ میں تشریع جہاد کی خبر ہو یعنی چونکہ کچھ مدت تو تم زمانہ حال میں رکھتے ہو اور کچھ اور مدت آئندہ تمہارے لیے پیدا ہوں گے۔ اس لیے یہ حکم دائمی صورت میں نہیں آیا اور اس صورت میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۵۱

آیت کے مکی ہونے کے ساتھ تضاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد اس آیت کے آخر میں چار اور احکام کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود سازی کا جو پروگرام پیش کیا گیا تھا، اس کی اس چیز کے ذریعہ تکمیل کرتا ہے فرماتا ہے: "نماز قائم کرو، زکات ادا کرو، اور مستحب انفاق کرنے سے خدا کو قرضِ حسنہ دو، اور (یہ جان لو) کہ جو کارِ خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے"۔

(واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضًا حسنًا وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ھو خیرًا واعظم اجرًا)۔

"اور استغفار کرو اور خدا سے بخشش طلب کرو کہ خدا غفور و رحیم ہے"۔

(واستغفروا اللہ ان اللہ غفور رحیم)۔

یہ چاروں حکم (نماز، زکوٰت، مستحب انفاق اور استغفار) تلاوت کے حکم اور قرآن میں تدبر کے ضمیمہ کے ساتھ ——— جو اقبل کے جملوں میں بیان ہوا تھا ——— مجموعی طور پر خود سازی کا ایک مکمل پروگرام پیش کرتے ہیں، جو ہر عصر اور زمانہ میں خصوصاً آغازِ اسلام میں ناقابلِ انکار تاثیر رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔

یہاں "نماز" سے مراد پنجگانہ نمازیں ہیں اور "زکوٰۃ" سے مراد زکوٰۃ واجب ہے اور "قرضِ حسنہ" دینے سے مراد وہی مستحب انفاق اور خرچ ہیں، اور یہ انتہائی بزرگوارانہ تعبیر ہے جس کا اس سلسلہ میں تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تمام ملکیتوں کا مالک اس شخص سے قرض مانگ رہا ہے، جس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے، تاکہ اس طریقہ سے انفاق و ایثار اور اس عملِ خیر کے ذریعہ کسبِ فضیلت کا شوق بڑھے اور اس طریقہ سے اس کی تربیت ہو اور وہ تکامل و ارتقاء حاصل کرے۔

ان احکام کے آخر میں استغفار کا ذکر، ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان اطاعتوں کی انجام دہی کی وجہ سے خود کو انسان کامل سمجھ بیٹھو، اور اصطلاح کے مطابق خود کو طلب گار تصور کرنے لگو، بلکہ تمہیں ہمیشہ اپنے آپ کو مقصر شمار کرنا چاہیے اور بارگاہِ خدا میں عذر و معذرت کرتے رہنا چاہیے، ورنہ جو کچھ اس کی خداوندی کے لائق اور سزاوار ہے وہ کوئی شخص بھی بجا نہیں لا سکتا۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ان احکام پر اس لیے تکیہ کیا گیا ہے تاکہ یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ اگر شبانہ قیام اور تلاوتِ قرآن میں تخفیف کر دی گئی ہے تو باقی پروگراموں اور دینی احکام میں بھی اثر انداز ہوگی، بلکہ وہ اسی طرح اپنی حالت پر باقی ہیں۔[1]

ضمنی طور پر زکوٰۃ واجب کے ذکر کو یہاں اس آیت کے مدنی ہونے کی ایک اور دلیل قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔ لیکن بعض نے کہا ہے، اصل حکمِ زکوٰۃ مکہ میں ہی نازل ہوا تھا لیکن اس کا نصاب اور اس کی مقدار بیان نہیں ہوئے تھے، وہ چیز جو مدینہ میں تشریع ہوئی وہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا مسئلہ تھا۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۱۵۶

چند نکات

عقیدت کے ساتھ علمی آمادگی کی ضرورت

اہم اجتماعی کاموں کو انجام دینے کے لیے ——— خاص طور پر زندگی کے تمام حالات میں ایک وسیع و عریض انقلاب پیدا کرنے کے لیے ——— ہر چیز سے پہلے ایک انسانی پختہ اور مصمم طاقت کی ضرورت ہے، جو اس کام کے لیے، راسخ اعتقاد، مکمل آگاہی، ضروری علمی و فکری تعلیمات اور اخلاقی تربیت کے ساتھ بنی ہو۔

اور یہ ایسا دقیق کام تھا جسے پیغمبر اسلام نے، مکہ میں بعثت کے ابتدائی سالوں میں، بلکہ اپنی عمر کے سارے عرصہ میں انجام دیا اور اسی بنا پر، اور اسی محکم بنیاد کی وجہ سے، اسلام کے پودے نے سرعت کے ساتھ نشو و نما پائی، کونپلیں پھوٹیں اور شاخ و برگ نکالے۔

جو کچھ اس سورہ میں آیا ہے، وہ اس حساب شدہ اور پختہ تلے پروگرام کا ایک زندہ اور بہت ہی منہ بولتا نمونہ ہے، دو تہائی رات یا کم از کم ایک تہائی رات کے حکمِ عبادت نے ——— جو تلاوت اور قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کے ساتھ توام تھی ——— مسلمانوں کی روح میں عجیب و غریب تاثیر پیدا کر دی اور انھیں "قولِ ثقیل" اور "سبحِ طویل" کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ یہ رات کی حرکات اور "ناشئۃ اللیل" جو قرآنی تعبیر کے مطابق "اشد وطئاً" اور "اقوم قیلاً" تھیں، آخر کار انھوں نے اپنا کام دکھایا اور محروم عوام اور مستضعف طبقات کا ایک چھوٹا سا گروہ اس طرح کا بن گیا کہ انھوں نے جہان کے ایک عظیم حصہ پر حکومت کرنے کی لیاقت پیدا کر لی۔

اور آج بھی اگر ہم مسلمان چاہیں کہ اپنی دیرینہ عظمت و قدرت کو دوبارہ حاصل کر لیں تو وہ راستہ یہی راستہ ہے اور وہ پروگرام یہی پروگرام ہے ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم ایسے افراد کے ساتھ، جو فکر و نظر اور ایمان کے لحاظ سے ضعیف و ناتواں ہیں، ایسے افراد جنھوں نے ضروری علمی اور اخلاقی تربیت حاصل نہیں کی ہے، "یہودیوں" کے تسلط اور غلبہ کو اسلامی ممالک کے اندر سے باہر نکال پھینکیں گے اور جھوٹی جنایتکار سپر طاقتوں کے ہاتھ کو اسلامی ممالک تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے، لیکن "آنجا کہ کس است یک حرف بس است"

۲۔ غور و فکر کے ساتھ تلاوتِ قرآن

روایاتِ اسلامی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تلاوتِ قرآن کی فضیلت زیادہ پڑھنے سے نہیں ہے بلکہ اچھی طرح سے پڑھنے اور اس میں سوچ بچار اور غور و فکر کرنے سے ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت کے ذیل میں، جو یہ حکم دیتی ہے کہ قرآن میں سے جتنا تمھارے لیے میسر ہے، اتنا پڑھو "فاقرءوا ما تیسر منہ" ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضا سے آئی ہے کہ آپ نے اپنے جدِ امجد سے اس طرح نقل فرمایا ہے:

ما تیسر منہ لکم فیہ خشوع القلب وصفاء السر

"بس اتنا پڑھو جس میں خشوعِ قلب، صفائے باطن اور روحانی و معنوی نشاط حاصل ہو"[1]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تلاوت کا ہدف اور مقصد اصلی تعلیم و تربیت ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۲

اور اس سلسلہ میں روایات بہت ہیں۔

۲۔ معاش کی تلاش جہاد کے ہم ردیف

اوپر والی آیت میں ——— جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے ——— زندگی بسر کرنے کے لیے تلاش معاش کو "جہاد فی سبیل اللہ" کے ساتھ قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام اس موضوع کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ حالانکہ ایک فقیر، بھوکی اور دوسروں کی محتاج قوم ہرگز استقلال، عظمت اور سربلندی حاصل نہیں کر پائے گی اور اصولی طور پر "جہاد اقتصادی" "دشمن کے ساتھ جہاد" کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلہ میں مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کا ایک جملہ نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ایما رجل جلب شیئاً الی مدینة من مدائن المسلمین، صابراً محتسبا، فباعه بسعر یومه، کان عند الله بمنزلة الشهداء، ثم قرأ "واٰخرون یضربون فی الارض"۔۔۔۔

جو شخص کچھ مال مسلمانوں کے کسی شہر میں لے جائے اور اس راہ میں اپنی زحمتوں کو خدا کے لیے محسوب کرے اور پھر اس کو اس دن کی عادلانہ قیمت میں فروخت کر دے تو ایسا شخص خدا کی بارگاہ میں شہیدوں کی منزلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سورۂ مزمل کی آخری آیت کے اس جملہ کو شاہد کے عنوان سے تلاوت کیا "واٰخرون یضربون فی الارض"[1]

خداوندا! ہمیں تمام ابعاد و جہات میں جہاد کرنے کی توفیق عطا فرما۔

بارالٰہا! ہم سب کو رات کے قیام، اور قرآن کریم کی تلاوت اور اس آسمانی کتاب کے نور کے سایہ میں اپنی اصلاح کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمارے اسلامی معاشرے کو اس مضامین سے پر سورہ سے ابہام و ہدایت حاصل کرنے کے ساتھ شائستہ مقام اور دیرینہ عظمت تک پہنچا!

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ مزمل

اول ماہ صفر ۱۴۰۷، ۱۴/ ۷/ ۸۵

اختتام ترجمہ

بروز منگل بوقت تقریباً ساڑھے چار بجے سہ پہر ۵ صفر ۱۴۰۸ھ

مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء۔ ۱۸ ای ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

---

[1] "مجمع البیان" و "تفسیر ابوالفتوح رازی" و "تفسیر قرطبی" زیر بحث آیت کے ذیل میں، ضمنی طور پر ایک دوسری حدیث سے جو اس حدیث کے مشابہ ہے اور تفسیر قرطبی میں رسول اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی، بلکہ یہ پیغمبر سے لی تھی۔

سُورۂ مُدّثّر

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۵۶ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲ر صفر ۱۴۰۷ ہجری

سُورۂ مدثر کے مضامین

اس میں شک نہیں کہ یہ سورہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ کیا یہ وہ پہلی صورت ہے جو پیغمبر پر نازل ہوئی ہے یا یہ سُورۂ اقراء کے بعد نازل ہوئی ہے۔

لیکن سورہ "اقرأ" اور "سُورۂ مدثر" کے مضامین میں غور و خوض کرنے سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ "اقراء" آغازِ دعوت میں نازل ہوئی تھی، اور سُورۂ مدثر اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب پیغمبر آشکارِ دعوت پر معمور ہوئے، اور پوشیدہ اور پنہاں دعوت کا دور ختم ہوا، لہٰذا بعض نے کہا ہے کہ سُورہ "اقراء" وہ پہلا سورہ ہے جو آغازِ بعثت میں نازل ہوئی اور سُورۂ "مدثر" وہ پہلا سورہ ہے جو آشکارا دعوت کے بعد ہے اور یہ بات بہت اچھی نظر آتی ہے۔

بہرحال مکی سورتوں کا مزاج و طبیعت۔ جو مبداء و معاد کی دعوت اور شرک سے مبارزہ اور مخالفین کو عذابِ الٰہی کا انذار اور تہدید ہے۔ اس سورہ میں مکمل طور سے منعکس ہے۔

اس سُورہ کے مباحث مجموعی طور سے سات محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر کو قیام، انذار، آشکارا تبلیغ کی دعوت اور اس راہ میں صبر و استقامت اور اس کام کے لیے ضروری آمادگیوں کی تیاری۔

۲۔ قیامت کی طرف اشارہ، دوزخیوں کی صفات۔ وہی جو قرآن سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور جنھوں نے حق کا مذاق اڑایا۔

۳۔ کافروں کو ڈرانے کے ساتھ دوزخ کی خصوصیات کا ایک حصہ۔

۴۔ بار بار کی قسموں کے ذریعہ امرِ قیامت پر تاکید۔

۵۔ ہر انسان کی سرنوشت کا اس کے اعمال کے ساتھ ربط اور اس سلسلہ میں ہر قسم کے غیر منطقی افکار کی نفی۔

۶۔ جنتیوں اور دوزخیوں کی بعض خصوصیات اور ان میں سے ہر ایک کی سرنوشت۔

۷۔ جاہل، بے خبر، مغرور اور خود غرض لوگوں کے حق سے فرار کی کیفیت۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامی اسلامؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من قرأ سورة المدثر اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدّق بمحمد (ص) وکذب به بمکة

"جو شخص سورۂ مدثر کو پڑھے گا، اسے ان لوگوں کی تعداد میں جنھوں نے مکہ میں پیغمبر اسلامؐ کی تصدیق یا تکذیب کی تھی، دس نیکیاں دی جائیں گی"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

من قرأ فی الفریضة سورة المدثر کان حقا علی الله ان یجعله مع محمد (ص) فی درجته، ولا یدرکه فی حیاة الدنیا شقاء ابدًا

"جو شخص سورۂ مدثر کو واجب نماز میں پڑھے تو خدا پر حق ہے کہ اس کو پیغمبرؐ کے ہمراہ ان کے جوار میں اور ان کے درجہ میں قرار دے اور دنیاوی زندگی میں بدبختی اور رنج و تکلیف اسے دامن گیر نہ ہو"[2]

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے نتائج صرف سورہ کے الفاظ پڑھنے پر مترتب نہیں ہوں گے بلکہ ضروری ہے کہ سورہ کے مضامین کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۳۰۳

سورۂ مدثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ
۲۔ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ
۳۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ۪ۙ
۴۔ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرۡ ۪ۙ
۵ وَالرُّجۡزَ فَاهۡجُرۡ ۪ۙ
۶۔ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۪ۙ
۷۔ وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ؕ
۸۔ فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ ۙ
۹۔ فَذٰلِكَ یَوۡمَئِذٍ یَّوۡمٌ عَسِیۡرٌ ۙ
۱۰۔ عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ غَیۡرُ یَسِیۡرٍ

ترجمہ

شروع اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱۔ اے بسترِ خواب میں آرام کرنے والے
۲۔ اٹھ کھڑا ہو اور انذار کر (اور عالمین کو ڈرا)
۳۔ اور اپنے پروردگار کی بزرگی بیان کر
۴۔ اور اپنے لباس کو پاک کر

۵۔ اور پلیدگیوں سے پرہیز کر۔
۶۔ اور کسی پر منت نہ رکھ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کر۔
۷۔ اور اپنے پروردگار کے لیے صبر کر۔
۸۔ جس وقت صور پھونکا جائے گا۔
۹۔ وہ دن بہت ہی سخت دن ہوگا۔
۱۰۔ اور کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

تفسیر

اٹھ اور عالمین کو ڈرا!

اس میں شک نہیں کہ ان آیات میں مخاطب خود پیغمبرؐ کی ذات ہے۔ اگرچہ اس بات کی ان میں صراحت نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان آیات میں موجود قرائن اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اے بستر خواب میں آرام کرنے والے اور اے چادر اوڑھ کر سونے والے" (یا ایھا المدثر)۔

"اٹھ کھڑا ہو اور انذار کر اور عالمین کو ڈرا" (قم فانذر)۔

کیونکہ سونے اور آرام کرنے کا وقت گزر گیا ہے اور قیام و تبلیغ کا زمانہ آگیا ہے۔

خصوصیت کے ساتھ انذار پر تکیہ، حالانکہ پیغمبر "بشیر" بھی ہیں اور "نذیر" بھی۔ اس بناء پر ہے، چونکہ "انذار" خصوصیت کے ساتھ کام کے آغاز میں، سوئی ہوئی ارواح کو بیدار کرنے میں، زیادہ عمیق اور گہری تاثیر رکھتا ہے۔

اس بارے میں کہ پیغمبر بستر میں کیوں آرام کر رہے تھے، کہ اس خطاب نے آپ کو قیام کی دعوت دی، مفسرین نے بہت سے احتمال دیئے ہیں۔

۱۔ مشرکین عرب موسم حج کے قریب جمع ہوئے اور ان کے سرداروں مثلاً ابوجہل، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث وغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ باہر سے مکہ میں آنے والے لوگوں کے سوالات کے مقابلہ میں، جنھوں نے اِدھر اُدھر سے پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے سلسلہ میں مختلف مطالب سُنے ہیں کیا کہیں؟

اگر ہر ایک الگ الگ جواب دینا چاہے، ایک اسے کاہن کہے، دوسرا مجنون کہے، تیسرا ساحر کہے تو یہ اختلاف رائے اچھا اثر نہ چھوڑے گا لہٰذا ضروری ہے کہ پیغمبر کے برخلاف پروپیگنڈے کی جنگ متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ بحث و گفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے بہتر یہ ہے

کہ وہ سب کے سب اسے "ساحر" کہیں، کیونکہ "جادو" کے واضح آثار میں سے ایک بیوی اور شوہر اور باپ اور بیٹے کے درمیان جدائی ڈالتا ہے اور پیغمبر نے دین اسلام کو پیش کر کے اس قسم کا کام انجام دیا ہے۔

یہ بات پیغمبرؐ کے کان تک پہنچی تو آپ کو بہت دکھ ہوا اور بیماروں کی طرح غمگین حالت میں گھر میں آئے اور بستر میں لیٹ گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور آپ کو قیام اور مبارزہ کی دعوت دی۔

۲۔ یہ آیات وہ پہلی آیات تھیں جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئیں، کیونکہ "جابر بن عبداللہ" کے واسطے سے پیغمبرؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں کوہ حرا پر تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی اور کہا، اے محمدؐ! "تو خدا کا رسول ہے"۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔ میں نے اپنے سر کے اوپر دیکھا، تو ایک فرشتے کو عرش پر آسمان و زمین کے درمیان دیکھا، میں ڈر گیا اور خدیجہ کی طرف لوٹ آیا۔ اور میں نے کہا: "مجھ پر کپڑا ڈال دو، مجھ پر کپڑا ڈال دو اور ٹھنڈا پانی مجھ پر ڈالو"۔ یہ وہ منزل تھی کہ جبرئیل مجھ پر نازل ہوئے اور "یا ایھا المدثر" لائے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کی آیات آشکار دعوت کو بیان کر رہی ہیں، اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آیات کم از کم تین سال تک پوشیدہ طور سے دعوت کرنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اور یہ بات اس چیز سے جو اوپر والی روایت میں بیان کی گئی ہے سازگار نہیں ہے۔ مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ اس سورہ کی چند ابتدائی آیات آغاز دعوت میں نازل ہوئی تھیں اور بعد والی آیات چند سال کے بعد سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ پیغمبر سوئے ہوئے تھے اور اوپر چادر لی ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور آپ کو بیدار کیا اور یہ آیات آپ کے سامنے پڑھیں کہ اٹھ جائیے اور بستر اور نیند سے کنارہ کشی کیجیے اور رسالت اور پیغام الٰہی کو انجام دیجیے۔

۴۔ کپڑا اوڑھنے سے مراد ظاہری کپڑا نہیں ہے، بلکہ لباس نبوت و رسالت ہے۔ جیسا کہ پرہیزگاری کو "لباس التقوٰی" کہا گیا ہے۔

۵۔ "مدثر" سے مراد ایسا شخص ہے جس نے گوشہ عزلت اختیار کر لیا ہو اور علیحدگی اور تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہو۔ اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ عزلت اور گوشہ نشینی سے باہر نکل آؤ اور مخلوق کو انذار اور خدا کے بندوں کو ہدایت کرو۔

ان سب تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "فانذر" (انذار کرو) کا جملہ یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز سے ڈراؤ؟ اور کس موضوع میں انذار کرو؟ اور یہ حقیقت میں عمومیت کے بیان کے لیے ہے۔ یعنی بت پرستی، شرک و کفر، ظلم و بیدادگری اور فساد و عذاب الٰہی اور حساب محشر وغیرہ کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرو۔ (اور اصطلاح کے مطابق متعلقہ بات کا محذوف ہونا، عمومیت پر دلالت کرتا ہے) ضمنی طور پر یہ عذاب دنیا کو بھی شامل ہے اور عذاب آخرت کو بھی اور انسان کے اعمال کے برے نتائج کو بھی جو اسے دامن گیر ہوں گے۔

اور قیام و انذار کی دعوت کے بعد پیغمبر اسلامؐ کو پانچ حکم دیتا ہے، جو دوسروں کے لیے ایک نمونہ ہیں۔ ان میں سے پہلا حکم توحید کے بارے میں ہے۔ فرماتا ہے: "صرف اپنے پروردگار کو بڑا سمجھ" (وربک

فکبّر)[1]

وہی خدا جو تیرا مالک و مربّی ہے اور جو کچھ تیرے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے۔
تو اس کے غیر کو بالکل بھول جا اور تمام جھوٹے معبودوں پر سرخ لکیر پھیر دے، اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کے آثار کو محو کر دے۔
لفظ "رب" پر تکیہ اور اس کو "کبر" پر مقدم رکھنا انحصار کی دلیل ہے، اس مختصر سی عبارت میں مسئلہ توحید کو دلیل کے ذکر کے ساتھ پیش کرتا ہے، قرآن کی تعبیریں کتنی عمدہ اور مضامین سے پُر ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں یہ سب معنی بیان ہو گئے ہیں۔
"فکبّر" کے جملے سے مراد صرف "اللہ اکبر" کہنا نہیں ہے ——— اگرچہ اللہ اکبر بھی کہنا اس کا ایک معنی ہے، جس کی طرف روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے ——— بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے خدا کو اعتقاد کے لحاظ سے بھی، عمل کے لحاظ سے بھی اور گفتگو میں بھی بڑا سمجھو، اور اس کو اوصافِ جمال کے ساتھ متصف اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزّہ جان، بلکہ اس کو اس سے برتر سمجھ کہ اس کی تعریف و توصیف ہو سکے۔ جیسا کہ روایات اہلِ بیت میں آیا ہے کہ "اللہ اکبر" کا معنی یہ ہے کہ خدا اس سے برتر ہے کہ اس کی توصیف ہو سکے، اور وہ فکرِ انسانی میں سما سکے، اس بنا پر "تکبیر" "تسبیح" کی نسبت زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو صرف ہر قسم کے نقص و عیب سے تنزیہ کو شامل ہوتی ہے۔
مسئلہ توحید کے بعد دوسرا حکم آلودگیوں سے پاکیزگی کے بارے میں دیتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اور اپنے لباس کو پاک کر"۔
(و ثیابك فطهّر)۔
"لباس" کی تعبیر ممکن ہے انسان کے عمل سے کنایہ ہو، کیونکہ ہر شخص کے اعمال، اس کے بمنزلہ لباس ہیں، اور اس کا ظاہر اس کے باطن کو بیان کرتا ہے۔
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں لباس سے مراد دل، روح اور جان ہے، یعنی اپنے دل کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر، جہاں لباس کو پاک ہونا چاہیے، تو صاحبِ لباس اولیت رکھتا ہے کہ وہ پاک ہو۔
بعض نے اسی ظاہری لباس کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے۔ کیونکہ لباس کے ظاہر کی پاکیزگی کسی کی شخصیت کے اہم ترین ہونے اور انسان کی تربیت اور تہذیب و تمدن کی نشانی ہے۔ خصوصاً زمانۂ جاہلیت میں بہت کم لوگ غلاظت سے اجتناب کرتے تھے اور بہت ہی گندا لباس رکھتے تھے خصوصاً معمول یہ تھا (جیسا کہ اس آخری زمانۂ جاہلیت میں گرفتار شدہ افراد میں بھی یہی معمول ہے) کہ لباس کے دامن کو بہت بڑا کرتے ہیں، اس طرح کہ وہ زمین پر کھنچتا ہے اور آلودہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو بعض روایات میں امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: آیت کا معنی یہ ہے کہ ثیابك فقصّر (اپنے لباس کو چھوٹا کر)[2] یہ بھی اسی معنی کو بیان کرتا ہے۔
بعض نے اس کی بیویوں کے ساتھ تفسیر کی ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے تم اپنی بیویوں کا لباس ہو اور وہ بھی تمہارا لباس ہیں (کیونکہ تم ایک دوسرے کی آبرو کی حفاظت کرتے ہو اور ایک دوسرے کی زینت ہو۔) (هن لباس لكم وانتم لباس لهن) (بقرہ آیہ ۱۸۷)

---

[1] "فکبر" میں "فا" بعض کے نظریہ کے مطابق زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق "شرط" کے معنی کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے اور جملہ کا معنی اس طرح ہے، چاہے جو واقعہ اور حادثہ پیش آئے، خدا کے بڑا ہونے کو نہ بھول جانا (بعد والی آیات کے بارے میں بھی یہی گفتگو ہے)

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۸۵

ان معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

حقیقت میں آیت کا اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رہبرانِ الٰہی کی باتیں اسی وقت نفوذ کر سکتی ہیں جبکہ ان کا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو اور ان کا تقویٰ و پرہیزگاری ہر لحاظ سے مسلم ہو۔ اسی لیے قیام و انذار کے بعد پاکدامنی کا حکم دیتا ہے

تیسرے حکم میں فرماتا ہے: "ناپاکیوں سے اور ان چیزوں سے جو عذابِ الٰہی کا موجب ہیں پرہیز کرو" (والرجز فاھجر)۔

رجز (پلیدگی) کے مفہوم کی وسعت کے سبب اس کے لیے گوناگوں تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

کبھی اس کی بتوں کے ساتھ، کبھی ہر قسم کی معصیت و نافرمانی کے ساتھ، کبھی قبیح و ناپسندیدہ اخلاق کے ساتھ، کبھی محبت دنیا کے ساتھ جو ہر گناہ اور خطا کا سرچشمہ ہے، کبھی عذابِ الٰہی کے ساتھ جو شرک و معصیت کا نتیجہ ہے اور کبھی ہر اس چیز کے معنی میں جو انسان کو خدا سے غافل کر دیتی ہے، تفسیر کی ہے۔ نکتہ اصلی یہ ہے کہ "رجز" اصل میں اضطراب و تزلزل کے معنی میں ہے[1] اور اس کے بعد ہر قسم کے گناہ، شرک، بت پرستی، شیطانی وسوسوں، اخلاق ذمیمہ اور عذابِ الٰہی کے لیے ——— جو انسان کے اضطراب کا سبب بنتے ہیں اور اس کو صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں، اطلاق ہونے لگا۔

حالانکہ بعض اس لفظ کا معنی "عذاب" کرتے ہیں[2]۔ اور چونکہ شرک و گناہ، برے اخلاق اور دنیا کی محبت عذابِ الٰہی کو جلب کرتے ہیں، لہٰذا ان پر بھی "رجز" کا اطلاق ہونے لگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "رجز" (بروزن شرک) عام طور پر عذاب کے معنی میں آیا ہے[3]

بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ "رجز" اور "رجس" جو "پلیدگی" کے معنی میں ہیں، دونوں مترادف اور ہم معنی ہیں[4]

یہ تینوں معانی اگرچہ آپس میں مختلف ہیں، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ارتباط رکھتے ہیں۔ بہرحال آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ہر طرح کے انحراف، پلید اور قبیح عمل اور ہر اس کام کو جو دنیا و آخرت میں خدا کے غیض و غضب اور اس کے عذاب کا موجب ہو، شامل ہے۔

مسلّمہ طور پر پیغمبر اسلامؐ نبوت سے پہلے بھی ان امور سے پرہیز کرتے تھے اور ان سے دوری رکھتے تھے اور آپ کی زندگی کی تاریخ بھی جس کے دوست و دشمن سب ہی معترف ہیں، اس پر گواہ ہیں، لیکن یہاں دعوت الی اللہ کی راہ میں ایک اساسی اور بنیادی اصل کے عنوان سے بھی اور سب کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ کے عنوان سے بھی، اس پر تکیہ ہوا ہے۔

---

[1] "مفردات" راغب

[2] "المیزان" و "فی ظلال القرآن" (زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[3] سورۂ اعراف کی آیہ ۱۳۴، ۱۳۵۔ اور سبا کی آیہ ۵، اور جاثیہ کی آیہ ۱۱ اور بقرہ کی آیہ ۵۹، اور اعراف کی آیہ ۱۶۲، اور عنکبوت کی آیہ ۳۴ کی طرف رجوع کریں۔

[4] فخر رازی کی تفسیر میں یہ معنی ایک احتمال کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ (جلد ۳۰ ص ۱۹۳)

چوتھے حکم میں فرماتا ہے: "احسان نہ جتلاؤ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کرو" (ولا تمنن تستکثر)[1]۔

اس بارے میں کہ احسان جتلانے اور زیادتی طلب کرنے سے نہی کن موارد میں ہے۔ یہاں پر آیت کا مفہوم پھر کلی اور وسیع ہے، اور خالق اور مخلوق پر ہر قسم کے احسان جتلانے کو شامل ہے۔ تو پروردگار پر احسان جتلاؤ کہ تم اس کے لیے جہاد اور سعی و کوشش کرتے ہو، کیونکہ نہ تو اس نے تم پر احسان کیا ہے کہ یہ بلند مقام تمھیں عطا کیا ہے۔

اسی طرح اپنی عبادت، اطاعت اور نیک اعمال کو زیادہ شمار نہ کرو، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو "کمی" اور "تقصیر" میں سمجھو اور عبادت کو اپنے لیے ایک قسم کی بہت بڑی توفیق شمار کرو۔

دوسرے لفظوں میں تمھیں اپنے قیام شب دانداز، توحید کی نشر و اشاعت، پروردگار کی عظمت کو بیان کرنے، کپڑوں کو پاک رکھنے اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرو، خدا پر احسان شمار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی انھیں کوئی بڑا کام سمجھنا چاہیے بلکہ انھیں اپنے پروردگار کے گراں بہا ہدیے سمجھنا چاہیے اور ان کی وجہ سے خدا کا ممنون رہنا چاہیے۔ اس کے عشق و محبت میں اس طرح غرق رہنا چاہیے، کہ تم ان اہم کاموں کو بہت ہی ناچیز سمجھو۔

اور اگر تم مخلوق کی بھی کوئی خدمت کرتے ہو، چاہے وہ معنوی جہات میں ہو، جیسے تبلیغ و ہدایت، اور چاہے مادی جہات میں ہو مثلاً انفاق و بخشش، ان میں سے کسی چیز کو بھی احسان جتانے یا تلافی کی توقع سے اور وہ تلافی بھی زیادتی کے ساتھ توام نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ احسان جتلانا نیک اعمال کو باطل اور بے اثر کر دیتا ہے۔ (یا ایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی) (بقرہ ـــــ ۲۶۴)

"لا تمنن" "منت" کے مادہ سے، ایسے موارد میں ایسی گفتگو کے معنی میں ہے جو اس نعمت کی اہمیت کو بیان کرے جو انسان نے کسی دوسرے کو دی ہے اور یہاں سے اس کا رابطہ "استکثار" (زیادہ طلب کرنے) کے مسئلہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنی خدمت کو ناچیز اور حقیر سمجھے، تو پھر وہ کسی اجر کی توقع نہیں رکھتا، چہ جائیکہ وہ زیادتی کا مطالبہ کرے، اس طرح سے احسان جتلانا ہمیشہ "استکثار" کا سرچشمہ بنتا ہے اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو نعمت کی قدر و قیمت کو کلی طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اور یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ: لا تعط تلتمس اکثر منھا: تو کسی کو کوئی ایسی چیز نہ دے جس سے بیشتر کی توقع رکھتا ہو[2] حقیقت میں یہ آیہ شریفہ کے کلی مفہوم کی ایک شاخ کا بیان ہے۔

جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے اس آیہ کی تفسیر میں فرمایا:

لا تستکثر ما عملت من خیر للہ

جو نیک کام تم اللہ کے لیے انجام دیتے ہو اسے ہرگز زیادہ نہ سمجھنا۔ یہ بھی اس مفہوم کلی کی ایک شاخ ہی ہے۔

---

[1] توجہ رکھیے کہ "تستکثر" یہاں حال ہے نہ ہی نہی کا جواب (کیونکہ مرفوع صورت میں آیا ہے) اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا: "احسان نہ جتلاؤ درحالیکہ تم زیادتی طلب کرتے ہو یا اپنے عمل کو بڑا اور زیادہ سمجھتے ہو۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۴ و "التفسیر بالمأثور" جلد ۶ ص ۴۰۰

بعد والی آیت میں اس سلسلہ کے آخری حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے : "اور اپنے پروردگار کے لیے صبر و شکیبائی اختیار کر۔ (ولربّك فاصبر)۔

ہمیں یہاں پر پھر "صبر و استقامت اور شکیبائی کے ایک وسیع مفہوم کا سامنا ہے، جو ہر چیز کو شامل ہے۔

یعنی اس عظیم رسالت کی ادائیگی کی راہ میں صبر و شکیبائی کر، مشرکین اور جاہل و نادان دشمنوں کی تکلیف کے مقابلہ میں صابر رہ، فرمانِ خدا کی اطاعت کی عبودیت میں استقامت دکھا اور نفس سے جہاد اور دشمن کے ساتھ میدان جنگ کے جہاد میں صابر و شکیبا رہ۔

مسلّمہ طور پر صبر و استقامت تمام گزشتہ پروگراموں کے اجراء کی بنیاد اور ضامن ہے۔ اصولی طور پر تبلیغ و ہدایت کی راہ میں اہم ترین سرمایہ یہی صبر و استقامت ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں بارہا اس پر تکیہ ہوا اور اسی وجہ سے امیرالمومنین علیؑ کے ارشاداتِ گرامی میں آیا ہے۔

الصبر من الایمان کالرأس من الجسد

"صبر و استقامت کی ایمان کے مقابلہ میں وہی حیثیت ہے جو سر کی بدن کے مقابلہ میں ہے"[1]

اور اسی بناء پر انبیاء اور مردانِ خدا کا ایک اہم ترین پروگرام یہی صبر و استقامت کا پروگرام تھا۔ جتنے زیادہ سخت اور سنگین حوادث ان پر پڑتے جاتے تھے اتنا ہی ان کا صبر و استقامت بڑھتا جاتا تھا۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے کہ آپ نے صابرین کے اجر کے سلسلہ میں فرمایا :

قال اللہ تعالیٰ : اذا وجهت الیٰ عبد من عبیدی مصیبة فی بدنه او ماله او ولده، ثم استقبل ذالك بصبر جمیل استحییت منه یوم القیامة ان انصب له میزانًا او انشر له دیوانًا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے : جس وقت میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کی طرف اس کے بدن یا مال یا اولاد کے لیے مصیبت لاتا ہوں اور وہ صبرِ جمیل کے ساتھ اس کا سامنا کرتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس کے لیے قیامت کے دن اعمال تولنے کے لیے میزان نصب کروں یا میں اس کے نامۂ عمل کو کھولوں[2]

اس حکم کے بعد جو قیام و انذار کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آیا ہے، زیر بحث آیات میں انذار کو ایک بہت ہی تاکیدی اور رسا بیان کے ساتھ شروع کرتا ہے اور فرماتا ہے : "جب صور میں پھونکا جائے گا" (فاذا نقر فی الناقور)۔

"تو وہ دن ایک بہت ہی سخت دن ہوگا" (فذالك یومئذ یوم عسیر)[1]۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۸۲

[2] تفسیر "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۲۰ [1] اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے وہ چیز ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"وہ بہت ہی پر مشقت دن ہوگا، جو کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا" (علی الکافرین غیر یسیر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ناقور" اصل میں مادہ "نقر" سے اس طرح دبانے کے معنی میں ہے، جس سے سوراخ ہوجائے اور "منقار" بھی، جو پرندوں کی چونچ ہے، جس سے پرندے دبا کر سوراخ کرتے ہیں اسی معنی سے لی گئی ہے، اسی بناء پر بگل کو، جس کی آواز گویا انسان کے کان میں سوراخ کرتی ہے اور دماغ میں اُتر جاتی ہے "ناقور" کہا جاتا ہے۔

قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی انتہا اور قیامت کی ابتداء میں دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا یعنی دو حد سے زیادہ وحشت انگیز اور ہلا دینے والی صدائیں ——— جن میں سے پہلی موت کی صدا ہے اور دوسری بیداری اور حیات کی صدا ہوگی ——— پوری دنیا کو گھیر لیں گی۔ جنھیں "نفخہ صورِ اوّل" اور "نفخہ صورِ دوم" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور زیرِ بحث آیت "نفخہ دوم" کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے قیامت برپا ہوجائے گی اور وہ کافروں پر سخت اور سنگین دن ہوگا۔

ہم "صور" اور "نفخہ صور" کے بارے میں تفصیلی بحث سورۂ زمر کی آیہ ۶۸ (جلد ۹ ص ۵۲۴ تا ۵۴۲) میں کر چکے ہیں۔

بہرحال اوپر والی آیات اس واقعیت کو بیان کرتی ہیں کہ قیامت کے نفخہ میں کافروں کی مشکلات یکے بعد دیگرے نمایاں ہوں گی، وہ بہت ہی دردناک دن ہوگا اور ایسا مصیبت بار اور طاقت فرسا ہوگا کہ وہ طاقت ور ترین انسان کے بھی گھٹنے ٹکوا دے گا۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) جو کتاب "البیان فی غریب اعراب القرآن" میں آئی ہے، جہاں وہ کہتا ہے کہ "ذالک" مبتداء ہے اور "یومئذ" بدل ہے اور "یوم عسیر" اس کی خبر ہے۔

۱۱۔ ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۙ
۱۲۔ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ
۱۳۔ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ۙ
۱۴۔ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ۙ
۱۵۔ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ۙ
۱۶۔ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ؕ
۱۷۔ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ؕ

ترجمہ

۱۱۔ مجھے اس شخص کے ساتھ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے چھوڑ دے۔
۱۲۔ وہی شخص جس کے لیے میں نے وسیع مال قرار دیا ہے۔
۱۳۔ اور ایسے بیٹے جو ہمیشہ اس کے پاس (اور اس کی خدمت میں) رہتے ہیں۔
۱۴۔ اور میں نے ہر لحاظ سے اس کے لیے زندگی کے وسائل فراہم کیے ہیں۔
۱۵۔ پھر بھی وہ یہی طمع رکھتا ہے کہ میں اس میں اور اضافہ کر دوں۔
۱۶۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہماری آیات کے بارے میں دشمنی کرتا ہے۔
۱۷۔ عنقریب ہم اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ زندگی کی چوٹی کے اوپر جائے، (پھر ہم اسے نیچے پھینک دیں گے)

شانِ نزول

ان آیات کے لیے دو شانِ نزول بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ قریش "دارالندوہ" (مسجد الحرام کے قریب ایک مرکز تھا جس میں وہ اہم مسائل میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے) میں جمع ہوئے۔ "ولید" (مکہ کا ایک مشہور اور جانا پہچانا شخص تھا، جس کی عقل اور سمجھ کے مشرکین قائل تھے اور اہم مسائل میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے)

نے ان کی طرف رُخ کرکے کہا: تم بلند نسب اور عقل وخرد کے مالک ہو، اور عرب ہر طرف سے (خانہ کعبہ کی زیارت اور دوسرے امور کے لیے) تمھارے پاس آتے ہیں، اور وہ تم سے مختلف جواب سنتے ہیں، تم اپنی بات کو (متفق ہوکر) ایک کرو۔

پھر اس نے ان کی طرف رُخ کرکے کہا: تم اس شخص کے بارے میں (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے) کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں: وہ "شاعر" ہے۔ ولید نے منہ چڑا کر کہا: ہم نے شعر بہت سنے ہیں، لیکن اس کی باتیں شعر کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتیں، انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں کہ وہ "کاہن" ہے۔ اس نے کہا: جب تم اس کے پاس جاتے ہو تو وہ باتیں جو کاہن (اخبار غیبی کی صورت میں) کہتے ہیں، وہ تو اس میں بھی نہیں ملتیں، انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں کہ وہ "دیوانہ" ہے۔ اس نے کہا جب تم اس کے پاس جاؤ گے تو تم اس میں جنون کا کوئی اثر نہیں پاؤ گے۔

انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں وہ "ساحر" ہے۔ اس نے کہا ساحر کس معنی میں؟ انھوں نے کہا: ایسا شخص جو دشمنوں اور دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کر دیتا ہے، وہ کہنے لگا: ہاں: وہ "ساحر" ہے، اور وہ ایسا کرتا ہے، (کیونکہ ان میں سے بعض مسلمان ہوجاتے ہیں اور اپنی راہ دوسروں سے الگ کر لیتے ہیں)۔

اس کے بعد وہ "دارالندوۃ" سے باہر نکلے اور حالت ان کی یہ تھی کہ جو بھی ان میں سے پیغمبر اکرمؐ سے ملتا تھا تو کہتا تھا: اے ساحر! اے ساحر!

یہ مطلب پیغمبرؐ پر بہت گراں گزرا تو خدا نے اس سورہ کی ابتدائی آیات اور اوپر والی آیات (آیہ ۲۵ تک) نازل فرمائیں (اور اپنے پیغمبرؐ کی دلداری کی)۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت سورۂ الٓمٓ سجدہ (سورۂ غافر) کی آیات نازل ہوئیں تو پیغمبرؐ مسجد الحرام میں (نماز میں) کھڑے تھے اور "ولید بن مغیرہ" حضرت کے قریب تھا اور آپ کی تلاوت کو سن رہا تھا، جب پیغمبرؐ نے اس بات کی طرف توجہ کی، تو آپ نے ان آیات کی تلاوت کو دہرایا۔

"ولید" اپنی قوم ——— قبیلہ بنو مخزوم ——— کی مجلس میں آیا اور کہا، خدا کی قسم ابھی میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ جنوں کی باتوں کے۔

وان له لحلاوة وان عليه لطلاوة وان اعلاه لمثمر، وان اسفله لمغدق
وانه ليعلوا وما يعلى

اس کی گفتگو میں ایک خاص شیرینی ہے اور اس میں ایک خاص زیبائی اور طراوت ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے پُر ہیں اور اس کی جڑیں قوی اور طاقتور ہیں، وہ ایسا کلام ہے جو دوسرے ہر کلام سے برتر ہے، اور کوئی کلام اس پر برتری حاصل نہیں کرسکتا۔

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا، قریش نے ایک دوسرے سے کہا: خدا کی قسم! وہ محمد کے دین کا فریفتہ ہوگیا ہے، اور ہمارے دین سے نکل گیا ہے اور وہ تمام قریش کو منحرف کردے گا، اور وہ ولید کو "ریحانۃ قریش" (قریش کا گل سرسبد) کہتے تھے۔

ابوجہل نے کہا: میں اس کام کا کوئی علاج کرتا ہوں وہ اٹھ کر چل پڑا، اور غمگین چہرے کے ساتھ ولید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

ولید نے کہا: اے بھتیجے! تو کس لیے غمگین ہے؟ اس نے کہا: قریش اس سن وسال کے باوجود تجھ پر عیب لگاتے ہیں اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ تو نے محمد کی بات کو زینت بخشی ہے۔ وہ ابوجہل کے ساتھ اٹھا اور اپنے قبیلہ کی مجلس میں آیا اور کہا: کیا تمھارا گمان یہ ہے کہ محمد دیوانہ ہے؟ کیا تم نے کبھی جنون کے آثار اس میں دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

اس نے کہا: کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ کاہن ہے؟ کیا تم نے اس میں کبھی کہانت کے آثار دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا نہیں! کیا تم یہ تصور کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے؟۔ انھوں نے کہا "نہیں"۔

اس نے کہا: پھر کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ کیا تم نے اسے ماضی میں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں! وہ دعوائے نبوت سے پہلے بھی ہمارے ہاں ہمیشہ "صادق امین" کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔

اس مرحلہ پر قریش نے "ولید" سے کہا: تیرے نظریہ کے مطابق ہم اسے کیا کہیں؟ ولید سوچ میں پڑ گیا، نگاہ کی اور منہ چڑا کر بولا: وہ صرف ایک جادوگر ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مرد اور عورت، اولاد اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے؟ (ایک گروہ اس پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے خاندان سے جدا ہو جاتا ہے)۔

اس بناء پر وہ جادوگر ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے ایک عمدہ جادو ہے۔[1]

تفسیر

"ولید" ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں کافروں کو مجموعی طور پر ڈرایا گیا ہے۔ زیر بحث آیات، خصوصیت کے ساتھ ان کے بعض افراد پر، جو زیادہ موثر تھے۔ انگلی رکھتے ہوئے، اس پر گویا و ناطق، رسا اور سرکوبی کرنے والی تعبیروں کے ساتھ، شدید ترین انذاروں کی بوچھاڑ کر رہی ہیں۔

پہلے کہتا ہے: مجھے اس کے ساتھ جسے میں نے اکیلے ہی پیدا کیا ہے، چھوڑ دے" (ذرنی ومن خلقت وحیدًا)۔

یہ آیت اور بعد والی آیات ـــــ جیسا کہ ہم نے شان نزول میں بیان کیا ہے ـــــ ولید بن مغیرہ مخزومی ـــــ جو قریش کے مشہور سرغنوں میں سے تھا ـــــ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

"وحیدًا" (اکیلا) کی تعبیر ممکن ہے خالق کی توصیف میں ہو یا مخلوق کی، پہلی صورت میں بھی دو احتمال ہیں: پہلا یہ کہ مجھے اس کے ساتھ تنہا چھوڑ دے کہ میں خود اس کو شدید سزا دوں، یا یہ کہ میں خود تنہا نے اسے پیدا کیا ہے، اور یہ سب نعمتیں اسے بخشی ہیں، لیکن اس نے

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۸۶۔ اس شانِ نزول کو بہت سے مفسرین مثلاً "قرطبی" و "مراغی" و "فخر رازی" و "فی ظلال القرآن" اور المیزان وغیرہ نے (کچھ اختلاف کے ساتھ) نقل کیا ہے۔

نمک حرامی کی ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی دو احتمال ہیں: ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ماں کے پیٹ میں بھی اور پیدائش کے وقت بھی یکہ و تنہا تھا، نہ اس کے پاس مال تھا نہ اولاد، اور یہ سب کچھ ہم نے اسے بعد میں بخشا ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو "وحید" (بے مثل و بے مثال)، (عربوں میں بے نظیر شخص) کا نام رہتا تھا، اور وہ یہ کہا کرتا تھا:

انا الوحید ابن الوحید، لیس لی فی العرب نظیر، ولا لابی نظیر

"میں وحید عصر ہوں اور وحید عصر کا بیٹا ہوں، عرب میں نہ کوئی میرا مثل و نظیر ہے اور نہ ہی میرے باپ کا"[1]

اس مطلب کا استفہام کے عنوان سے آیہ میں تکرار ہوا ہے۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ "میں نے اس کے بہت ہی زیادہ وسیع مال قرار دیا" (وجعلت له مالاً ممدوداً)۔

"ممدود" اصل میں کھینچے ہوئے کے معنی میں ہے، جو یہاں اس کے مال کی وسعت اور حجم کے بیان کے لیے آیا ہے، یا زمانہ اور مکان کے لحاظ سے کشش کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے اموال اس قدر وسیع تھے کہ اس کے پاس مکہ اور طائف کے درمیان کے فاصلہ میں بہت سے اونٹ، گھوڑے اور زرعی زمینیں تھیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس اتنے باغات اور کھیت تھے کہ ان میں سے ایک کا غلہ ابھی ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا تیار ہو جاتا تھا علاوہ ازیں وہ ایک لاکھ دینار طلائی کا مالک تھا، اور یہ تمام معانی لفظ "ممدود" میں جمع ہیں۔

اس کے بعد اس کی افرادی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: میں نے اس کے لیے ایسی اولاد قرار دی ہے جو ہمیشہ اس کے پاس اور اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔ (و بنین شهوداً)۔

وہ ہمیشہ اس کی مدد اور خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کی موجودگی اس کے انس اور راحت کا سبب تھی اور وہ تنگی معیشت کی وجہ سے ہرگز مجبور نہیں تھے کہ ان میں سے کوئی بھی دور دراز کے علاقے کی طرف سفر کرے اور باپ کو دوری، ہجر اور تنہائی کا رنج پہنچائیں۔ بعض روایات میں

---

[1] تفسیر "فخر رازی" و "کشاف" و "مراغی" اور "قرطبی" زیر بحث آیات کے ذیل میں، بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "وحید" بغیر باپ کے اور غیر نثری بیٹے کے معنی میں ہے۔ لیکن اس روایت میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے وہ اوپر والی آیت کی تفسیر بن سکے۔ علاوہ ازیں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ معنی اوپر والی آیت کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔

آیا ہے کہ اس کے دس بیٹے تھے ۔

اس کے بعد ان تمام نعمتوں کی طرف، جو اس نے اسے دے رکھی تھیں، کلی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "میں نے اس کے لیے ہر لحاظ سے وسائل زندگی فراہم کیے" (ومهدت له تمهيدًا)۔

نہ صرف مال اور آبرومند بیٹے ہی، بلکہ وہ اجتماعی اور جسمانی پہلوؤں سے بھی، ہر لحاظ سے نعمتوں میں غرق تھا۔

"تمہید" "مہد" کے مادہ سے اصل میں اس جگہ کے معنی میں ہے جسے چھوٹے بچے کے لیے تیار کرتے ہیں (گہوارہ اور اسی قسم کی کوئی چیز) اس کے بعد ہر قسم کے راحت و آرام، پیش رفت اور اجتماعی عمدہ مقام و حیثیت پر اس کا اطلاق ہونے لگا اور مجموعی طور پر اس کا ایک وسیع معنی ہے، جو زندگی کی انواع و اقسام کی نعمتوں، اور پیش رفت و موفقیت کے وسائل کو شامل ہے

لیکن وہ ان تمام نعمتوں کے بخشنے والے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور اس کے آستانہ پر پیشانی جھکانے کے بجائے کفرانِ نعمت کرنے اور زیادہ طلب کرنے لگا: "اور اس قدر مال اور نعمت رکھنے کے باوجود، پھر بھی یہ لالچ رکھتا ہے کہ ہم اس کی نعمتوں میں اضافہ کریں" (ثم يطمع ان ازيد)۔

یہ بات "ولید بن مغیرہ" میں ہی منحصر نہیں تھی، بلکہ تمام دنیا پرست ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کی پیاس ہرگز نہیں بجھتی اور اگر مفت اقلیم بھی ان کے زیرِ نگیں دے دی جائیں تو وہ پھر بھی ایک اور اقلیم کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

لیکن بعد والی آیت پوری شدت کے ساتھ اس نامحرم کی خواہشات کو رد کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ ہم اس کی نعمت میں اور اضافہ کریں، کیونکہ وہ ہماری آیات سے دشمنی رکھتا ہے" (كلا انه كان لآياتنا عنيدًا)۔

اور باوجود اس کے کہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ قرآن نہ تو جن کا کلام ہے اور نہ ہی یہ بشر کا کلام ہے، اور یہ طاقتور جڑیں، پرثمر شاخیں اور بے مثال کشش رکھتا ہے، پھر بھی وہ اس کو "سحر" کا نام دیتا تھا اور اس کے لانے والے کو ساحر کہتا تھا۔

"عنید" "عناد" کے مادہ سے، بعض کے قول کے مطابق اس قسم کی مخالفت اور دشمنی کے لیے بولا جاتا ہے، جو جانتے بوجھتے صورت پذیر ہو، یعنی انسان کسی چیز کی حقانیت کو درک کرے، اور پھر اس کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو جائے اور "ولید" اس معنی کا روشن مصداق تھا۔

"کان" کی تعبیر بتاتی ہے کہ اس کا حق کے ساتھ عناد ایک امر مستمر اور ہمیشگی کا تھا، ٹوٹنے والا اور جلدی گزر جانے والا نہیں تھا۔

آخر میں آخری زیرِ بحث آیت میں اس کی دردناک سرنوشت کی طرف مختصر اور پرمعنی عبارت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم عنقریب اسے مجبور کریں گے کہ وہ زندگی کی "صعب العبور" ——— (جس سے گزرنا مشکل ہے) ——— چوٹی سے اوپر جائے" (اور پھر ہم اس چوٹی کی بلندی سے اسے نیچے پھینک دیں)۔ (سارهقه صعودًا)۔

"سأرهقه" "ارهاق" کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو سختی کے ساتھ ڈھانپ لینے کے معنی میں ہے اور سخت کاموں کے برداشت کرنے اور انواع واقسام کے عذاب میں مبتلا کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"صعود" (بروزن کبود) اس جگہ کے معنی میں ہے جس سے اوپر جاتے ہیں اور "صعود" (بروزن قعود) اوپر جانے کے معنی میں ہے۔

اور چونکہ بلند چوٹیوں سے اوپر جانا بہت ہی مشکل کام ہے، اس لیے یہ تعبیر ہر مشکل اور زحمت والے کام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اسی لیے بعض نے اس کی عذاب الٰہی کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "صعود" جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے، اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کے اوپر چڑھے، یا یہ ایک ایسا پہاڑ ہے جسے عبور کرنا سخت مشکل ہے، جس کی ڈھلان تیز اور زیادہ ہے، جب وہ اس کے اوپر جائے گا تو گر جائے گا اور نیچے آپڑے گا اور اس بات کا بار بار تکرار ہوگا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت اس جہان میں "ولید" کے دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ——— جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے ——— وہ انفرادی واجتماعی زندگی میں کامیابی کی چوٹی کی بلندی پر پہنچنے کے بعد اس طرح گرا کہ آخر عمر تک مسلسل اپنے مال اور اولاد کو ہاتھ سے دیتا رہا، یہاں تک کہ بے حد مجبور اور دیوالیہ ہوگیا۔

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۹ ص ۱۳۱

۱۸۔ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝
۱۹۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝
۲۰۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝
۲۱۔ ثُمَّ نَظَرَ ۝
۲۲۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝
۲۳۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝
۲۴۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝
۲۵۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝

ترجمہ

۱۸۔ اس نے (قرآن سے مبارزہ کرنے کے لیے) غور وفکر کی، اور ایک مطلب تیار کر لیا۔
۱۹۔ وہ ہلاک ہو جائے، کس طرح (حق سے مبارزہ کرنے کے لیے) اس نے مطلب تیار کیا۔
۲۰۔ پھر وہ مرے، اس نے کس طرح سے مطلب (اور اپنے شیطانی منصوبہ) کو آمادہ کیا۔
۲۱۔ پھر اس نے نگاہ ڈالی۔
۲۲۔ پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلدی سے کام میں لگ گیا۔
۲۳۔ پھر اس نے (حق کی طرف) پشت کی اور تکبر کیا۔
۲۴۔ اور آخر کار اس نے کہا یہ (قرآن) گزشتہ لوگوں کے جادو کی طرح، ایک پرکشش اور پُرتاثیر جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔
۲۵۔ یہ انسان کے قول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

ہلاک ہوجائے وہ، اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا

ان آیات میں اس شخص کے بارے میں، جسے خدا نے فراواں مال واولاد دی تھی اور وہ پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کرنے لگا ——— یعنی "ولید بن مغیرہ" مخزومی کی ——— مزید وضاحتیں آئی ہیں۔

فرماتا ہے: "اس نے سوچا کہ پیغمبر اور قرآن کو کس چیز کے ساتھ متہم کرے؟ اور اس نے ایک منصوبہ اپنے ذہن میں تیار کرلیا (انہ فکّر وقدّر)۔

واضح رہے کہ غور وفکر کرنا اپنی ذات سے ایک اچھا کام ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حق کی راہ میں ہو۔ بعض اوقات اس کی ایک ساعت ایک سال کی عبادت، بلکہ عمر بھر کی عبادت کی فضیلت رکھتی ہے، کیونکہ وہی ایک لمحہ ہوسکتا ہے کہ انسان کی سرنوشت کو دگرگوں کردے، لیکن اگر غور وفکر کو کھڑ وفساد اور شیطنت کی راہ میں استعمال کیا جائے تو وہ مذموم اور قبیح ہے اور ولید کی فکر اور سوچ اسی قسم کی تھی۔

"قدّر" "تقدیر" کے مادہ سے، یہاں مطلب کو ذہن میں آمادہ کرنے اور اس قبیح منصوبہ کے اجراء کے لیے مصمم ارادہ کرنے کے معنی میں ہے۔

پھر اس کی مذمت کے لیے مزید کہتا ہے: "وہ ہلاک ہوجائے" اس نے حق سے مبارزہ کرنے کے لیے کیسا منصوبہ بنایا ہے (فقتل کیف قدّر)۔

اس کے بعد تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "پھر بھی وہ مارا جائے، اس نے حق سے مقابلہ کرنے کے لیے، کس قسم کا منصوبہ تیار کیا ہے" (ثم قتل کیف قدّر)۔

اور یہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو شانِ نزول میں آئی ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ مشرکین کے افکار کو متحد کرے اور انھیں ایک ہی جہت دے، تاکہ یک زبان ہوکر پیغمبرؐ کے خلاف ایک ہی طرح کا پروپیگنڈا کریں اور جب انھوں نے یہ پیش نہاد کی کہ حضرت کو "شاعر" کا لقب دیں تو اس نے قبول نہ کیا،

اس کے بعد انھوں نے "کاہن" کے عنوان کی پیش کش کی تو اس نے اس سے بھی موافقت نہ کی، پھر "مجنوں" کے عنوان کو پیش کیا تو اس نے اسے بھی پسند نہ کیا، آخر میں انھوں نے یہ پیش کش کی کہ پیغمبرؐ کو "ساحر" کہہ کر پکاریں تو اس نے ان کے ساتھ موافقت کی، کیونکہ اس کے خیال میں جادو کا اثر دو دوستوں کے درمیان جدائی ڈالنا اور دو مخالف افراد کے درمیان دوستی پیدا کرنا تھا اور یہ بات اسلام اور قرآن کے ظہور کے بعد پیدا ہوگئی تھی، اور چونکہ یہ نقشہ اور منصوبہ مطالعہ کرنے اور سوچ بچار کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا لہٰذا قرآن انھیں "فکر وقدر" کی تعبیر کے ساتھ جو بہت ہی مختصر اور پُرمعنی ہے، پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے اگرچہ پیش نہاد دوسروں کی طرف سے ہوئی تھی، لیکن غور وفکر اور انتخاب "ولید" کی طرف

سے ہوا تھا۔

بہرحال یہ جملہ ـــــ خصوصاً اس کے تکراروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے ـــــ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اپنے شیطانی افکار و نظریات میں پوری مہارت تھی، اس طرح سے کہ اس کی فکر اور سوچ باعثِ تعجب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس نے دوبارہ نظر کی" (ثم نظر)۔

اور اس نے اپنی ساختہ و پرداختہ فکر کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کی، تاکہ اس کے ضروری استحکام و انسجام اور مختلف پہلوؤں سے آگاہ و مطمئن ہو جائے۔

"پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلد بازی سے کام لیا" (ثم عبس و بسر)۔

"پھر اس نے حق کی طرف سے پشت پھیر لی اور تکبر کیا" (ثم ادبر و استکبر)۔

اور آخر کار اس نے کہا: "یہ چیز ایک عمدہ اور پرکشش جادو کے سوا ـــــ جیسا کہ گزشتہ لوگوں سے نقل ہوا ہے ـــــ کچھ نہیں ہے" (فقال ان ھٰذا الا سحر یؤثر)۔

"یہ صرف انسان کا قول ہے اور اس کا وحی الٰہی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے" (ان ھٰذا الا قول البشر)۔

اس طرح سے اس نے اپنی آخری بات، قرآن سے مبارزہ اور مقابلہ کرنے کے لیے، بار بار کے مطالعہ اور شیطانی سوچ کے بعد کہی، اور زمانۂ جاہلیت و شرک کے اس متفکر دماغ نے اپنی پوری شیطنت خرچ کرنے کے باوجود اپنی اس بات سے قرآن کی حد سے زیادہ مدح و ثنا اور تعریف و تمجید کر ڈالی، حالانکہ وہ خود اس بات کو نہیں سمجھا، اس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قرآن ایسی کشش اور حد سے زیادہ قوتِ جاذبہ رکھتا ہے، جو ہر انسان کے دل کو مسخر کر لیتا ہے اور اس کے قول کے مطابق اس میں ایسی سحر انگیز تاثیر ہے جو دلوں کو مسحور کر دیتی ہے اور چونکہ قرآن میں جادوگروں کے جادو سے کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے، بلکہ وہ منطقی، موزوں اور نپے تلے اقوال اور باتوں کا مجموعہ ہے، لہٰذا یہ بات خود اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ انسان کا کلام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک آسمانی وحی ہے اور اس نے ماورا طبیعت عالم اور خدا کے بے پایاں علم سے سرچشمہ حاصل کیا ہے جس میں پورے نظم و انسجام اور استحکام کے ساتھ تمام خوبیاں اور زیبائیاں جمع ہیں۔

"عبس" "عبوس" (بروزن جلوس) کے مادہ سے، منہ چڑانے کے معنی میں ہے اور "عبوس" (بروزن مجوس) اس شخص کے معنی میں ہے جو اس صفت کا حامل ہو۔

"بسر" "بسور" کے مادہ سے اور "بسر" (بروزن نصر) بعض اوقات تو کسی کام کے وقت آنے سے پہلے اس میں جلدی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی منہ چڑانے اور چہرہ کو دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے۔

زیرِ بحث آیت میں اگر دوسرا معنی مراد ہو تو یہ "عبس" کے جملے سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اگر یہ پہلے معنی میں ہو، تو یہ قرآن کے لیے ایک غلط عنوان چسپاں کرنے میں، لہٰذا گھبراہٹ اور سراسیمگی کے ساتھ جلد بازی سے تصمیم گیری کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

"یؤثر" کا جملہ "اثر" کے مادہ سے، اس روایت کے معنی میں ہے، جو گزشتہ لوگوں سے نقل ہوئی ہو، اور وہ آثار جو ان سے باقی رہ گئے ہوں اور بعض نے اسے "ایثار" کے مادہ سے، انتخاب کرنے، مقدم رکھنے اور ترجیح دینے کے معنی میں سمجھا ہے۔

پہلے معنی کے مطابق "ولید" کہتا ہے: یہ گزشتہ لوگوں سے نقل شدہ جادو کی مانند، ایک جادو ہے اور دوسرے معنی کے مطابق وہ یہ کہتا ہے یہ ایک ایسا جادو ہے جو اپنی حلاوت اور کشش کی بناء پر دلوں میں اثر کرتا ہے، اور لوگ اس کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔

بہرحال یہ قرآن کے اعجاز کا ایک ضمنی اعتراف ہے، کیونکہ قرآن جادوگروں کے خارق العادۃ کاموں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا، یہ ایک ایسا سنجیدہ و محکم کلام ہے، جو معنویت سے پُر ہے اور بے مثل و نظیر قوت جاذبہ و نفوذ رکھتا ہے۔ اگر یہ "ولید" کے قول کے مطابق بشر کا کلام ہوتا، تو پھر دوسرے بھی اس کی مثل و نظیر لا سکتے تھے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن نے بارہا مقابلہ کی دعوت دی ہے، لیکن اس کے ان سخت ترین دشمنوں میں سے ——— جو عربی زبان میں حد سے زیادہ مہارت رکھتے تھے ——— کوئی بھی اس جیسی چیز نہ لا سکے، بلکہ وہ اس سے کمتر بھی نہ لا سکے۔ اور معجزہ کا معنی یہ ہے۔

۲۶۔ سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ۝
۲۷۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝
۲۸۔ لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ۝
۲۹۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝
۳۰۔ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ (لیکن) ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔
۲۷۔ اور تو نہیں جانتا کہ دوزخ کیا چیز ہے؟
۲۸۔ (وہ ایک ایسی آگ ہے جو) نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے۔
۲۹۔ وہ بدن کی جلد کو کلی طور پر دگرگوں کر دیتی ہے۔
۳۰۔ انیس (عذاب کے فرشتے) اس پر مقرر کیے گئے ہیں۔

تفسیر

اس کی سرنوشتِ شوم

گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے، جو شرک کے بعض سرغنوں کی وضع و کیفیت، اور قرآنِ مجید اور پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت کی نفی و انکار کی بات کرتی تھیں، ان آیات میں قیامت میں ان کے وحشت ناک عذاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور دوزخ کی آگ میں جلائیں گے" (ساصلیہ سقر)۔

"سقر" اصل میں "سقر" (بروزن فقر) کے مادہ سے دگرگوں ہونے اور سورج کی گرمی کے اثر سے پگھل جانے کے معنی میں ہے اس کے بعد جہنم کے ناموں میں سے ایک نام کے عنوان سے انتخاب ہوا ہے اور بارہا قرآنی آیات میں آیا ہے اور اس نام کا انتخاب دوزخ کے ہولناک عذابوں کی طرف اشارہ ہے، جو اہلِ دوزخ کو دامن گیر ہوں گے، اور بعض نے جہنم کے ہول انگیز طبقات و درکات میں سے ایک کا

نام سمجھا ہے۔

اس کے بعد عذابِ دوزخ کی عظمت و شدت کے بیان کے لیے کہتا ہے: "تو کیا جانتا ہے کہ سقر کیا ہے" (وما ادراك ما سقر)۔ یعنی اس کا عذاب اس قدر شدید ہے جو دائرہ تصور سے باہر ہے اور کسی شخص کے فکر و خیال میں نہیں سماتا، جیسا کہ جنت کی نعمتوں کی اہمیت و عظمت کسی کی فکر و خیال میں نہیں سماتیں۔

"وہ نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے" (لا تبقی ولا تذر)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جہنم کی آگ، دنیا کی آگ کے برخلاف ——— جو کبھی بدن کے ایک حصہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور دوسرا حصہ صحیح و سالم رہ جاتا ہے اور کبھی جسم پر اثر کرتی ہے، لیکن روح اس سے امان میں رہتی ہے ——— ایک ایسی گھیرنے والی آگ ہے جو انسان کے پورے وجود کو اپنے احاطہ میں لے لی گی اور کسی چیز کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخیوں کو نہ تو مارے گی اور نہ ہی زندہ رہنے دے گی، بلکہ وہ ہمیشہ موت و حیات کے درمیان گرفتار رہیں گے، جیسا کہ سورۂ اعلیٰ کی آیہ ۱۳ میں آیا ہے لا یموت فیها ولا یحیٰی "نہ وہ اس میں مریں گے اور نہ ہی وہ زندہ رہیں گے"۔

یا یہ ہے کہ نہ تو جلد اور گوشت بدن پر رہنے دے گی اور نہ ہی ہڈیوں کو صحیح و سالم چھوڑے گی، اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کلی طور پر جلا دے گی اور نابود کر دے گی، کیونکہ یہ معنی اس چیز سے، جو سورۂ نساء کی آیہ ۵۶ میں آئی ہے، سازگار نہیں ہے، جہاں فرماتا ہے: (کلما نضجت جلودهم بدّلناهم جلوداً غیرها لیذوقوا العذاب) جس وقت ان کے بدن کی جلدیں جل جائیں گی تو ہم ان پر دوسری جلدیں تبدیل کر دیں گے، تاکہ وہ خدا کے عذاب کا مزہ چکھیں۔

اس کے بعد قہرِ الٰہی کی اس جلانے والی آگ کی دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بدن کی جلد کو کامل طور پر بدل کر رکھ دے گی، جو بہت دور کے فاصلہ سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی" (لواحة للبشر)[1]۔

وہ چہرے کو اس طرح سے سیاہ اور تاریک بنا دے گی کہ وہ شبِ تاریک سے زیادہ سیاہ نظر آئے گا۔

"بشر" یہاں "بشرہ" کی جمع ہے، جو بدن کی ظاہری جلد کے معنی میں ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسانوں کے معنی میں ہو، "لواحة" "لوح" کے مادہ سے، کبھی تو ظاہر و آشکار ہونے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی تغیر دینے اور دگرگوں کرنے کے معنی میں۔

پہلے معنی کی بنا پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: دوزخ دور کے فاصلہ سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیہ ۳۶ میں آیا ہے، وبرّزت الجحیم لمن یرٰی "دوزخ دیکھنے والوں کے لیے ظاہر و آشکار ہوگی"۔

---

[1] "لواحة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں "هی لواحة" ہے۔

اور دوسرے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہے : "دوزخ بدن کی جلد کے رنگ کو کلی طور پر دگرگوں کر دے گی"۔

اور آخری زیرِ بحث آیت میں فرماتا ہے : " انیس عذاب کے فرشتے جہنم پر مقرر کیے گئے ہیں (علیھا تسعۃ عشر)[1]

وہ فرشتے جو قطعی طور سے ترحم، شفقت اور مہربانی پر مامور نہیں ہیں، بلکہ سزا دینے، عذاب اور سختی پر مامور ہیں۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں صرف انیس کے عدد کا ذکر ہوا ہے اور عذاب پر مامور ملائکہ کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن بعد والی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعداد عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ فرشتوں کے انیس گروہوں کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ انیس افراد کی طرف، اور " و ما یعلم جنود ربك الا ھو " (تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا) کا جملہ، جو بعد والی آیت میں آیا ہے، اس کو اس معنی پر قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن مامورینِ عذابِ الٰہی کے لیے اعداد میں سے صرف انیس کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، کوئی بھی شخص دقت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا، لیکن کچھ لوگوں نے یہ احتمال دیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس کے عدد میں، اکائیوں میں سب سے بڑا عدد (نو کا عدد) اور دہائیوں میں سے سب سے چھوٹا عدد (دس کا عدد) جمع ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ کی جڑیں انیس ظاہری و باطنی اخلاق کی طرف لوٹتی ہیں اور چونکہ اخلاقِ رذیلہ میں سے ہر ایک عذابِ الٰہی کا ایک عامل ہے، اس لیے دوزخ کے انیس طبقے ہیں، جو ان کی تعداد کے مطابق ہیں اور ہر طبقہ پر ایک فرشتہ یا فرشتوں کا ایک گروہ عذاب پر مامور ہے۔

اصولی طور پر قیامت، بہشت و دوزخ اور ان کے جزئیات و خصوصیات سے مربوط مسائل ہم لوگوں کے لیے، جو محدود دنیا کے محیط میں اسیر ہیں، پورے طور پر واضح نہیں ہیں، جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان کے کلیات ہیں۔ اسی لیے روایات میں یہ آیا ہے کہ ان انیس فرشتوں میں سے ہر ایک بہت بڑی قدرت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے قبیلہ کو آسانی کے ساتھ جہنم میں پھینک سکتا ہے۔

اور یہاں سے ان لوگوں کے افکار کا ضعف و ناتوانی واضح ہو جاتا ہے، جو ابوجہل کی طرح سوچتے ہیں، اس نے جب یہ آیت سنی تو اس نے قبیلہ قریش سے بطور استہزاء کے یہ کہا کہ تمھاری مائیں تمھاری عزا میں بیٹھیں، کیا تم سنتے نہیں ہو کہ " ابن ابی کبشہ " (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے[2]

---

[1] اس جملہ میں " علیھا " خبر مقدم ہے اور " تسعۃ عشر " مبتدائے موخر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لفظ مبنی پر فتحہ ہے۔ اس لیے ظاہر میں اس پر رفع نہیں آسکتا اور اس کی وجہ نحویوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ واو عاطفہ کے معنی کو متضمن ہے۔

[2] اس بارے میں کہ قریش پیغمبرؐ کو اس عنوان سے کیوں پکارتے تھے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: اس کی وجہ یہ ہے کہ قبیلہ " خزاعہ " کا ایک شخص " ابوکبشہ " نامی تھا جو زمانہ جاہلیت میں بتوں کی عبادت سے دستبردار ہو گیا تھا اور چونکہ پیغمبر بت پرستی کے شدید مخالف تھے لہٰذا وہ آپ کو " ابوکبشہ " کے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ابوکبشہ پیغمبرؐ کے مادری اجداد میں سے تھا لیکن بہرحال اس میں شک نہیں کہ ان کا مقصد اس نام کے انتخاب کرنے میں تمسخر اڑانا تھا، کیونکہ عربی زبان میں " کبش " " مینڈھے " کے معنی میں ہے۔ اگرچہ یہ نام مدح کے طور پر بھی آیا ہے اور لشکر کے بہادروں اور کمانڈروں کو بھی کہتے ہیں۔

کیا کہتا ہے ؟ وہ کہتا ہے کہ دوزخ کے خازن انیس افراد ہیں ، لیکن تم بہادروں کا ایک بہت بڑا گروہ ہو، کیا تم میں سے ہر دس آدمی بھی ان میں سے ایک کو مغلوب نہیں کرسکتا ؟" ابوالاسد جمحی" (قریش میں سے ایک طاقت ور شخص) نے کہا : میں ان میں سے سترہ کے لیے کافی ہوں ، باقی کے دو نفر کا حساب چکا لینا ۔[1]

یہ پست دماغ کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس تمسخر اور استہزاء کے ذریعہ ، نورِ حق کا راستہ روک دیں ، اور اپنے آپ کو حتمی اور یقینی نابودی سے نجات دیں ۔

ایک نکتہ

انیس کا عدد ، عذاب کے فرشتوں کا عدد ہے

اوپر والی آیات میں ، جہنم کے خازنوں کی تعداد واضح طور پر انیس افراد یا انیس گروہ اور لشکر بتائی گئی ہے اور بعد والی آیات میں اسی مطلب پر تکیہ ہوا ہے ، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض منحرف فرقے اس عدد کے مقدس ہونے پر اصرار کرتے ہیں ، یہاں تک کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ سال کے مہینوں کی تعداد اور مہینوں کے دنوں کی تعداد ——— تمام طبعی اور فلکی موازین کے برخلاف ——— اسی انیس کے محور پر منظم کریں ، اور اپنے عملی احکام بھی اسی کے مطابق قرار دیں ۔

اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک مولف جو شاید ان کے نظریات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے ، ایک ہنسانے والا ، اور عجیب اصرار رکھتا ہے کہ وہ قرآن کی ہر چیز کی انیس کی بنیاد پر توجیہ کرے ، اور بہت سے ایسے موارد میں ، جہاں یہ عدد اس کی دلی خواہش کے مطابق ، آیاتِ قرآنی میں موجود واقعیتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ وہاں وہ اپنی مرضی سے کچھ کم اور کچھ زیادہ کرتا ہے تاکہ وہ انیس کے عدد یا انیس کے عدد کی ضربوں سے ہم آہنگ ہوجائے اور ان کے مطالب کو ذکر کرنے میں وقت صرف کرنا ، یا ان کے جواب دینا شاید اتلافِ وقت میں محسوب ہوگا ۔

ہاں ! ایک " دوزخی مذہب " کو " دوزخی عدد " کے محور پر ہی گردش کرنا چاہیے اور ایک دوزخی گروہ کو عذاب کے فرشتوں کے عدد کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہونا چاہیے ۔

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۳۸۸ اور دوسری تفاسیر

۳۱۔ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ؏

ترجمہ

۳۱۔ ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا، اور ان کی تعداد بھی کافروں کی آزمائش کے علاوہ اور کسی بات کے لیے معین نہیں کی، تاکہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین کر لیں اور مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو اور اہل کتاب اور مومنین (اس آسمانی کتاب کی حقانیت میں) شک و تردد نہ کریں، اور کافر یہ کہیں: خدا کا اس تعریف سے کیا مقصد ہے؟ ہاں! خدا جسے چاہتا ہے، اسی طرح سے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ انسانوں کی تنبیہ اور تذکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

دوزخ کے مامورین کی یہ تعداد کس لیے ہے؟

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا نے دوزخ کے خازنوں اور مامورین کی تعداد انیس افراد (یا انیس گروہ) بیان کی ہے، اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس عدد کا ذکر مشرکین اور کفار کے درمیان گفتگو کا سبب بنا، اور ایک گروہ نے اس کا مذاق اڑایا اور ان کی تعداد کے کم ہونے کو

اس بات کی دلیل خیال کیا کہ ان پر غلبہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

زیرِ بحث آیت جو اس سُورہ کی طویل ترین آیت ہے انھیں جواب دیتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سے حقائق کو واضح کرتی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا" (وما جعلنا اصحاب النار الا ملائکۃ)[1]۔

طاقت ور اور قدرت والے فرشتے اور قرآن کی تعبیر میں، "غلاظ" و "شداد" "بہت شدید اور سخت گیر، جن کے سامنے تمام گنہگار ضعیف و ناتواں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے ان کی تعداد کافروں کی آزمائش کے سوا اور کسی بات کے لیے قرار نہیں دی ہے" (وما جعلنا عدتھم الا فتنۃ للذین کفروا)۔

یہ آزمائش دو لحاظ سے تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ استہزاء اور تمسخر کرتے تھے کہ تمام اعداد میں سے انیس (۱۹) کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، حالانکہ دوسرا جو بھی عدد انتخاب ہوتا، اسی میں یہ سوال پیدا ہوتا۔

اور دوسری طرف وہ اس تعداد کو بہت کم سمجھتے تھے، اور بطور تمسخر اور استہزاء کے کہتے تھے، کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے مقابلہ کے لیے دس دس افراد کھڑے کر دیں گے اور انھیں درہم و برہم کر کے رکھ دیں گے۔

حالانکہ خدا کے فرشتے ایسے ہیں کہ قرآن کے قول کے مطابق) ان میں سے چند افراد ہی قومِ لوط کی ہلاکت پر مامور ہوئے تھے، اور انھوں نے ان کے آباد شہروں کو زمین سے اٹھا کر زیر و زبر کر دیا تھا اور اس سے قطع نظر، جہنم کے خازنوں کے لیے انیس کے عدد کا انتخاب، دوسرے معانی بھی رکھتا ہے، جو گزشتہ آیات کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس سے مقصد یہ تھا کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین پیدا کریں" (لیستیقن الذین اوتوا الکتاب)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے بعض اصحابِ پیغمبرؐ سے خازنینِ جہنم کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اسی وقت جبرئیل نازل ہوئے اور پیغمبر کو خبر دی: "علیھا تسعۃ عشر" "انیس افراد (یا انیس گروہ) اس پر مقرر کیے گئے ہیں"[2]

اور چونکہ انھوں نے اس موضوع پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے اپنی کتب کے ساتھ ہم آہنگ پایا، اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت پر ان کے یقین میں اضافہ ہوا، اور یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ مومنین بھی اپنے عقیدہ اور ایمان میں زیادہ راسخ ہو جائیں۔

---

[1] "اصحاب النار" کی تعبیر قرآنِ مجید کی آیات میں بہت زیادہ ذکر ہوئی ہے، اور ہر جگہ "دوزخیوں" کے معنی میں ہے، سوائے اس جگہ کے کہ یہاں "خازنین" کے معنی میں ہے۔ ضمنی طور پر ان کے بارے میں اس تعبیر کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ گزشتہ آیات میں "سقر" کا معنی سارا جہنم ہے، نہ کہ اس کا ایک حصہ۔

[2] اس حدیث کو "بیہقی"، "ابن ابی حاتم" اور "ابن مردویہ" نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر مراغی، جلد ۲۹ ص ۱۳۴)

اس لیے بعد والے جملہ میں مزید کہتا ہے: " اس سے مقصد یہ تھا کہ مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو جائے " (ویزداد الذین آمنوا ایمانًا)۔

اور اس جملہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ انھی تین اہداف و مقاصد کی طرف، تاکید کے عنوان سے لوٹتا ہے اور نئے سرے سے اہلِ کتاب کے ایمان، اس کے بعد مومنین کے ایمان اور پھر کفار و مشرکین کی آزمائش پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: " اور مقصد یہ تھا اور اہل کتاب اور مومنین قرآن کی حقانیت میں شک اور تردد نہ کریں اور کافر اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ کہیں کہ خدا کا اس تعریف سے کیا ارادہ ہے اور اس کا کیا مقصد ہے؟ (ولا یرتاب الذین اوتوا الکتاب والمؤمنون و لیقول الذین فی قلوبھم مرض و الکافرون ماذا اراد اللہ بھذا مثلًا)[1]۔

اس بارے میں کہ "الذین فی قلوبھم مرض" (وہ لوگ کہ جن کے دل میں بیماری ہے) سے کون لوگ مراد ہیں؟ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد "منافقین" ہیں، کیونکہ قرآنی آیات میں یہ تعبیر ان کے بارے میں آئی ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے، جو قبل و بعد کی آیات کے قرینہ سے منافقین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے: فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا؛ ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیتا ہے اور اسی بات کو وہ آیت کے مدنی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ گروہ منافقین اسلام کی قدرت کے موقع پر مدینہ میں پیدا ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔

لیکن آیاتِ قرآنی میں اس تعبیر کے ذکر کا مطالبہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر منافقین میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ان تمام کفار کے لیے جو حق تعالیٰ کی آیات کے بارے میں عناد، ہٹ دھرمی اور دشمنی رکھتے تھے، ——— اطلاق ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کا منافقین پر عطف ہوا ہے، جو ممکن ہے کہ ان کی دوگانگی اور الگ الگ ہونے پر دلیل ہو، مثلاً سورۂ انفال کی آیہ ۴۹ میں آیا ہے۔

اذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض غرّ ھٰؤلاء دینھم

"جس وقت منافقین اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری تھی یہ کہا کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے"

اور اسی طرح اور دوسری آیات۔

اس بناء پر اس آیت کے مکی ہونے کی نفی پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، خصوصًا جبکہ یہ ماقبل کی آیات کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور ارتباط رکھتی ہے۔ جن میں مکی ہونے کی نشانیاں مکمل طور پر نمایاں ہیں۔ (غور کیجیے)

پھر ان باتوں کے بعد، جو مومنین اور بیمار دل کافروں کی ارشاداتِ الٰہی سے فائدہ اٹھانے کی کیفیت کے بارے میں تھیں، مزید کہتا ہے اس طرح سے خدا جسے چاہتا ہے، گمراہ کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے"۔ (کذالک یضل اللہ من یشاء

---

[1] اس بات پر توجہ رہے کہ "لیستیقن" کا "لام" تو "لام علت" ہے اور "لیقول" میں "لام غایت" اور شاید اسی بناء پر تکرار ہوا ہے۔ حالانکہ اگر دونوں کا ایک ہی معنی ہوتا تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں تھی اور دوسرے لفظوں میں مومنین میں یقین پیدا کرنا۔ خدا کی مشیت اور اس کا حکم تھا۔ لیکن کافروں کی کفر آمیز باتیں اس کی مشیت اور حکم نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان کے اس کام کا انجام اور نتیجہ تھیں۔

ویھدی من یشاء)۔

گزشتہ جملے، اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتے ہیں کہ بعض کی ہدایت اور بعض دوسرے کی گمراہی کے بارے میں یہ مشیت و ارادۂ الٰہی، بے حساب نہیں ہے۔ وہ لوگ جو معاند، ہٹ دھرم اور دل کے بیمار ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی حق نہیں رکھتے، اور وہ لوگ جو خدا کے فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور وہ مومن ہیں وہ اسی قسم کی ہدایت کے مستحق ہیں۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "بہرحال تیرے پروردگار کے لشکر کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ چیز انسانوں کو تنبیہ کرنے اور تذکر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے (وما یعلم جنود ربک الا ھو وما ھی الا ذکریٰ للبشر)۔

اس بناء پر اگر دوزخ کے انیس خازنین کا ذکر درمیان میں آیا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خدا کے لشکر انھیں میں محدود ہیں، بلکہ پروردگار کے لشکر اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض روایات کی تعبیر کے مطابق تمام زمین اور آسمانوں کو انھوں نے بھر رکھا ہے، یہاں تک کہ تمام عالمِ ہستی میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں خدا کا ایک فرشتہ تسبیح میں مشغول ہے۔

اس بارے میں کہ "وما ھی الا ذکریٰ للبشر" (اور یہ انسانوں کے لیے تذکر کے علاوہ کچھ نہیں) کے جملہ میں "ھی" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے، مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ: یہ جنود اور خدا کے لشکروں کی طرف لوٹتی ہے، جن میں سے ایک گروہ خازنینِ دوزخ ہیں۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: "سقر" یعنی خود دوزخ کی طرف لوٹتی ہے۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ یہ سب چیزیں تذکر، بیداری اور آگاہی کا سبب ہیں، لیکن آیات کے لب ولہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اگر خدا نے اپنے لیے لشکروں کا انتخاب کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خود معاندین اور گنہگاروں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا سکتا، اور عذاب نہیں دے سکتا، بلکہ یہ سب کچھ تذکر و بیداری اور عذابِ الٰہی کے مسئلہ کے حقیقت ہونے کی طرف توجہ کے لیے ہے۔

ایک نکتہ

پروردگار کے لشکروں کی تعداد

ہر جگہ خدا کا حضور اور اس کی قدرت کی وسعت، تمام عالمِ ہستی میں، اس کی پاک ذات کو ہر قسم کے یار و مددگار اور لشکر سے بے نیاز کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مخلوقات کو اپنی عظمت بتانے، اور ان کے تذکر اور یاد دہانی کے لیے اس نے فراواں لشکروں کا انتخاب کیا ہے، جو سارے عالم میں اس کے فرمان کو اجراء کرنے والے ہیں۔

اسلامی روایات میں پروردگار کے لشکروں کی کثرت و عظمت اور قدرت کے لیے عجیب و غریب تعبیریں وارد ہوئی ہیں، چونکہ وہ ان موازین کے ساتھ، جن سے ہم سروکار رکھتے ہیں سازگار نہیں ہیں، اسی لیے ان کا سننا ہمارے لیے بہت تعجب آور ہے۔

یہاں پر ہم علیؑ کے اس عظمت والے کلام پر، جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں نقل ہوا ہے، قناعت کرتے ہیں، اور چونکہ عبادت طولانی ہے، لہٰذا ہم اس کا صرف ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

اس وقت اوپر والے آسمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا، اور ان کو فرشتوں کی مختلف اصناف واقسام سے پُر کر دیا۔

ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ سجدہ میں رہتا ہے اور وہ رکوع میں نہیں جاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے اور وہ رکوع سے سر نہیں اٹھاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ قیام میں رہتا ہے اور عبادت میں مشغول رہتا ہے اور وہ اپنی جگہ کو نہیں بدلتا۔

ایک گروہ ہمیشہ تسبیح کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔

کبھی نیند ان کی آنکھوں کو بند نہیں کرتی اور سہو ونسیان ان کی عقل پر غالب نہیں آتے۔

ان کے جسم سستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور غفلت اور فراموشی انھیں لاحق نہیں ہوتی۔

اور ایک دوسرا گروہ اس کی وحی کا امین ہے اور اس کے پیغمبروں کی طرف اس کی زبان ہے اور یہ گروہ اس کے فرمان اور امر کی تبلیغ کے لیے مسلسل آتا جاتا رہتا ہے۔

کچھ اور اس کے بندوں کے محافظ ہیں اور بہشت بریں کے دربان ہیں۔

ان میں سے بعض کے پاؤں زمین کے نچلے طبقات میں ثابت اور ان کی گردنیں آسمانِ بریں سے آگے نکل گئی ہیں اور ان کے وجود کے ارکان ابعاد واطرافِ جہان سے خارج ہو گئے ہیں اور ان کے کندھے عرشِ خدا کے پایوں کی حفاظت کے لیے آمادہ ہیں[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں (ملک) ایک وسیع وعریض مفہوم رکھتا ہے جو ان فرشتوں کو بھی شامل ہے جو عقل وشعور اور اطاعت و تسلیم کے حامل ہیں اور عالمِ ہستی کی بہت سی قوتوں اور توانائیوں کو بھی۔

ہم نے اس موضوع کے بارے میں سورۂ فاطر کے آغاز کی آیات میں (جلد ۱۸ ص ۱۶۵ سے آگے) مزید تفصیل بیان کی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ اول

۳۲۔ كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ
۳۳۔ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۙ
۳۴۔ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۙ
۳۵۔ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۙ
۳۶۔ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ۙ
۳۷۔ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۚ

ترجمہ

۲۲۔ جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم۔
۲۳۔ اور رات کی قسم جب (وہ دامن سمیٹے اور) پشت پھیرے۔
۲۴۔ اور صبح کی قسم جب وہ چہرہ کھولے۔
۲۵۔ کہ وہ (قیامت کے ہولناک حوادث) اہم مسائل میں سے ہیں۔
۲۶۔ تمام انسانوں کے لیے تنبیہ اور انذار ہے۔
۲۷۔ تم میں سے ان لوگوں کے لیے جو یہ چاہتے ہیں کہ آگے بڑھ جائیں یا پیچھے رہ جائیں (یعنی نیکیوں کی ہدایت کے لیے آگے بڑھ جائیں یا آگے نہ بڑھیں)

تفسیر

پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کے منکرین اور قیامت کے انکار کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں کئی ایک قسمیں کھائی ہیں، اور قیامت، قبروں سے اٹھنے اور دوزخ و عذاب کے مسئلہ پر تاکید ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم (كَلَّا وَالْقَمَرِ)۔

"كَلَّا" "حرف ردع" ہے اور عام طور پر ان باتوں کی نفی کے لیے آتا ہے جنھیں طرف مقابلے نے پہلے ذکر کیا ہو اور کبھی بعد والی باتوں کی نفی کے لیے بھی ہوتا ہے اور یہاں گزشتہ آیات کے قرینہ سے ان مشرکین کے گمان کی جو دوزخ اور اس کے عذاب کے منکر تھے، اور

جہنم کے خازن فرشتوں کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے، نفی کرتا ہے ۔

" چاند" کی قسم کا ذکر اس بناء پر ہے کہ وہ خدا کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہے، خلقت کے لحاظ سے بھی اور منظم دور اور گردش کرنے کے لحاظ سے بھی ، اور روشنی و خوبصورتی اور تدریجی تغیرات کے لحاظ سے بھی، جو دنوں کی تشخیص کے لیے خود ایک زندہ تقویم اور جنتری ہے

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " اور قسم ہے رات کی جس وقت وہ پشت پھیرے اور دامن سمیٹے (واللیل اذ ادبر)۔

" اور قسم ہے صبح کی جس وقت وہ اپنے چہرے سے نقاب اٹھائے" (والصبح اذا اسفر)[1]۔

حقیقت میں یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ چاند کی جلوہ گری راتوں میں ہے اور دن کے وقت چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کے تحت الشعاع میں ہوتی ہے اور وہ مطلقاً جلوہ نہیں دکھاتا ۔

رات بھی اگرچہ آرام بخش ہوتی ہے اور خاموش اور حق تعالیٰ کے عاشقوں کے راز و نیاز کا وقت ہوتا ہے ، لیکن یہ شبِ تاریک اس وقت بہت ہی عمدہ دکھائی دیتی ہے جب وہ پشت پھیرتی ہے اور صبح روشن کی طرف رُخ کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور آخر سحر کا وقت ہوتا ہے اور صبح کا طلوع کرنا، جو شبِ تاریک کا اختتام ہے، سب سے زیادہ دل آویز ہوتا ہے ، جو ہر انسان کو وجد و نشاط میں لاتا ہے اور نور و صفا میں غرق کر دیتا ہے ۔

ضمنی طور پر یہ تینوں قسمیں " قرآن" کے نورِ ہدایت، اور " شرک و بت پرستی" کی تاریکیوں کے پشت پھیرنے اور " توحید" کی صبح کی سفیدی کے پھوٹنے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں ۔

ان قسموں کو بیان کرنے کے بعد اس چیز کی طرف رُخ کرتا ہے، جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، فرماتا ہے : " یقیناً قیامت کے ہولناک حوادث ، دوزخ اور عذاب کے فرشتے اہم مسائل میں سے ہیں " (انھا لاحدی الکبر)[2]

" انھا " کی ضمیر یا تو " سقر " (دوزخ) کی طرف لوٹتی ہے یا " جنود " اور پروردگار کے لشکروں کی طرف، یا قیامت کے تمام حوادث کی طرف اور ان میں سے جو بھی ہو، اس کی عظمت واضح ہے ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " دوزخ کی خلقت کا مقصد انتقام جوئی ہرگز نہیں ہے ، بلکہ یہ تو انسانوں کو ڈرانے کا ایک ذریعہ ہے (نذیرًا للبشر)[3]۔

---

[1] " اسفر" " سفر" (بروزن فقر) کے مادہ سے ڈھکنا کھولنا اور حجاب کو دور کرنے کے معنی میں ہے ۔ اسی لیے بے پردہ عورتوں کو " سافرات" کہا جاتا ہے اور یہ تعبیر طلوعِ صبح کے لیے ایک خوبصورت اور عمدہ تشبیہ ہے ۔

[2] " کبر" کبریٰ کی جمع ہے جو بزرگ اور بڑی چیز کے معنی میں ہے ۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ " سقر" دوزخ کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے ۔ لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے اور آیات سے معلوم ہوتا ہے ، سازگار نہیں ہے ۔

[3] " نذیرًا" " انھا" کی ضمیر کا حال ہے جو " سقر" کی طرف لوٹتی ہے اور بعض نے اسے تمیز سمجھا ہے اور یہ اس صورت میں ہے کہ " نذیر" مصدری معنی رکھتا ہو اور " انذار" کے معنی دیتا ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح نظر آتا ہے ۔

تاکہ سب کو ڈرائے اور انذار کرے اور اس وحشت ناک عذاب سے، جو کافروں، گنہ گاروں اور حق کے دشمنوں کے انتظار میں ہے، بچائے۔

آخر میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "یہ انذار کسی معین گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ تو تمام افراد بشر کے لیے ہے، تم میں سے ان سب لوگوں کے لیے، جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور نیکیوں اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی طرف پیش رفت کرنا چاہتے ہیں اور چاہے وہ لوگ ہوں جو اس قافلہ سے پیچھے رہ جانے کی طرف مائل ہوں" (لمن شاء منکم ان یتقدم او یتأخر)۔

جو شخص آگے بڑھنے کی راہ پر چل پڑے، تو اس کا کیا ہی کہنا ہے اور جو تاخیر کی راہ اپنائے اور پیچھے کو ہٹے تو اس کا بُرا حال ہوگا۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدم و تأخر سے مراد جہنم کی آگ کی طرف تقدم اور اسی سے پیچھے ہٹنا ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد، نفسِ انسانی کا تقدم اور تکامل و ارتقاء ہے یا اس کا انحطاط اور تاخر ہے۔

پہلا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب ہے، اور دوسری تفسیر چنداں مناسب نہیں ہے۔

۳۸۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝
۳۹۔ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۝
۴۰۔ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝
۴۱۔ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۝
۴۲۔ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝
۴۳۔ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝
۴۴۔ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝
۴۵۔ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝
۴۶۔ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝
۴۷۔ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝
۴۸۔ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۝

ترجمہ

۳۸۔ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے۔
۳۹۔ مگر "اصحاب یمین" (جن کا اعمال نامہ ایمان و تقوی کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔
۴۰۔ وہ جنت کے باغات میں ہوں گے اور وہ سوال کریں گے۔
۴۱۔ مجرموں سے
۴۲۔ تمھیں دوزخ کی طرف کس چیز نے بھیجا۔
۴۳۔ وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

۴۴۔ اور مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔
۴۵۔ اور ہمیشہ اہلِ باطل کے ہم نشین و ہم صدا رہتے تھے۔
۴۶۔ اور ہمیشہ روزِ جزا کا انکار کرتے تھے۔
۴۷۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔
۴۸۔ لہٰذا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے لیے سود مند نہیں ہوگی۔

تفسیر

تم اہلِ دوزخ کیوں ہوگئے؟

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گزشتہ آیات میں دوزخ اور دوزخیوں کے بارے میں آئی ہے۔ ان آیات میں مزید کہتا ہے: "ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے" (کل نفس بما کسبت رھینۃ)۔

"رھینۃ" "رھن" کے مادہ سے (گرو) کے معنی میں ہے اور یہ وہ وثیقہ ہے جو عام طور پر "قرض" کے مقابلہ میں دیتے ہیں گویا انسان کا تمام وجود اس کے وظائف، تکالیف اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں گرو ہے، جس وقت انھیں انجام دے لیتا ہے، آزاد ہو جاتا ہے، ورنہ قیدِ اسارت میں رہے گا۔

اہلِ لغت کے بعض کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "رہن" کے معانی میں سے ایک ملازمت و ہمراہی ہے[1]۔ اس معنی کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا، کہ سب لوگ اپنے اعمال کے ہمراہ ہوں گے چاہے نیکوکار ہوں یا بدکار۔
لیکن بعد والی آیات کے قرینہ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لہٰذا بلافاصلہ فرماتا ہے: "مگر اصحابِ یمین، جو اس اسارت کی قید سے آزاد ہیں"۔ (الا اصحاب الیمین)۔
انھوں نے ایمان اور عملِ صالح کے سائے میں، اسارت کے طوق اور زنجیروں کو توڑ دیا ہے، لہٰذا وہ بے حساب جنت میں داخل ہوں گے[2]۔
اس بارے میں کہ یہاں "اصحاب الیمین" سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

---

[1] "لسان العرب" مادہ "رہن"
[2] اس بارے میں کہ یہاں استثناء "متصل" ہے یا "منقطع" بعض نے مثلاً مرحوم شیخ طوسی نے "تبیان" میں اسے "منقطع" قرار دیا ہے اور بعض نے مثلاً "روح البیان" نے اسے متصل جانا ہے۔ یہ فرق ان مختلف تفسیروں کے ساتھ مربوط ہے جو ہم نے "رھینۃ" کے مفہوم کے بارے میں ذکر کی ہیں۔ جس تفسیر کو ہم نے انتخاب کیا ہے، اس کے مطابق استثناء منقطع ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق استثناء متصل ہوگا۔ (غور کیجیے)

بعض نے تو اس کی ایسے افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔

اور بعض انھیں ایسے مومنین سمجھتے ہیں، جنھوں نے بالکل گناہ نہ کیا ہو، اور بعض فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور دوسرے احتمالات بھی ہیں۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے اور اس پر قرآن گواہ ہے، وہی پہلا معنی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان اور عملِ صالح کے حامل ہیں اور اگر ان سے کوئی چھوٹے موٹے گناہ ہوئے بھی ہوں، تو وہ ان کی نیکیوں کے تحت الشعاع میں ہیں اور ان الحسنات یذھبن السیئات)۔ (ہود ۱۱۴) کے حکم میں ہیں۔

ان کے نیک اعمال ان کے اعمالِ بد کو چھپالیں گے، یا تو وہ بلا حساب کے جنت میں وارد ہو جائیں گے، اور اگر ان کا حساب ہوا بھی، تو وہ سہل، سادہ اور آسان ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ انشقاق کی آیہ ۸ میں آیا ہے: فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا۔ لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، اس کا حساب آسان ہوگا۔"

اہلِ سنت کے مشہور مفسر "قرطبی" نے امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن و شیعتنا اصحاب الیمین، و کل من ابغضنا اھل البیت فھم المرتھنون

"ہم اور ہمارے شیعہ اصحابِ یمین ہیں اور جو شخص ہم اہلِ بیت کو دشمن رکھتا ہے، تو وہ اپنے اعمال کی قید میں ہے۔"[1]

اس حدیث کو دوسرے مفسرین، منجملہ "مجمع البیان" اور تفسیر "نور الثقلین" کے مؤلف اور بعض دوسروں نے بھی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

اس کے بعد "اصحاب الیمین" اور ان کے مدمقابل گروہ کے حالات کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ جنت کے پُر نعمت اور باعظمت باغوں میں ہوں گے اور اس حال میں وہ سوال کریں گے" (فی جنات یتساءلون)۔[2]

"گنہ گاروں سے" (عن المجرمین)۔

---

[1] تفسیر "قرطبی" جلد ۱۰، ص ۶۸۷۸

[2] "یتساءلون" اگرچہ باب "تفاعل" سے ہے، جو عام طور پر دو افراد یا چند افراد کے درمیان ہونے والے کام کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہاں بعض دوسرے مقامات کے مانند ہی یہ معنی نہیں دیتا اور یہاں یہ "یسألون" کے معنی دیتا ہے۔ ضمنی طور پر "جنات" کا نکرہ ہونا اس کی عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ اور بہرحال "فی جنات" ایک محذوف مبتدا کی خبر ہے اور تقدیر میں یہ "ھم فی جنات" ہے۔

وہ کہیں گے: "تمھیں دوزخ میں کس چیز نے پہنچا دیا" (ماسلککم فی سقر)۔

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بہشتیوں اور دوزخیوں کے درمیان کلی طور پر رابطہ منقطع نہیں ہوگا، جنتی اپنے عالم سے دوزخیوں کی حالت کا مشاہدہ کر سکیں گے اور ان سے گفتگو کر سکیں گے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مجرمین "اصحاب الیمین" کے اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ اس سلسلہ میں اپنے چار گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

پہلا یہ کہ "وہ کہیں گے: "ہم نمازگزاروں میں سے نہیں تھے"۔ (قالوا لم نك من المصلين)۔

اگر ہم نماز پڑھتے، تو نماز ہمیں خدا کی یاد دلاتی اور فحشاء اور منکر سے روکتی، اور ہمیں خدا کی صراطِ مستقیم کی دعوت دیتی"۔

دوسرا یہ کہ "ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے" (ولم نك نطعم المسكين)۔

"اطعام مسکین" کا معنی اگرچہ غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، لیکن ظاہراً اس سے مراد، ضرورت مندوں کی ہر ضرورت و حاجت میں مدد کرنا ہے، چاہے وہ خوراک ہو یا پوشاک و مسکن وغیرہ۔

اور جیسا کہ مفسرین نے تصریح کی ہے، اس سے مراد "زکاتِ واجب" ہے، کیونکہ مستحبی انفاقات کو ترک کرنا جہنم میں داخل ہونے کا سبب نہیں بنتا، اور یہ آیت دوبارہ اس مطلب کی تاکید کرتی ہے کہ زکات کا حکم اجمالی طور پر مکہ میں ہی نازل ہوا تھا، اگرچہ جزئیات کی تشریح اور حدود کی خصوصیات کا تعین، خصوصاً اس کا بیت المال میں مرتکز ہونا، مدینہ میں ہوا تھا۔

تیسرا یہ کہ "ہم ہمیشہ اہلِ باطل کے ساتھ ہم نشین اور ہم صدا ہو جاتے ہیں" (وكنا نخوض مع الخائضين)۔

حق کے خلاف جس گوشہ سے بھی کوئی صدا بلند ہوتی اور جو مجلس بھی باطل کی ترویج کے لیے برپا ہوتی، اور ہم اس سے باخبر ہو جاتے تو ہم ان کا ساتھ دیتے، اور جماعت کے رنگ میں رنگے جاتے، ان کی باتوں کی تصدیق کرتے اور ان کے تکذیب اور انکار کرنے کو صحیح قرار دیتے اور حق کا استہزاء کرنے اور تمسخر اڑانے سے لذت حاصل کرتے تھے۔

"نخوض" "خوض" (بروزن حوض) کے مادہ سے، اصل میں پانی میں داخل ہونے اور اس میں حرکت کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد تمام امور میں داخل ہونے اور ان میں آلودہ ہونے کے لیے بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآنِ مجید میں اکثر باطل اور بے بنیاد مطالب میں وارد ہونے کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

"باطل میں خوض" ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے، جو ان لوگوں کی مجالس میں داخل ہونے کو بھی شامل ہے، جو آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، یا بدعت کی ترویج کرتے ہیں، یا پست اور بیہودہ باتیں کرتے ہیں، یا ان گناہوں کو جنہیں انھوں نے انجام دیا ہے، فخریہ اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، اسی طرح غیبت، تہمت اور لہو و لعب وغیرہ کی مجالس میں شرکت کرنا، لیکن زیرِ بحث آیت میں زیادہ تر ان مجالس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، جو خدا کے دین کو کمزور کرنے اور اس کے مقدسات کا استہزاء اور مذاق اڑانے اور کفر و شرک د

بے دینی کی ترویج کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور ہم ہمیشہ روز جزا کا انکار کیا کرتے تھے"۔ (وکنا نکذب بیوم الدین)۔

"یہاں تک کہ ہماری موت کا وقت آپہنچا"۔ (حتّٰی اتانا الیقین)۔

یہ بات واضح ہے کہ معاد و قیامت اور حساب و جزا کے دن کا انکار تمام الٰہی اور اخلاقی قدروں کو متزلزل کر دیتا ہے اور انسان کو گناہ کے ارتکاب کی جرأت دلاتا ہے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے، خصوصاً اگر یہ مسئلہ آخر عمر تک ایک مسلسل عمل کی صورت اختیار کرلے۔

بہرحال ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اوّلاً کفار بھی، اصولِ دین کی طرح سے، فروعِ دین کے بھی مکلف ہیں اور اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ چاروں امور یعنی نماز، زکوٰۃ، اہلِ باطل کی مجالس کو ترک کرنا اور قیامت پر ایمان رکھنا، ایمان کی ہدایت اور تربیت میں حد سے زیادہ اثر رکھتے ہیں اور اس طرح سے جہنم، واقعی نمازگزاروں، زکوٰۃ دینے والوں، باطل کو ترک کرنے والوں اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کی جگہ نہیں ہے۔

البتہ نماز اس لحاظ سے کہ وہ خدا کی عبادت ہے لہٰذا وہ خدا پر ایمان کے بغیر اسے حاصل نہیں ہو سکتی، اس بناء پر اس کا ذکر، خدا پر ایمان و اعتقاد اور اس کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی ایک رمز ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں امور توحید سے شروع ہوتے ہیں اور معاد و قیامت پر ختم ہوتے ہیں اور خالق و مخلوق اور انسان کے خود اپنے آپ سے ربط کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "یقین" سے مراد یہاں موت ہے، کیونکہ یہ مومن و کافر دونوں کے لیے ایک یقینی امر شمار ہوتی ہے اور انسان ہر چیز میں شک کر سکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کر سکتا، سورۂ حجر کی آیہ ۹۹ میں بھی آیا ہے واعبد ربک حتّٰی یأتیک الیقین "اپنے خدا کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آجائے"۔

لیکن بعض نے یہاں یقین کی، انسان کی موت کے بعد، برزخ و قیامت کے مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے جو پہلی تفسیر کے ساتھ ایک جہت سے ہم آہنگ ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں اس گروہ کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "لہٰذا شفاعت کرنے والوں میں سے کسی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں دے گی" (فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین)۔

نہ تو خدا کے انبیاء، رسولوں اور آئمہ معصومین کی شفاعت اور نہ ہی فرشتوں، صدیقین، شہداء اور صالحین کی شفاعت، کیونکہ شفاعت کے لیے مناسب حالات کی ضرورت ہے اور انھوں نے تمام اسباب کو کلی طور پر ختم کر دیا ہے۔ شفاعت اس شفاف پانی کے مانند ہے، جسے کسی کمزور پودے کی جڑ پر ڈالا جائے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اگر پودا کلی طور پر مر چکا ہو تو یہ صاف ستھرا پانی اسے زندہ نہیں کر سکتا، دوسرے لفظوں میں جیسا کہ ہم شفاعت کی بحث میں بیان کر چکے ہیں، "شفاعت" شفع کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضمیمہ کرنے کے معنی میں ہے اور

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جارہی ہے اس نے راستہ کا کچھ حصہ اپنے پاؤں سے طے کیا ہے اور سخت قسم کے نشیب و فراز میں پیچھے رہ گیا ہے، شفاعت کرنے والا اس کا ضمیمہ بن کر اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ باقی راستہ طے کرلے۔[۱]

ضمنی طور پر یہ آیت، دوبارہ مسئلہ شفاعت اور بارگاہِ خداوندی میں شفاعت کرنے والوں کے تنوع اور تعدد کی تاکید کرتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اصل شفاعت کے منکر ہیں، ایک دندان شکن جواب ہے۔ اسی طرح یہ اس بات کے لیے ایک تاکید بھی ہے کہ شفاعت بے قید و شرط کے نہیں ہوگی اور گناہ کے لیے ہری جھنڈی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کی تربیت کا ایک ایسا عامل ہے جو اسے کم از کم اس مرحلہ تک پہنچا دے، کہ اس میں شفاعت کرانے کی قابلیت پیدا ہوجائے، اور خدا اور اس کے اولیاء سے اس کا رابطہ کلی طور پر منقطع نہ ہوجائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اوپر والی آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے اس قسم کے لوگوں کی شفاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ شفاعت ان کی حالت کے لیے سودمند نہیں ہوگی، لہٰذا وہ ان کی شفاعت نہیں کریں گے، کیونکہ اولیاء خدا لغو و بیہودہ کاموں کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ایک نکتہ

روزِ جزا کے شفاعت کرنے والے

زیر بحث آیات اور اسی طرح قرآنِ مجید کی بعض اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں شفاعت کرنے والے متعدد ہوں گے (اور ان کے شفاعت کا دائرہ مختلف ہوگا) ان تمام روایات سے جو شیعہ اور اہلِ سنت کے منابع سے نقل ہوئی ہیں ——— اور یہ روایات بہت زیادہ ہیں ——— معلوم ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کرنے والے قیامت کے دن ان گنہ گاروں کے لیے، جن میں شفاعت کی استعداد موجود ہے، شفاعت کریں گے۔

۱۔ سب سے پہلی شفاعت کرنے والی ہستی پیغمبر اسلامؐ کی ذاتِ مقدس ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

انا اول شافع فی الجنۃ[۲]

"جنت کے بارے میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا۔"

۲۔ تمام انبیاء قیامت کے دن شفاعت کریں گے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یشفع الانبیاء فی کل من یشھد ان لا الہ الا اللہ مخلصا فیخرجونھم منھا

---

[۱] تفسیر نمونہ جلد اول، سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں

[۲] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۳۰

"انبیاء ان تمام افراد کے بارے میں شفاعت کریں گے جو خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی وحدانیت کی گواہی دیں گے اور وہ انھیں دوزخ سے باہر نکال لیں گے"۔[1]

۲۔ فرشتے بھی روزِ محشر شفاعت کریں گے، جیسا کہ رسولِ خدا سے نقل ہوا ہے:

یؤذن للملائکة والنبیین والشهداء ان یشفعوا

"اس دن فرشتوں، انبیاء اور شہداء کو اجازت دی جائے گی کہ وہ شفاعت کریں"۔[2]

۴۔۵۔ آئمہ معصومینؑ اور ان کے شیعہ بھی شفاعت کریں گے، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

لنا شفاعة ولاهل مودتنا شفاعة

"ہمارے لیے حق شفاعت ہے اور ہمارے شیعہ اور دوستوں کے لیے بھی مقام شفاعت ہے"۔[3]

۶، ۷۔ علماء اور دانش ور اور اسی طرح شہداء راہِ خدا شفاعت کرنے والوں میں سے ہوں گے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

یشفع یوم القیامة الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء

روزِ قیامت پہلے انبیاء شفاعت کریں گے، پھر علماء اور اس کے بعد شہداء"۔[4]

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

یشفع الشهید فی سبعین انسانًا من اهل بیته

"شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر افراد تک قابلِ قبول ہو گی"۔[5]

ایک اور دوسری حدیث میں جسے مرحوم "علامہ مجلسی" نے "بحار الانوار" میں نقل کیا ہے:

"ان کی شفاعت ستر ہزار افراد کے لیے قابلِ قبول ہو گی"۔[6]

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ستر اور ستر ہزار کا عدد دونوں اعدادِ تکثیر میں سے ہیں، لہٰذا ان دونوں روایات میں کوئی منافات نہیں ہے۔

۸۔ قرآن بھی قیامت کے دن شفاعت کرے گا، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

---

[1] "مسند احمد" جلد ۳ ص ۱۲
[2] "مسند احمد" جلد ۵ ص ۴۳
[3] "خصال الصدوق" ص ۶۲۴
[4] "سنن ابی ماجہ" جلد ۲ ص ۱۴۴۳
[5] "سنن ابی داؤد" جلد ۲ ص ۱۵
[6] "بحار الانوار" جلد ۱۰۰ ص ۱۴

واعلموا انّه (القرآن) شافع ومشفع

"جان لو کہ قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور مقبول الشفاعۃ ہے"[۱]

۹۔ وہ لوگ جنھوں نے ایک عمر اسلام میں صرف کی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

اذا بلغ الرجل التسعین غفر الله ما تقدّم من ذنبه وما تأخر وشفّع فی اهله

"جب انسان نوے سال کا ہو جاتا ہے (اور ایمان کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے) تو خدا اس کے گزشتہ اور آئندہ کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے"[۲]

۱۰۔ عبادات بھی شفاعت کریں گی، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ خدا سے آیا ہے:

الصیام والقرآن یشفعان للعبد یوم القیامة

"روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندوں کی شفاعت کریں گے"[۳]

۱۱۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک اعمال بھی مثلاً وہ امانت جس کی حفاظت کرنے میں انسان نے کوشش کی ہو، قیامت میں انسان کی شفاعت کریں گے[۴]

۱۲۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود خداوندِ عالم بھی گنہ گاروں کی شفاعت کرے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ اکرمؐ سے آیا ہے:

یشفع النبیون والملائکة والمؤمنون فیقول الجبار بقیت شفاعتی

"قیامت میں انبیاء، فرشتے اور مومنین شفاعت کریں گے اور خدا کہے گا، خود میری شفاعت باقی رہ گئی ہے"[۵]

اس بارے میں روایات بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ ان کا ایک گوشہ ہے[۶]

ہم دوبارہ اس بات کو دہراتے ہیں کہ شفاعت کے کچھ شرائط و قیود ہیں، جن کے بغیر شفاعت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں یہ معنی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ مجرموں کے ایک گروہ کے بارے میں تمام شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بے اثر ہو گی۔ اہم بات یہ ہے کہ قابل میں قابلیت بھی ہو، کیونکہ فاعل کی فاعلیت اکیلی کافی نہیں ہے (ہم اس سلسلے میں مزید تشریح جلد اوّل میں شفاعت کی بحث میں پیش کر چکے ہیں)۔

---

[۱] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۷۶

[۲] "مسند احمد" جلد ۲ ص ۸۹

[۳] "مسند احمد" جلد ۲ ص ۱۷۴

[۴] "مناقب ابن شہر آشوب" جلد ۲ ص ۱۴

[۵] "صحیح بخاری" جلد ۹ ص ۱۴۹

[۶] مزید وضاحت کے لیے کتاب "مفاہیم القرآن" جلد ۴ ص ۲۸۸ تا ۲۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

۴۹۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۙ
۵۰۔ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ۙ
۵۱۔ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ۚ
۵۲۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۙ
۵۳۔ كَلَّا ۚ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۚ
۵۴۔ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۚ
۵۵۔ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۚ
۵۶۔ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۚ

ترجمہ

۴۹۔ وہ اس تذکرہ سے گریزاں کیوں ہیں ؟
۵۰۔ گویا وہ وحشت زدہ گدھے ہیں۔
۵۱۔ جو شیر سے بھاگ رہے ہیں۔
۵۲۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اس بات کا منتظر ہے (کہ خدا کی طرف سے) ایک علیحدہ خط اسے بھیجا جائے۔
۵۳۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔
۵۴۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، وہ (قرآن) تو ایک تذکر اور یاد آوری ہے۔
۵۵۔ جو شخص چاہتا ہے اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔
۵۶۔ اور کوئی شخص نصیحت نہیں لیتا مگر یہ کہ خدا چاہے وہ اہلِ تقویٰ اور اہل مغفرت ہے۔

تفسیر

حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیر سے گدھے

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گزشتہ آیات میں مجرموں اور دوزخیوں کے بارے میں آئی تھی، زیر بحث آیات میں اس معاند اور ہٹ دھرم گروہ کی حق بات سننے، اور ہر قسم کی پند و نصیحت سے وحشت کرنے کو، واضح ترین صورت میں بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: "وہ اس تذکر اور یاد آوری سے روگرداں کیوں ہیں؟" (فما لهم عن التذكرة معرضين)[1]۔

وہ قرآن جیسی شفا بخش دوا سے فرار کیوں کرتے ہیں؟ وہ ہمدرد طبیب کی بات کو رد کیوں کرتے ہیں؟ واقعاً تعجب کا کام ہے۔

"گویا وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگنے والے گدھے ہیں"۔ (كانهم حمر مستنفرة)۔

"جنھوں نے شیر یا شکاری) سے فرار کیا ہے" (فرّت من قسورة)۔

"حمر" "حمار" کی جمع ہے، گدھے کے معنی میں، البتہ یہاں شیر یا شکاری کے چنگل سے فرار کے قرینے سے، وحشی گدھا یا "گورخر" مراد ہے[2] دوسرے لفظوں میں یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو وحشی اور اہلی دونوں قسم کے گدھے کو شامل ہے۔

"قسورة" "قسر" کے مادہ سے ——— (جو قہر و غلبہ کے معنی میں ہے) ——— لیا گیا ہے، اور وہ شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور بعض نے اس کی تیر انداز یا شکاری کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

مشہور ہے کہ "وحشی گدھا" "شیر" سے عجیب و غریب وحشت رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیر کی آواز کو سنتا ہے تو اس طرح کی وحشت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ وہ دیوانہ وار ہر طرف کو بھاگتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب شیر اُن کے گلہ میں پہنچ جائے تو وہ اس طرح سے پراگندہ ہو کر ہر طرف کو دوڑتے ہیں کہ یہ نظارہ عجیب افراتفری کا عالم پیش کرتا ہے۔ (آج کل فلموں میں شیر کو جانوروں کا شکار کرتے ہوئے عام دکھایا جاتا ہے)

بہر حال یہ آیت، مشرکین کے قرآن کی روح پرور آیات سے وحشت کرنے اور ان سے فرار کرنے کی ایک بہت ہی رسا، گویا اور ناطق تعبیر ہے۔ ان کو گورخر کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس میں عقل و شعور بھی نہیں ہے اور وحشی ہونے کی بناء پر ہر چیز سے گریزاں بھی ہے، حالانکہ ان کے سامنے "تذکرہ" (یاد آوری، بیداری اور ہوشیاری کے ایک وسیلہ کے) سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

---

[1] اس جملہ میں "ما" "مبتدا" ہے اور "لھم" "خبر" اور "معرضین" "ھم" کی ضمیر کے لیے حال ہے اور "عن التذکرۃ" "جار و مجرور" "معرضین" سے متعلق ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "عن التذکرۃ" کا "معرضین" سے مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ صرف مفید قسم کی یاد آوریوں سے منہ پھیرتے ہیں، بہر حال یہاں "تذکرہ" سے مراد، ہر قسم کی مفید و سود مند یاد آوری ہے، جن کا اس درس میں قرآن مجید ہے۔

[2] "گورخر" "گور" بمعنی "صحرا" اور "خر" بمعنی (گدھا) سے مرکب ہے، اسی لیے اس کو خر وحشی اور خر صحرائی بھی کہتے ہیں۔

لیکن اس نادانی اور بے خبری کے باوجود وہ ایسے مغرور اور متکبر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ خدا کی طرف سے اسے ایک علیحدہ خط دیا جائے" (بل یرید کل امرئ منھم ان یؤتی صحفًا منشرۃ)۔[1]

یہ اس چیز کے مشابہ ہے، جو سورۂ اسراء کی آیہ ۹۲ میں آئی ہے: (ولن نؤمن لرقیک حتّٰی تنزل علینا کتابًا نقرؤہ) "اگر تو آسمان پر بھی چڑھ جائے تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ (خدا کی طرف سے) ہم پر تو کوئی خط نازل کرے، یا سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۴ کی طرح ہے جو یہ کہتی ہے: (قالوا لن نؤمن حتّٰی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ) وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ وہی چیز جو اللہ کے رسولوں پر نازل ہوتی ہے، ہمیں نہ دی جائے"۔

اور اس طرح سے ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اولوالعزم پیغمبر ہو اور خدا کی طرف سے اس کے نام کا خصوصی خط آسمان سے نازل ہو، اور اگر اس قسم کی چیز ان پر نازل ہو بھی جاتی تب بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ تو آسمان سے ایسا ایک خط نہ لے آئے جس کا عنوان یہ ہو: "خداوند رب العالمین کی طرف سے فلاں بن فلاں کے نام، اور اس میں رسمی طور پر یہ حکم دیا جائے کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں"۔[2]

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جس طرح سے وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے"۔ (کلّا)۔

ان پر آسمانی کتاب کا نازل ہونا اور اسی قسم کے دوسرے مطالب یہ سب بہانے ہیں۔

"حقیقت میں وہ آخرت سے نہیں ڈرتے" (بل لا یخافون الاٰخرۃ)۔

اگر وہ آخرت سے ڈرتے ہوتے، تو یہ سب بہانے نہ کرتے، رسولِ خدا کی تکذیب نہ کرتے، آیاتِ الٰہی کا مذاق نہ اڑاتے اور عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کو استہزاء کا ذریعہ نہ بناتے۔

اور یہاں سے تقویٰ، گناہ سے پرہیز اور انواع و اقسام کے گناہانِ کبیرہ سے پاک ہونے میں، معاد پر ایمان کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ عالمِ محشر پر ایمان اور قیامت میں جزا و سزا ملنے کا عقیدہ، انسان کو ایک نئی شخصیت عطا کرتا ہے اور بے قید و بند، متکبر، خود خواہ اور ظالم افراد کو، عہد کی پابندی کرنے والے، متقی، متواضع اور عدالت پیشہ انسان میں تبدیل کر سکتا ہے۔

---

[1] "صحف" "صحیفہ" کی جمع ہے، جو اس ورق کے معنی میں ہے، جسے اس طرف اور اُس طرف کرتے ہیں، (چونکہ "صحف" اور "صحیفہ" کا اصل مادہ چہرہ کی مانند پھیلی ہوئی چیز کے معنی میں ہے، اس لیے خط اور کتاب پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

[2] تفسیر "قرطبی" و تفسیر "مراغی" اور دوسری تفاسیر

اس کے بعد ایک مرتبہ اور تاکید کرتا ہے کہ جس طرح وہ قرآن کے بارے میں سوچتے ہیں ایسا نہیں ہے" (کلّا)۔
"یقیناً قرآن تو تذکر اور یاد آوری ہے" (انہ تذکرۃ)۔

" اور جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے" (فمن شاء ذکرہ)۔
قرآن نے راستے کی نشاندہی کر دی ہے ، اور دیکھنے والی آنکھوں کو بھی اختیار دے دیا ہے اور نورِ آفتاب بھی ہے تاکہ انسان اپنے آگے دیکھ کر چلے ۔

اس کے باوجود اس سے پند و نصیحت حاصل کرنا ، خدا کی مشیت اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے ؛ اور وہ نصیحت نہیں لیتے مگر یہ کہ خدا چاہے" (وما یذکرون الّا ان یشاء اللہ)۔
اس جملہ کی کئی تفسیریں ہیں ، ایک تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے ، یعنی انسان پروردگار کی عنایت کے دامن سے متوسل ہوئے بغیر ہدایت کی راہ کو طے نہیں کر سکتا ، اور نہ ہی اس کی توفیق و امداد کے بغیر ہدایت پا سکتا ہے ۔ ؎

تا کہ از جانبِ معشوق نباشد کششی
کوشش عاشق بے چارہ بہ جائے نہ رسد
"جب تک محبوب کی طرف سے کشش نہ ہو
بے چارے عاشق کی کوشش کچھ کام نہیں دیتی"

البتہ یہ خدائی امداد استعداد رکھنے والوں پر نازل ہوتی ہے ۔
دوسری یہ کہ : " فمن شاء ذکرہ " کا جملہ جو گزشتہ آیت میں آیا ہے ، ممکن ہے یہ توہم پیدا کرے کہ ہر چیز خود انسان کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کا ارادہ ہر لحاظ سے استقلال رکھتا ہے ، تو یہ آیت اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے کہتی ہے کہ انسان مختار و آزاد ہونے کے باوجود مشیتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے ، وہ مشیت جو سارے عالمِ ہستی اور جہان آفرینش پر حکم فرما ہے ، دوسرے لفظوں میں انسان کا یہی اختیار و آزادی بھی ، اس کی مشیت کے ساتھ ہے اور وہ جس لمحہ چاہے ، اس کو اس سے لے لے ۔
تیسری یہ کہ کہتا ہے : وہ کسی قیمت پر ایمان نہیں لائیں گے ، مگر یہ کہ خدا چاہے اور انھیں مجبور کر دے ، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کسی کو ایمان یا کفر پر مجبور نہیں کرتا ۔
البتہ پہلی اور دوسری تفسیر بہتر اور زیادہ مناسب ہے ۔
اور آیت کے آخر میں کہتا ہے : " وہ اہلِ تقویٰ اور اہلِ مغفرت ہے" (ھو اھل التقوٰی واھل المغفرۃ)۔
مناسب یہی ہے کہ اس کے عتاب سے ڈریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں ، اور یہی شائستہ بات ہے کہ اس کی مغفرت کے امیدوار رہیں ۔
حقیقت میں یہ جملہ " خوف " و " رجاء " کے مقام اور " عذاب " و " مغفرت " الٰہی کی طرف اشارہ ہے ، اور یہ حقیقت میں پہلی

آیت کے لیے ایک علت کو بیان کرتی ہے ۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا : خدا فرماتا ہے :

انا اھل ان اتقی ، ولا یشرک بی عبدی شیئًا وانا اھل ان لم یشرک بی شیئًا ان ادخلہ الجنۃ

"میں اس لائق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے اور میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے اور میں اس کا اہل ہوں کہ اگر میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے تو میں اسے جنت میں داخل کروں" ۔[1]

اگرچہ تمام مفسرین نے ——— جہاں تک ہم نے دیکھا ہے ——— "تقویٰ" کی یہاں مغفول کے معنی میں تفسیر کی ہے ، اور یہ کہا ہے کہ خدا اس کا اہل ہے کہ اس سے (اس کے شرک اور نافرمانی سے) پرہیز کریں ، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ فاعل کے معنی میں اس کی تفسیر ہو ۔ یعنی خدا اہلِ تقویٰ ہے اور وہ ہر قسم کے ظلم ، قبیح فعل اور ہر قسم کے خلافِ حکمت کام سے پرہیز کرتا ہے ، اور حقیقت میں تقویٰ کا بالاترین مقام خدا ہی کے لیے ہے ، اور بندوں میں جو کچھ ہے وہ اس غیر متناہی تقویٰ کی ایک ضعیف سی چنگاری ہے ، اگرچہ خدا کے بارے میں اسم فاعل کے معنی میں "تقویٰ" کی تعبیر بہت کم ہوتی ہے ۔

بہرحال یہ سورہ "انذار" اور "وظائف اور ذمہ داریوں" کے حکم سے شروع ہوا اور "تقویٰ" کی دعوت اور "مغفرت کے وعدے" پر ختم ہوا ، یہ وہ مقام ہے جہاں ہم انتہائی خضوع اور تضرع کے ساتھ اس کی مقدس بارگاہ میں عرض کرتے ہیں :

پروردگارا ! ہمیں تقویٰ اور اپنی مغفرت کے مستحق افراد میں قرار دے ۔

خداوندا ! جب تک تیری توفیق اور تیرا لطف ہماری دستگیری نہیں کرے گا ہم کچھ نہیں کر سکتے ، ہمیں اس عنایت کا مشمول فرما ۔

بارالٰہا ! جادہ سخت ہے اور راستہ پرپیچ و خم ہے اور شیطان گمراہ کرنے پر آمادہ ہے ، اس راستہ کو تیری مدد کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا ، ہماری مدد فرما ۔

آمین یارب العالمین

سورۂ مدثر کا اختتام ۱۹ ماہ صفر ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

پونے پانچ بجے سہ پہر بروز پیر ۱۱ صفر ۱۴۰۸ ہجری

مطابق ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۱۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور

صفدر حسین نجفی

---

[1] تفسیر برہان ، جلد ۴ ص ۴۰۵

سُورۂ قیامت

یہ سُورۂ مکّہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۴۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۱۹ر صفر ۱۴۰۷ھ

سُورۂ قیامت کے مضامین

جیسا کہ اس سورہ کے نام سے واضح ہے یہ قیامت کے دن اور معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ سوائے چند آیات کے، جو قرآنِ مجید اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور وہ مباحث جو اس سُورہ میں قیامت کے بارے میں آئے ہیں وہ مجموعی طور پر قسم پر ہیں۔

۱۔ اشراط الساعۃ (وہ عجیب و غریب اور بہت ہی ہولناک حوادث، جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے وقت رونما ہوں گے) سے مربوط مسائل۔

۲۔ اس دن نیکو کاروں اور بدکاروں کی حالت سے مربوط مسائل۔

۳۔ موت کے پُر اضطراب لمحوں اور اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال سے مربوط مسائل

۴۔ انسان کی خلقت کے مقصد سے مربوط مسائل اور اس کا مسئلہ معاد سے ربط

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من قرأ سورة القيامة شهدت انا وجبريل له يوم القيامة انه كان مؤمنا بيوم القيامة، وجاء وجهه مسفر على وجوه الخلائق يوم القيامة

"جو شخص سُورۂ قیامت کو پڑھے گا، تو میں اور جبرئیل اس کے لیے قیامت کے دن گواہی دیں گے، کہ وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتا تھا، اور اس دن اس کا چہرہ تمام لوگوں سے زیادہ درخشندہ ہوگا"[1]

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۹۳

من ادمن قرائة "لا اقسم" وكان يعمل بها، بعثها الله يوم القيامة معه فی قبره، فی احسن صورة تبشره وتضحك فی وجهه، حتی يجوز الصراط والميزان

"جو شخص سورہ "لا اقسم" (قیامت) کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا، تو خدا اس سورہ کو قیامت کے دن اس کے ہمراہ، اس کی قبر سے بہترین چہرے کے ساتھ اٹھائے گا، اور یہ مسلسل اس کو بشارت دیتی رہے گی اور اس کے سامنے ہنستی رہے گی، یہاں تک کہ وہ پل صراط اور میزان سے گزر جائے گا۔"[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں دوسرے مقامات پر جو کچھ ہم نے قرائن سے معلوم کیا تھا وہ یہاں متن روایت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: جو شخص اس کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا" اور اس پر عمل کرے گا" اس بناء پر یہ سب کچھ اس کے مضمون کا پابند ہونے اور اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۹۳

سورۂ قیامت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ○

۲۔ وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ○

۳۔ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ○

۴۔ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ○

۵۔ بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۚ○

۶۔ یَسۡـَٔلُ اَیَّانَ یَوۡمُ الۡقِیٰمَۃِ ؕ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قیامت کے دن کی قسم

۲۔ اور نفسِ لوامہ، بیدار اور ملامت کرنے والے وجدان کی قسم (کہ قیامت حق ہے)۔

۳۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔

۴۔ ہاں! ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں (کے سرے کی لکیروں) کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں۔

۵۔ (انسان قیامت کے بارے میں شک نہیں رکھتا) بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ (آزاد رہے اور) زندگی بھر گناہ کرتا رہے۔

۶۔ (اسی لیے) پوچھتا ہے کہ قیامت کب ہوگی۔

تفسیر

قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے وجدان کی قسم

یہ سورہ دو پُر معنی قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے، فرماتا ہے: "قیامت کے دن کی قسم"۔ (لا اُقسم بیوم القیامۃ)۔

"اور قسم ہے انسان کے بیدار وجدان اور ملامت کرنے والے نفس کی"۔ (ولا اقسم بالنفس اللوّامۃ)۔

اس بارے میں کہ "لا" ان دونوں آیات میں "زائدہ" اور تاکید کے لیے ہے (اس بناء پر قسم کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کی اور زیادہ تاکید کرتا ہے)۔ یا "لا" نافیہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کہے کہ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ میں اس کی قسم نہیں کھاتا، (جیسا کہ لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں، میں تیری جان کی قسم نہیں کھاتا کہ وہ قسم سے برتر ہے) مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

اکثر مفسرین نے پہلے احتمال کو انتخاب کیا ہے، جبکہ بعض دوسری تفسیر کے طرفدار ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ "لا" زائدہ ابتدائے کلام میں نہیں آتا، بلکہ اسے وسطِ کلام میں ہونا چاہیے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، کیونکہ قرآن نے قیامت سے زیادہ اہم امور مثلاً خدا کی پاک ذات کی قسم کھائی ہے، اس بناء پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں قیامت کے دن کی قسم نہ کھائی جائے اور "لا" زائدہ کے آغازِ کلام میں ہونے کی کئی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ امرء القیس کے اشعار میں آیا ہے کہ اس نے اپنے قصائد کے آغاز میں لا زائدہ کا استعمال کیا ہے[1]

لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق "لا" کے زائدہ ہونے یا نافیہ ہونے کے بارے میں بحث کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ دونوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے، اور وہ اس موضوع کی اہمیت ہے، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ان دونوں قسموں (قیامت کے دن کی قسم اور بیدار وجدان کی قسم) کے درمیان کیا رابطہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاد کے وجود کی ایک دلیل، انسان کی روح کے اندر "محکمہ وجدان" کا وجود ہے، جو نیک کام کو انجام دینے کے وقت، انسان کی روح کو خوشی اور نشاط سے پر کر دیتا ہے، اور اس طریقہ سے اسے جزا دیتا ہے اور بُرے کام کے انجام دینے یا کسی جرم کا ارتکاب کرنے کے موقع پر، اس کی روح پر سخت دباؤ ڈال کر اسے سزا دیتا ہے اور شکنجہ میں جکڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات وجدان کے عذاب سے نجات پانے کے لیے انسان خودکشی تک کا اقدام کر لیتا ہے۔

---

[1] لاوابیک ابنۃ العامر
لایدعی القوم انی افر
"اے دختر عامر تیرے باپ کی قسم ہے، قوم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھاگ جاؤں گا"۔

یعنی حقیقت میں وجدان نے اس کے قتل کرنے کا حکم صادر کیا ہے اور وہ اسے اپنے ہاتھ سے اجراء کرتا ہے۔

"نفس لوامہ" کا ردعمل اور اثر انسانوں کے وجود میں بہت ہی وسیع و عریض ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ غور و مطالعہ ہے، اور ہم نکات کی بحث میں اس کی طرف مزید اشارہ کریں گے۔

جب "عالمِ صغیر" یعنی انسان کا وجود اپنے اندر ایک چھوٹا سا محکمہ اور عدالت رکھتا ہے تو "عالمِ کبیر" اپنی اس عظمت کے باوجود، ایک عظیم محکمہ عدل کیوں نہ رکھتا ہوگا۔

اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہم "وجدان اخلاقی" کے وجود سے "قیامت اور معاد" کے وجود کی ٹوہ لگاتے ہیں اور یہیں سے ان دونوں قسموں کا ایک عمدہ رابطہ واضح ہو جاتا ہے اور دوسرے لفظوں میں دوسری قسم پہلی قسم کی ایک دلیل ہے۔

اس بارے میں کہ "نفسِ لوامہ"[1] سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک مشہور تفسیر تو وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ یعنی "اخلاقی وجدان" جو انسان کو غلط اعمال کے وقت اسی دنیا میں ملامت کرتا ہے اور تلافی و تجدید نظر پر اُسے ابھارتا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد تمام انسانوں کا قیامت میں اپنی خود ملامت کرنا ہے، مومنین اس لیے اپنے آپ کو ملامت کریں گے کہ ہم نے نیک اعمال تھوڑے کیوں کیے؟ اور کفار اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر و شرک اور گناہ کی راہ کیوں اختیار کی؟

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد صرف کافروں کا نفس ہے، جو قیامت میں ان کی، ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے بہت زیادہ ملامت اور سرزنش کرے گا۔

لیکن قبل و بعد کی آیت کے ساتھ مناسب وہی پہلی تفسیر ہی ہے۔

ہاں! یہ عدالتِ وجدان اتنی عظمت و احترام کی حامل ہے کہ خدا اس کی قسم کھا رہا ہے اور اس کو عظیم شمار کرتا ہے اور واقعاً وہ عظیم و بزرگ ہے کیونکہ وہ انسان کی نجات کا ایک اہم عامل شمار ہوتی ہے، بشرطیکہ وجدان بیدار ہو اور کثرتِ گناہ کی وجہ سے ضعیف و ناتوان نہ ہو جائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان دو پر اہمیت اور پر معنی قسموں کے بعد یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ کس چیز کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور اصطلاح کے مطابق "مقسم لہ" محذوف ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد والی آیات کے سیاق سے مطلب بالکل واضح ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیات اس طرح کا معنی دیتی ہیں "قیامت کے دن اور نفسِ لوامہ کی قسم ہے کہ تم سب قیامت میں اٹھائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا بدلہ پاؤ گے"[2]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے دن کی قسم کھائی گئی ہے جو قیامت، اور قبروں سے اٹھنے کا دن ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبروں سے اٹھنے کا مسئلہ اتنا مسلّم شمار کیا گیا ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں اس کی قسم تک کھائی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد ایک استفہام انکاری کے عنوان سے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو

---

[1] "لوامہ" مبالغہ کا صیغہ ہے، اور بہت زیادہ ملامت کرنے والے کے معنی میں ہے۔

[2] تقدیر میں "لتبعثن یوم القیامۃ" یا "انکم تبعثون" ہے۔

جمع نہیں کریں گے" (ایحسب الانسان الّن نجمع عظامہ)۔

ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں، کہ اس کی انگلیوں (کے سروں کی لکیروں) تک کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں" (بلی قادرین علیٰ ان نسوّی بنانہ)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جو پیغمبر کی ہمسائیگی میں رہتا تھا اور اس کا نام "علی بن ربیعہ" تھا، آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور اس نے روزِ قیامت کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کس طرح ہے؟ اور کب آئے گی؟ اس کے بعد اس نے مزید کہا: اگر میں اس دن کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں تو پھر بھی تیری تصدیق نہیں کروں گا اور تجھ پر ایمان نہیں لاؤں گا، کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ان ہڈیوں کو جمع کرے؟ یہ بات قابلِ یقین نہیں ہے۔

اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کو جواب دیا، لہٰذا پیغمبر نے اس ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے شخص کے بارے میں فرمایا:

اللّٰھم اکفنی شرجارِی السوء

خداوندا! اس بُرے ہمسایے کے شر کو مجھ سے دور کر[1]

اس معنی و مفہوم کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، منجملہ ان کے سورۂ یٰس کی آیہ ۷۸ میں آیا ہے کہ معاد کے منکرین میں سے ایک شخص ایک بوسیدہ ہڈی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور پیغمبر سے یہ کہہ رہا تھا (من یحی العظام وھی رمیم) ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، درآں حالانکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں"؟

ضمنی طور پر "یحسب" کی تعبیر ("حسبان" کے مادہ سے گمان کے معنی میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ منکرین اپنی کہی ہوئی بات پر ہرگز ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ صرف بے ہودہ اور بے بنیاد خیال اور گمانوں پر تکیہ کرتے تھے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ہڈیوں پر ہی کیوں تکیہ کیا ہے۔

اوّلاً تو ہڈیاں باقی اعضاء کی نسبت زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں، لہٰذا جب یہ بھی بوسیدہ اور خاک ہو جائیں اور ان کے غبار کے ذرات پراگندہ ہو جائیں تو ان کی بازگشت کی امید عمومی افراد کی نظر میں کم ہو جاتی ہے۔

ثانیاً ہڈی انسانی بدن کا اہم ترین رکن ہے کیونکہ بدن کا ہر ستون ہڈیوں سے مل کر بنتا ہے اور تمام حرکات اور گھومنا پھرنا اور بدن کی اہم کارکردگیاں ہڈیوں کے ذریعہ ہی انجام پاتی ہیں اور انسان کے بدن میں ہڈیوں کی کثرت اور مختلف اشکال اور اندازے، خدا کی خلقت کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں اور انسان کی پشت کے ایک ہی مہرے کی قدر و قیمت کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ بیکار ہو جائے اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا سارا بدن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

"بنان" لغت میں "انگلیوں" کے معنی میں بھی آتا ہے اور "انگلیوں کے سروں" (پوروں) کے معنی میں بھی، اور دونوں صورتوں میں

---

[1] اس روایت کو "مراغی" نے اور اسی طرح "روح المعانی" اور "تفسیر صافی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ایک ہی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نہ صرف ہڈیوں کو جمع کرے گا اور انھیں پہلی حالت کی طرف پلٹائے گا بلکہ انگلیوں کی چھوٹی پتلی اور باریک ہڈیوں کو بھی ان کی اپنی جگہ پر قرار دے گا، اور ان سے بھی بالاتر بات یہ ہے کہ انگلیوں کے پوروں تک کو موزوں صورت میں پہلی حالت میں پلٹا دے گا۔

یہ تعبیر ممکن ہے، انسانی پوروں کی لکیروں کی طرف، ایک لطیف اشارہ ہو، کہتے ہیں کہ بہت کم انسان روئے زمین میں ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کے پوروں کی لکیریں ایک دوسرے کے ساتھ مشتبہ ہوں یا دوسرے لفظوں میں باریک اور پیچیدہ لکیریں جو ہر انسان کے پوروں میں نقش ہوتی ہیں، اس شخص کے تعارف کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارے زمانہ میں "انگشت نگاری" (پوروں کی لکیروں کے آثار کو ضبط کرنے) کا شعبہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اس کے ذریعہ بہت سے مجرم پہچانے جاتے ہیں اور بہت سے جرموں کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک چور کمرے یا کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ دروازے کے قبضہ یا کمرے کے شیشے یا تالے اور صندوق پر رکھتا ہے تو اس کی انگلی کی لکیریں اس پر رہ جاتی ہیں، تو فوراً اس کا نمونہ حاصل کر کے، چوروں اور مجرموں کے سابقہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت کر کے، مجرم کو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں معاد کے انکار کی ایک حقیقی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ایسا نہیں ہے کہ انسان ہڈیوں کے جمع کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے پر خدا کی قدرت کے بارے میں شک رکھتا ہو، بلکہ ان کا مقصد انکار کرنے سے یہ ہے کہ وہ ساری زندگی گناہ کرتا رہے" (بل یرید الانسان لیفجر امامہ)۔

وہ چاہتا ہے کہ انکار معاد کے ذریعہ ہر قسم کی ہوس رانی ظلم و بیداد گری اور گناہ کے لیے آزادی حاصل کرے اور اس طریقہ سے جھوٹ طور سے سیر کرے، اور مخلوق خدا کے مقابلہ میں بھی اپنے لیے کسی جوابدہی کا قائل نہ ہو، کیونکہ معاد و قیامت پر ایمان رکھنا اور دادگاہ عدل الٰہی کا قائل ہونا، ہر قسم کے عصیان و گناہ کے مقابلہ میں ایک عظیم رکاوٹ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس لگام کو پکڑے اور اس بند کو توڑ دے اور آزادانہ طور پر جو عمل چاہے وہ کرتا پھرے۔

یہ بات گزشتہ زمانوں کے ساتھ ہی منحصر نہیں تھی آج بھی مادیت کی طرف میلان اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک سبب، فسق و فجور، خود سر داریوں سے گریز اور ہر قسم کے خدائی قانون کو توڑنے کے لیے آزادی حاصل کرنا ہے، ورنہ مبداء و معاد کے دلائل واضح و آشکار ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

یقدم الذنب ویؤخر التوبۃ و یقول سوف اتوب

"آیت میں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے جو گناہ کو آگے رکھتا ہے اور توبہ کو تاخیر میں ڈالتا ہے، اور کہتا ہے، میں بعد میں توبہ کروں گا۔"

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں "فجور" سے مراد "جھٹلانا" ہے، اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہے: انسان چاہتا ہے کہ معاد و قیامت کو جو اس کے سامنے ہے جھٹلائے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اور اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس لیے پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟ (یسئل ایان یوم القیامۃ)۔

ہاں! وہ ذمہ داریوں سے گریز کے لیے قیامِ قیامت کے وقت کے بارے میں، استفہام انکاری کے طور پر پوچھتا ہے، تاکہ اپنے فسق و فجور کے لیے راستہ ہموار کرے۔

اس نکتہ کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ قیامت کے وقت کے بارے میں ان کا سوال کرنا، اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ اصل قیامت کو قبول کرتے ہیں اور صرف اس کے وقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، بلکہ یہ سوال اصل قیامت کے انکار کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے ٹھیک اس طرح سے جیسا کہ کوئی کہے "فلاں شخص سفر سے آئے گا" اور جب اس کے آنے میں طول ہو اور وہ نہ آئے تو دوسرا شخص جو اس مسافر کے آنے کا منکر ہو، یہ کہتا ہے: وہ مسافر کب آئے گا؟

چند نکات

۱۔ عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغریٰ

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ روح اور نفسِ انسانی تین مراحل رکھتی ہے:

۱۔ "نفسِ امارہ" یعنی سرکش نفس، جو انسان کو ہمیشہ برائیوں اور بدیوں کی دعوت دیتا ہے اور شہوات اور فجور کو اس کے سامنے زینت بخشتا ہے، یہ وہی چیز ہے کہ جب اس ہوس باز عورت، عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے بُرے کام کے انجام کا مشاہدہ کیا تو کہا: وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء "میں ہرگز اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتی، کیونکہ سرکش نفس ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے" (یوسف ـــــ ۵۳)

۲۔ "نفسِ لوّامہ" جس کی طرف زیرِ بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے، وہ بیدار اور نسبتاً آگاہ و باخبر نفس ہے، اگرچہ اس نے گناہ کے مقابلہ میں مصونیت حاصل نہیں کی ہے لہٰذا اس سے بعض اوقات لغزش ہو جاتی ہے۔

اور وہ گناہ کر بیٹھتا ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد بیدار ہو جاتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے اور سعادت کی راہ کی طرف لوٹ آتا ہے، اس کی طرف سے انحراف کامل طور پر ممکن ہے لیکن وہ وقتی ہوتا ہے، دائمی نہیں، اس سے گناہ تو سرزد ہو جاتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں گزرنے پائی کہ وہ اپنے طور پر ملامت، سرزنش اور توبہ کا آغاز کر دیتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جسے "اخلاقی وجدان" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور بعض انسانوں میں بہت قوی اور طاقتور ہوتا ہے، بعض میں بہت ضعیف و ناتواں، لیکن اس کے باوجود یہ ہر انسان میں موجود ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کثرتِ گناہ کی وجہ سے اسے بیکار بنا دیا جائے۔

۳۔ "نفسِ مطمئنہ" یعنی تکامل و ارتقاء کو پہنچی ہوئی روح، جو اطمینان کے مرحلہ تک پہنچی ہوئی ہو، جس نے سرکش نفس کو رام کر لیا ہو اور تقوائے کامل اور احساسِ مسئولیت کے مقام پر پہنچ گئی ہو کہ اب اس کے لیے آسانی کے ساتھ لغزش کرنا ممکن نہ رہے۔

یہ وہی چیز ہے، جس کے بارے میں سورۂ والفجر کی آیہ ۲۷، ۲۸ میں فرماتا ہے: یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ——— اے نفسِ مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، جبکہ تو بھی اس سے راضی ہے اور وہ بھی تجھ سے خوش ہے"۔

بہرحال ——— جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ——— یہ "نفسِ لوّامہ" انسان میں ایک چھوٹی سی قیامت ہے اور نیک یا بد کام انجام دینے کے بعد، جان کے اندر اس کا محکمہ بلا فاصلہ قائم ہو جاتا ہے اور وہ اس کا حساب وکتاب کرتا ہے۔

اسی لیے بعض اوقات وہ ایک اچھے اور اہم کام کے مقابلہ میں ایسا اندرونی سکون محسوس کرتا ہے اور اس کی روح مسرت ونشاط سے اس طرح لبریز ہو جاتی ہے کہ جس کی لذت شان اور زیبائی کسی بیان اور قلم سے قابلِ توصیف نہیں۔

اس کے برعکس وہ بعض اوقات کسی غلطی اور عظیم جرم کے بعد ایسے وحشت ناک خواب، اور غم واندوہ کے طوفان میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اس طرح جلتا رہتا ہے کہ زندگی سے کلی طور پر سیر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس پریشانی کے چنگل سے آزاد ہونے کے لیے قاضی کو اپنا تعارف کراتے ہوئے سولی پر چڑھنے کے لیے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے۔

یہ عجیب وغریب اندرونی عدالت، قیامت کی عدالت کے ساتھ بالکل مشابہت رکھتی ہے۔

۱۔ حقیقت میں یہاں قاضی وشاہد اور حکم کا اجراء کرنے والا ایک ہی ہے جیسا کہ قیامت میں بھی اسی طرح ہے: عالم الغیب والشہادۃ انت تحکم بین عبادک: پروردگارا! تو پنہاں اور آشکار بھیدوں سے آگاہ ہے اور تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا" (زمر ——— ۴۶)

۲۔ یہ وجدانی عدالت سفارش، رشوت، پارٹی بازی اور انسانوں میں رائج سفارشی خطوں کو قبول نہیں کرتی، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی یہی آیا ہے:

واتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منہا شفاعۃ ولا یؤخذ منہا عدل ولا ہم ینصرون

"اس دن سے ڈرو جس میں کسی شخص کو کسی دوسرے کی جگہ پر سزا نہیں دی جائے گی اور نہ ہی کوئی سفارش قبول ہوگی، اور نہ ہی کوئی فدیہ ورشوت کو قبول کیا جائے گا، اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ونصرت کی جائے گی"۔

(بقرہ ——— ۴۸)

۳۔ عدالتِ وجدان: اہم ترین اور ضخیم ترین اعمال ناموں کی مختصر ترین مدت میں جانچ پڑتال کر لیتا ہے اور اپنا آخری فیصلہ بڑی تیزی کے ساتھ صادر کر دیتا ہے، نہ اس میں نئے سرے سے درخواست دینے کی ضرورت ہے نہ تجدید نظر کی، اور نہ ہی مہینوں اور سالوں تک چکر لگانے کی، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی یہی بات ہے: واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وہو سریع الحساب خدا حکم کرتا ہے، اور اس کا حکم نہ رد ہوتا ہے اور نہ ہی ٹوٹتا ہے اور اس کا حساب وکتاب بہت ہی تیز ہوگا"

(رعد ——— ۴۱)

۴۔ اس کی سزا اور کیفر کردار، اس جہان کی رسمی عدالتوں کی سزاؤں کے برخلاف، اس کے اندر شعلے اس کے دل وجان کی گہرائیوں میں

بھڑکتے ہیں اور وہاں سے باہر کی طرف سرایت کرتے ہیں، پہلے وہ انسان کی روح کو تکلیف و آزار پہنچاتے ہیں، اس کے بعد اس کے آثار جسم اور چہرہ میں اور اس کے خواب و خوراک کے دگرگوں اور تبدیل ہونے میں ظاہر و آشکار ہوتے ہیں، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی بیان ہوا ہے (نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ) خدا کی روشن کی ہوئی آگ دلوں سے شعلے نکالتی ہے"۔

(ہمزہ ——— ۶، ۷)

۵۔ اس وجدان کی عدالت کو، دیکھنے والوں اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود متہم انسان کی معلومات اور آگاہیوں کو، اس کے نفع میں، یا اس کے برخلاف "گواہیوں" کے عنوان سے قبول کرتا ہے، جیسا کہ قیامت کی عدالت میں بھی، انسان کے وجود کے ذرات، یہانتک کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے بدن کی جلد اس کے اعمال کے گواہ ہوں گے، جیسا کہ فرماتا ہے:

حتّٰی اذا ما جاءوھا شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم

"جب وہ جہنم کی آگ کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے خلاف گواہی دیں گے"۔ (حٰم السجدۃ ——— ۲۰)

ان دونوں عدالتوں کے درمیان، یہ عجیب و غریب مشابہت مسئلہ معاد کے فطری ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔ کیونکہ یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک انسان کے وجود میں تو ——— جو اس عالم ہستی کے عظیم سمندر میں ایک چھوٹا سا قطرہ ہے ——— اس قسم کا حساب و کتاب اور رموز و اسرار آمیز عدالت موجود ہو، لیکن اس عظیم عالم کے اندر بالکل کوئی حساب و کتاب، عدالت و محکمہ موجود نہ ہو، بھلا یہ چیز باور کرنے کے قابل ہے؟[1]

۲۔ قرآن مجید میں قیامت کے نام

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے معارف، اور اس کے اعتقادی مسائل کا ایک اہم حصہ، قیامت و معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان کی تربیت اور تکامل و ارتقاء کی طرف بڑھنے میں اہم ترین تاثیر رکھتے ہیں۔

قرآن میں اس عظیم دن کے لیے جو نام انتخاب کیے گئے ہیں وہ بھی بہت ہیں، جن میں سے ہر ایک اس دن کے مختلف جہات و ابعاد میں سے ایک جہت و بعد کو بیان کرتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسائل کو اکیلا ہی واضح کر دیتا ہے۔

"فیض کاشانی" کے قول کے مطابق، جو انھوں نے "محجۃ البیضاء" میں لکھا ہے، ان ناموں میں سے ہر ایک کے نیچے کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا ہے اور ہر توصیف میں کوئی نہ کوئی اہم معنی بیان ہوا ہے، لہذا کوشش سے ان معانی کا ادراک کرنا چاہیے، اور ان اسرار کو معلوم کرنا چاہیے۔

انھوں نے قیامت کے ایک سو سے زیادہ نام ذکر کیے ہیں، ان تمام کو یا ان میں سے اکثر کو قرآن مجید سے معلوم کیا جاسکتا ہے مثلاً "یوم الحسرۃ"، "یوم الندامۃ"، "یوم المحاسبۃ"، "یوم المآلۃ"، "یوم الواقعۃ"

---

[1] محکمہ وجدان کے سلسلہ مزید وضاحت کے لیے کتاب "رہبران بزرگ" (بحث وجدان) اور کتاب "معاد و عالم پس از مرگ" (بحث دلائل) کی طرف رجوع کریں۔

"یوم القارعۃ" "یوم الراجفۃ" "یوم الرادفۃ" "یوم الطلاق" "یوم الفراق" "یوم الحساب" "یوم التناد" "یوم العذاب" "یوم الفرار" "یوم الحق" "یوم الحکم" "یوم الفصل" "یوم الجمع" "یوم الدین" "یوم تبلی السرائر" "یوم لا یغنی مولی عن مولی شیئا" "یوم یفر المرء من اخیہ" "یوم لا ینفع مال ولا بنون" "ویوم التغابن" و..... [1]

لیکن اس کا زیادہ مشہور نام "یوم القیامۃ" ہی ہے جس کا قرآنِ مجید میں ستر بار ذکر ہوا ہے اور وہ بندوں کے عمومی قیام اور انسانوں کے عظیم معاد کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا بھی، انسان کو اس دنیا میں، اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قیام کی دعوت دیتا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق، خواب غفلت اور فریب سے بیدار ہونے اور سرکش نفس کو لگام دینے اور انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم ان ناموں میں غور و فکر کریں اور اس عظیم دن میں ——— جس میں ہم سب خدا کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور پردے ہٹ جائیں گے اور اندرونی بھید کھل جائیں گے اور بہشت کو مزین کیا جائے گا اور جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ اور سب کے سب میزانِ عدلِ الٰہی کے پاس حاضر ہوں گے ——— ہم اپنی حالت کو نظر میں رکھیں۔ (خداوندا! ہمیں اس دن اپنی پناہ میں جگہ دے دے)۔

---

[1] "الحجۃ البیضاء" جلد ۸ ص ۲۲۱ (مختصر طور سے)

۷۔ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝
۸۔ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝
۹۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝
۱۰۔ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ۝
۱۱۔ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝
۱۲۔ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝
۱۳۔ يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝
۱۴۔ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝
۱۵۔ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝

ترجمہ

۷۔ اس وقت آنکھیں شدت وحشت سے پھرنے لگیں گی۔
۸۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا
۹۔ اور سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔
۱۰۔ اس دن انسان کہے گا: بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟
۱۱۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، کوئی راہِ فرار اور پناہ گاہ نہیں ہے۔
۱۲۔ اصلی پناہ گاہ تو تیرے پروردگار کی طرف ہی ہے۔
۱۳۔ اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جو آگے یا پیچھے کیے ہیں، آگاہ کیا جائے گا۔
۱۴۔ بلکہ انسان تو خود اپنی حالت سے آگاہ ہے۔
۱۵۔ اگرچہ (ظاہر میں) وہ اپنے لیے عذر (اور بہانے) تراشے۔

تفسیر

انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو اس سوال پر کہ ——— جو منکرین قیامت اور معاد کے بارے میں کرتے تھے ——— ختم ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ اگر قیامت سچ ہے تو وہ کب آئے گی، زیر بحث آیات گویا اس سوال کا ایک واضح جواب ہیں۔

پہلے قیامت کے قبل کے حوادث کی طرف ——— یعنی اس انقلاب عظیم کے سلسلہ میں جو دنیا میں پیدا ہوگا، اور اس دنیا کا نظام متلاطم اور خراب ہوجائے گا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب آنکھیں خوف اور وحشت کی شدت سے گردش کر رہی ہوں گی اور مضطرب ہوں گی" (فاذا برق البصر)[1]

"اور جس وقت چاند بے نور اور منخسف ہوجائے گا" (وخسف القمر)۔

"اور جب سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہوجائیں گے (وجمع الشمس والقمر)۔

اس بارے میں کہ "چاند اور سورج" کے جمع ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف تفاسیر بیان کی ہیں۔

کبھی کہا ہے: دونوں ایک ساتھ اکٹھے ہوجائیں گے یا دونوں اکٹھے مشرق سے طلوع کر کے مغرب میں غروب ہوں گے۔

اور کبھی کہا ہے: دونوں اس صفت میں کہ اپنا نور کھو بیٹھیں گے، جمع ہوں گے[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ چاند بتدریج سورج کی قوت جاذبہ کے زیر اثر اس کے نزدیک اور انجام کار اس میں جذب ہوجائے گا اور پھر دونوں بے نور ہوجائیں گے۔

بہرحال یہاں دنیا کے آخر میں ظاہر ہونے والے انقلابوں میں سے دو اہم ترین حصوں، یعنی چاند کے بے نور ہوجانے اور سورج اور چاند کے

---

[1] "برق" "برق" کے مادہ سے (بروزن فرق) اصل میں روشنی اور اس بجلی کے معنی میں ہے جو بادلوں کے درمیان ظاہر ہوتی ہے، اس کے بعد ہر قسم کی روشنی پر اطلاق ہونے لگا، آنکھوں کا چمک مارنا، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، شدید اور اضطراب آمیز حرکت کے معنی میں ہے جو ہول اور خوف کی شدت سے ہوتی ہے، بعض اسے آنکھ کے ڈھیلے کے رک جانے اور ٹکٹکی باندھ کر ایک ہی نکتہ کی طرف نگاہ کرنے کے معنی میں ——— جو عام طور پر وحشت کی نشانی ہے ——— تفسیر کرتے ہیں اور اس معنی پر کہ آنکھ کا چمک مارنا، تحیر کے معنی میں ہے، اشعار عرب سے کچھ شواہد لائے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

[2] مرحوم "طبرسی" مجمع البیان میں فرماتے ہیں کہ جمع تین قسم کی ہوتی ہے: ایک مکان میں جمع ہونا ایک وقت میں جمع ہونا اور ایک چیز میں کئی اوصاف کا جمع ہونا۔ (مثلاً علم و سخاوت کا ایک شخص میں جمع ہونا) لیکن دو چیزوں کے ایک صفت میں اشتراک کے معنی میں جمع ہونا، مثلاً چاند اور سورج کا بے نور ہونا، ایک قسم کی مجازی تعبیر ہے (جیسے قرینہ سے معلوم ہونا چاہیے)

(مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۳۹۵)

ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہوجانے کی طرف اشارہ ہوا ہے، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی کم وبیش اشارے ہوئے ہیں، مثلاً سورۂ تکویر کی آیہ ۱ میں فرماتا ہے: " اذا الشمس کوّرت " "جس وقت سورج تاریک ہوجائے گا" اور ہم جانتے ہیں کہ چاند کا نور سورج سے ہے، تو جب سورج تاریک ہوگا تو پھر چاند بھی تاریک ہوجائے گا اور نتیجہ میں کرۂ زمین ایک وحشت ناک ظلمت اور تاریکی میں ڈوب جائے گا۔

اس طرح سے یہ دنیا ایک عظیم تحوّل اور انقلاب کے ساتھ ختم ہوجائے گی، اس کے بعد ایک دوسرے انقلاب سے (دوسرے نفخۂ صور سے جو نفخۂ حیات ہے)۔ انسانوں کا قبروں سے اٹھنا شروع ہوگا، " اور اس دن انسان کہے گا کہ فرار کی راہ کہاں ہے؟" (یقول الانسان یومئذ این المفرّ)[1]

ہاں کافر اور گنہ گار انسان، جو قیامت کے دن کی تکذیب کیا کرتے تھے، اس دن شدت حماقت اور شرم سے کوئی پناہ گاہ تلاش کریں گے اور گناہ کے بد کی سنگینی اور عذاب کے خوف سے فرار کی راہ ڈھونڈیں گے، بالکل اسی دنیا کی طرح کہ جب وہ کسی خطرناک حادثہ کا سامنا کرتے تھے تو بھاگنے کی سوچتے تھے، لہٰذا وہ اس جگہ کا بھی اس جگہ سے قیاس کریں گے۔

لیکن بہت جلد ان سے کہہ دیا جائے گا، : " ہرگز ایسا نہیں ہے، یہاں راہ فرار اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے" (کلّا لا وزر)[2]

" بلکہ سب سے اصلی قرارگاہ پروردگار کی طرف ہے" اور اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے (الیٰ ربک یومئذ المستقر)۔

اس آیت کے لیے اوپر والی تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: اس دن آخری حکم خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یا یہ کہ آخری قرارگاہ، جنت اور دوزخ میں اس کے حکم سے ہوگی۔

یا یہ کہ محاکمہ اور حساب کے لیے اسی کی بارگاہ میں ٹھہرنا ہوگا۔

لیکن بعد والی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے، وہ تفسیر جو ہم نے انتخاب کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو انسان کے ابدی تکامل وارتقاء کے راستے کو بیان کرتی ہیں اور یہ آیت ان آیات کے زمرے میں ہے جو کہتی ہیں " و الیہ المصیر " سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (تغابن ——— ۳) اور

---

[1] " مفر " " فرار " سے اسم مکان ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے، لیکن یہ احتمال یہاں بعید نظر آتا ہے۔

[2] " وزر " (بروزنِ قمر) اصل میں پہاڑی پناہ گاہ وغیرہ کے معنی میں ہے اور " وزیر " کو اس لیے " وزیر " کہتے ہیں، کہ لوگ اپنے کاموں میں اس کی پناہ لیتے ہیں بہرحال زیر بحث آیت میں ہر قسم کی پناہ گاہ کے معنی میں ہے۔

(یاایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحًا فملاقیہ) اے انسان تو سعی و کوشش اور زحمت و مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھ رہا ہے، اور تو اس سے ملاقات کرے گا" (انشقاق ـــــ ۶) و ان الی ربک المنتھٰی" اور یہ کہ سب تیرے پروردگار کی طرف پلٹ جائیں گے" (نجم ـــــ ۴۲)[1]

زیادہ واضح تعبیر میں انسان ایسے رہرو ہیں جو عدم کی سرحد سے چلے ہیں اور انھوں نے سلطنتِ وجود کا یہ سارا راستہ طے کیا ہے، اور اس سلطنتِ وجود میں بھی وہ خدا کے وجودِ مطلق اور بے پایاں ہستی کی طرف چلے جا رہے ہیں، اور اگر وہ اصل راستے اور صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہوں، تو یہ ارتقائی حرکت ابد تک جاری رہے گی اور وہ ہر روز قربِ خدا کے ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوں گے، لیکن اگر وہ اپنی راہ سے منحرف ہو جائیں تو گر کر تباہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جنھیں اس نے "مقدم" رکھا تھا یا "موخر" کیا تھا، آگاہ کیا جائے گا" (ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم واخر)۔

اس بارے میں کہ ان دونوں تعبیروں سے کیا مراد ہے؟ بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ کہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے اپنی زندگی میں آگے بھیجے ہیں، یا وہ آثار جو موت کے بعد اس سے باقی رہ گئے ہیں، چاہے وہ نیک سنت ہو یا بد، جو اس نے لوگوں میں چھوڑی ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کی نیکیاں اور برائیاں اس کو پہنچتی رہتی ہیں، یا کتاب اور تحریریں اور خیر و شر کی بنیادیں، یا نیک و بد اولاد، جن کے آثار اس تک پہنچیں گے۔

دوسری تفسیر سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے بجا لایا تھا اور وہ آخری اعمال جنھیں اس نے اپنی تمام عمر میں انجام دیئے، دوسرے لفظوں میں وہ اپنے تمام اعمال سے باخبر ہو جائے گا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے وہ مال مراد ہے جو اس نے آگے بھیجا ہے اور وہ مال جو اس نے وارثوں کے لیے چھوڑا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں، جنھیں اس نے مقدم رکھا۔ اور وہ اطاعتیں ہیں جنھیں اس نے مؤخر رکھا تھا، یا اس کے برعکس۔

لیکن سب سے مناسب پہلی تفسیر ہے، خاص طور پر جبکہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

(ینبؤ) بما قدم من خیر و شر و ما اخر من سنۃ لیس بھا من بعدہ فان کان شرًّا کان علیہ مثل وزرھم ولا ینقص من وزرھم شیئًا و ان کان خیرًا کان لہ مثل اجورھم، ولا ینقص من اجورھم شیئًا

---

[1] البتہ ان آیات کی تفسیر میں کچھ دوسرے نظریات بھی ہیں جو ہم نے انھیں آیات کے ذیل میں بیان کیے ہیں۔

"اس دن انسان کو اس خیر اور شر سے باخبر کیا جائے گا جسے اس نے مقدم رکھا تھا، یا مؤخر کیا تھا۔ ان سنتوں کے طور پر جنھیں اس نے یادگار کے طور پر چھوڑا تھا، تاکہ وہ لوگ جو اس کے بعد آئیں گے اس پر عمل کریں اور اگر وہ بُری سنت تھی تو عمل کرنے والوں کے گناہوں کے برابر اس کے گناہ میں اضافہ ہوگا اور ان کے گناہوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی، اور اگر وہ اچھی سنت تھی تو ان ہی جیسے اجر و ثواب اس کے لیے بھی ہوں گے اور ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی"[1]

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: اگرچہ خدا اور اس کے فرشتے انسان کو اس کے تمام اعمال سے آگاہ کریں گے، لیکن اس اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ انسان خود اپنی حالت سے آگاہ ہے اور اس عظیم دن میں وہ خود اور اس کے اعضاء اس کی گواہی دیں گے": (بل الانسان علیٰ نفسه بصیرة)۔

"چاہے وہ ظاہر میں اپنے لیے کتنے ہی عذر تراشتا رہے" (ولو القیٰ معاذیره)۔

یہ آیات حقیقت میں وہی چیز بیان کر رہی ہیں جو قرآن کی دوسری آیات میں، انسان کے اعمال پر اس کے اعضاء کی گواہی کے بارے میں آیا ہے، مثلاً سورۂ حٰم سجدہ کی آیہ ۲۰ میں آیا ہے: (شهد علیهم سمعهم وابصارهم وجلودهم بما کانوا یعملون) "ان کے کان اور آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے اعمال کی گواہی دیں گے" اور سورۂ یٰس کی آیہ ۶۵ میں آیا ہے (وتکلمنا ایدیهم وتشهد ارجلهم بما کانوا یکسبون) "ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے، اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی جنھیں وہ انجام دیتے تھے گواہی دیں گے"

اس بناء پر قیامت کی اس عظیم عدالت میں انسان کے اعمال کا بہترین گواہ وہ خود ہی ہے، کیونکہ وہ اپنی حالت سے سب سے زیادہ آگاہ ہے۔ اگرچہ خدا نے اتمام حجت کے طور پر بہت سے دوسرے گواہ بھی اس کے لیے تیار کیے ہیں۔

"بصیرة" مصدری معنی بھی رکھتا ہے (بینائی و آگاہی) اور وصفی معنی بھی (آگاہ شخص) اس لیے بعض نے اس کی "حجت" "دلیل اور برہان کے معنی میں جو آگاہی بخش ہوتی ہے تفسیر کی ہے۔

"معاذیر" "معذرت" کی جمع ہے، جو اصل میں ایسی چیز کے پیدا کرنے کے معنی میں ہے، جو گناہ کے آثار کو ختم کر دے، جو کبھی تو واقعی عذر ہوتا ہے اور کبھی ظاہری، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "معاذیر" "معذار" کی جمع ہے، جو پردہ اور پوشش کے معنی میں ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوتا ہے۔ انسان اپنے اوپر آگاہی رکھتا ہے، چاہے وہ اپنے اعمال پر کتنے ہی پردے ڈالے اور اپنے کاموں کو

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۰۶۔ اسی حدیث کے مانند تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۸۹۱ میں بھی آیا ہے۔

[2] پہلے احتمال کی بناء پر اس کی "تاء" "مصدری" ہے اور دوسرے احتمال کی بناء پر "تاء تانیث" ہے کیونکہ انسان یہاں "اعضاء و جوارح" کے معنی میں ہے یا "نفس" کے معنی میں ہے جو تانیث مجازی ہے اور بعض اسے "تاء مبالغہ" سمجھتے ہیں، جو انسان کی اپنے بارے میں شدت آگاہی کی خبر دیتی ہے۔

پوشیدہ رکھے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہرحال اس عظیم دن حساب وجزا پر حاکم وہ ہستی ہے جو ظاہر و باطن کے بھیدوں سے آگاہ ہے اور خود انسان کو بھی اس کے اعمال پر حساب کرنے والا قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیہ ۱۴ میں آیا ہے: اقرأ کتابك کفٰی بنفسك الیوم علیك حسیبًا" اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ، آج تو اپنے حساب کے لیے خود بھی کافی ہے۔

اگرچہ زیر بحث آیات سب کی سب معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن ان کا مفہوم وسیع ہے، اس دنیا کو بھی شامل ہے یہاں بھی لوگ اپنے حال سے آگاہ ہیں، اگرچہ کچھ لوگ جھوٹ موٹ اسے پس پشت ڈال کر، ظاہر سازی اور ریاکاری سے اپنے حقیقی چہرے کو چھپا لیتے ہیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

مایصنع احدکم ان یظهر حسنًا و یسر سیّئًا الیس اذا رجع الی نفسه یعلم انه لیس کذٰلك، والله سبحانه یقول: بل الانسان علی نفسه بصیرة، ان السریرة اذا صلحت قویت العلانیة۔

"جب تم میں سے کوئی شخص اپنے ظاہر کو آراستہ کرے، لیکن پوشیدہ طور پر بدکار ہو تو وہ کیا کر سکتا ہے کیا جب وہ اپنے نفس کی طرف لوٹتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا نہیں ہے؟ جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: بلکہ اپنی حالت سے آگاہ ہے جب انسان کا باطن صالح اور درست ہو جائے تو اس کے ظاہر کو بھی تقویت پہنچتی ہے"[1]

بیمار کے روزہ کی احادیث میں بھی آیا ہے کہ امام صادقؑ کے ایک صحابی نے آپ سے سوال کیا ماحد المرض الذی یفطر صاحبه؟ اس بیماری کا معیار کیا ہے جس سے افطار جائز ہو جاتا ہے تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

"بل الانسان علی نفسه بصیرة، هو اعلم بما یطیق"

انسان اپنی حالت پر سب سے زیادہ آگاہ ہے اور وہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس میں کس قدر توانائی ہے[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۹۶

[2] وہی مدرک (اس حدیث کو مرحوم صدوق نے "من لا یحضر" کی کتاب صیام میں بھی نقل کیا ہے۔ جلد ۲ ص ۱۳۲۔ باب حد المرض الذی یفطر صاحبه حدیث ۱۹۴۱

۱۶۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝
۱۷۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝
۱۸۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝
۱۹۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

ترجمہ

۱۶۔ اس قرآن کو پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دے۔
۱۷۔ کیونکہ اس کو جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔
۱۸۔ اور جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس کی پیروی کر۔
۱۹۔ پھر اس کو بیان کرنا (اور اس کی وضاحت کرنا بھی) ہمارے ہی ذمہ ہے۔

تفسیر

قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے

یہ آیات حقیقت میں جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں، جسے گفتگو کرنے والا اپنی گفتگو کے درمیان میں لاتا ہے، مثلاً کوئی شخص تقریر کر رہا ہے اور وہ یہ دیکھتا ہے کہ مجلس کا آخری حصہ لوگوں سے پُر ہو گیا ہے جبکہ اس کا اگلا حصہ خالی ہے تو وہ وقتی طور پر اپنی تقریر روک کر حاضرین کو آگے آنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے جگہ کھلی ہو جائے اور پھر اپنی تقریر کو شروع کر دیتا ہے یا کوئی استاد درس کے دوران اپنے کسی شاگرد کو غافل دیکھتا ہے تو وہ اپنی گفتگو کو توڑ کر اسے تنبیہ کرتا ہے اور پھر درس کو جاری کر دیتا ہے۔

اگر کوئی بے خبر آدمی اس تقریر یا درس کو ٹیپ سے سنے تو ممکن ہے وہ اشتباہ میں پڑ جائے اور ان جملوں کے قبل و بعد کے جملوں سے غیر مربوط ہونے پر تعجب کرے، لیکن مجلس کے مخصوص حالات میں دقت اور غور کرنے سے ان معترضہ جملوں کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس سادہ سے مقدمہ کی طرف توجہ کرنے کے بعد ہم زیر بحث آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں

خدا نے قیامت، مومنین اور کفار کے حالات کے بارے میں جو سلسلہ گفتگو تھا، اسے وقتی طور پر چھوڑ دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو قرآن کے بارے میں، ایک مختصر سی یاد دہانی کراتا ہے، اور فرماتا ہے: "اپنی زبان کو اس کے پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے حرکت نہ دے" (لا تحرك به لسانك لتعجل به)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے اور مجموعی طور پر اس کے لیے تین تفاسیر بیان کی گئی ہیں ۔

پہلی تفسیر تو وہی معروف تفسیر ہے جو ابن عباس سے کتب حدیث و تفسیر میں بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اس شدید عشق اور لگاؤ کی بنا پر، جو آپ قرآن کو حاصل کرنے اور اسے حفظ کرنے کے بارے میں رکھتے تھے، جب وحی لانے والا فرشتہ آپ کے سامنے قرآنی آیات کو پڑھتا تھا، تو آپ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو حرکت دیتے تھے اور جلدی کرتے تھے، خدا نے آپ کو منع کیا کہ یہ کام نہ کیجیے ہم خود اسے تیرے لیے جمع کر رہے ہیں ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ: قرآن کے دو نزول ہیں: "نزولِ دفعی" یعنی وہ سارا کا سارا یکجائی طور پر "شب قدر" میں پیغمبرؐ کے پاک دل پر نازل ہوا اور "نزول تدریجی" جو ۲۳ سال کے عرصہ میں صورت پذیر ہوا، پیغمبرؐ اس جلدی کی بناء پر جو انھیں دعوت کی تبلیغ کے بارے میں تھی، بعض اوقات نزول تدریجی سے پہلے یا اس کے ہمراہ آیات کی تلاوت کرتے تھے، تو انھیں حکم دیا گیا کہ یہ کام نہ کریں اور ہر آیت کی اپنے موقع پر ہی تلاوت اور تبلیغ کریں ۔

اس طرح سے اس آیت کا مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۱۴ کے مانند ہے ۔ (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضٰی الیک وحیہ)۔ "وحی کے مکمل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کرو"۔

یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی زیادہ فرق نہیں رکھتیں اور مجموعی طور پر ان کی بازگشت اس معنی کی طرف ہے کہ پیغمبر کو وحی کے حاصل کرنے کے لیے بھی عجلت، اور جلد بازی نہیں کرنا چاہیے ۔

تیسری تفسیر جس کے طرفدار بہت ہی کم ہیں، یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب، قیامت میں گنہگار ہیں، جنھیں حکم دیا جائے گا کہ اپنے نامۂ اعمال کو پڑھیں اور اپنا حساب خود کریں اور انھیں کہا جائے گا کہ اس کے پڑھنے میں جلدی نہ کریں، یہ فطری بات ہے کہ وہ اپنا نامۂ اعمال پڑھتے وقت جب اپنی "برائیوں" تک پہنچیں گے تو پریشان ہو جائیں گے اور ان سے جلدی کے ساتھ گزر جانا چاہیں گے تو یہ حکم انھیں دیا جائے گا اور انھیں جلد بازی سے روکا جائے گا اور ان کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ جس وقت خدا کے فرشتے ان کے اعمال نامے پڑھیں تو وہ ان کی پیروی کریں

اس تفسیر کے مطابق، یہ آیات جملہ معترضہ کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ یہ گزشتہ اور آئندہ کی آیات کے ساتھ مربوط ہیں اور سب کی سب ایک دوسرے کے ساتھ ربط رکھتی ہیں، کیونکہ یہ سب ہی قیامت و معاد کے حالات کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن پہلی اور دوسری تفسیر کے مطابق ——— جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ——— یہ آیات جنبۂ معترضہ رکھتی ہیں ۔

لیکن بہرحال تیسری تفسیر ——— خصوصاً قرآن کے نام کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو بعد کی آیات میں آیا ہے ——— بہت بعید نظر آتی ہے اور اصولی طور پر آیات کا لب و لہجہ بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گزشتہ دو تفسیروں میں سے کوئی سی ایک مراد ہے اور ان دونوں کے جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے اگرچہ بعد والی آیات کا لب و لہجہ پہلی تفسیر یعنی مشہور تفسیر کے موافق ہے (غور کیجیے)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے"۔ (ان علینا جمعہ وقرآنہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تو پریشان نہ ہو، ہم اس کی آیات کو جمع بھی کریں گے اور وحی لانے والے فرشتے کے ذریعہ تیرے سامنے پڑھیں گے بھی۔

"اور جب ہم اسے پڑھ چکیں پھر تو اس کی پیروی کر اور اسے پڑھ" (فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ)۔

"پھر اس کو بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے" (ثم ان علینا بیانہ)۔

اس بناء پر قرآن کا جمع کرنا، اور اس کی تیرے سامنے تلاوت کرنا اور اس کے معانی کی توضیح و تفصیل بتانا، یہ تینوں امور ہمارے ذمہ ہیں۔ لہذا تو کسی طرح بھی اس سلسلہ میں پریشان نہ ہو، جس ہستی نے اس وحی کو نازل کیا ہے، وہی تمام مراحل میں اس کا محافظ ہے تیری ذمہ داری تو صرف ایک طرف تو وحی لانے والے فرشتے کی تلاوت کی پیروی کرنا ہے اور دوسری طرف عامۃ الناس کو اس رسالت کی تبلیغ کرنا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جمع کرنے سے مراد وحی کی زبان میں جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ پیغمبر کے سینہ میں جمع کرنا اور آنحضرتؐ کی زبان سے اس کی تلاوت ہے، یعنی جلدی نہ کرو۔ ہم ان تمام آیات کو تیرے سینہ میں جمع کر دیں گے اور پھر اس کی قرأت تیری زبان پر جاری کریں گے۔

بہرحال یہ تمام تعبیریں پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ جبرئیل کے ذریعہ نزولِ وحی کے وقت، ہمیشہ جلدی کرتے تھے کہ آیات کو جلدی کے ساتھ تکرار کریں کہ کہیں ان کے حافظہ سے نکل نہ جائیں اور اس موقع پر خدا کی طرف سے انھیں یہ بتایا گیا کہ آپ مطمئن رہیں کہ نہ صرف آیات کے جمع کرنے اور ان کے پڑھنے بلکہ ان کے معانی کی توضیح و تشریح کی بھی، خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے

ضمنی طور پر یہ آیات قرآن کی اصالت اور اس کی ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے حفاظت کو بیان کرتی ہیں، کیونکہ خدا نے اس کے جمع کرنے اس کی تلاوت کرنے اور اس کی معانی کی وضاحت و تشریح کرنے کا وعدہ دیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ان آیات کے نزول کے بعد، جب جبرئیل آپ پر نازل ہوتے تو آپ مکمل طور سے سکوت اختیار کرتے اور جب جبرئیل چلے جاتے، تو پھر آپ آیات کی تلاوت شروع کرتے [1]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۹۷

۲۰۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝
۲۱۔ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝
۲۲۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝
۲۳۔ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝
۲۴۔ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝
۲۵۔ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝

ترجمہ

۲۰۔ جیسا کہ تم خیال کرتے ہو ایسا نہیں ہے (تم معاد کے دلائل کو مخفی شمار کرتے ہو) بلکہ تم جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو (اور بے قید و شرط کی ہوس رانی کو چاہتے ہو)۔
۲۱۔ اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔
۲۲۔ اس دن کچھ چہرے تو شاداب و مسرور ہوں گے۔
۲۳۔ اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔
۲۴۔ اور اس دن کچھ چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔
۲۵۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں ایسا عذاب انجام پائے گا، جو کمر کو توڑ کر رکھ دے گا۔

تفسیر

میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے، اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے

ان آیات میں پھر دوبارہ معاد و قیامت سے مربوط مباحث کو شروع کرتا ہے قیامت کی کچھ خصوصیات اسی طرح معاد کے انکار کے علل و اسباب کو بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: اس طرح نہیں ہے کہ معاد و قیامت کے دلائل مخفی ہوں اور تم اس کی حقانیت تک

نہ پہنچ سکتے ہو، "بلکہ تم اس جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو" (کلّا بل تحبون العاجلة)۔

"اور اسی بناء پر تم آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو" (و تذرون الآخرة)۔

معاد کے انکار کی اصلی وجہ، خدا کی قدرت "بوسیدہ ہڈیوں" کو جمع کرنے اور پراگندہ مٹی کو اکٹھا کرنے میں شک اور تردد نہیں ہے بلکہ دنیا اور سرکش شہوات اور ہوس رانیوں کے ساتھ تمھارا شدید لگاؤ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ تم ہر قسم کے موانع اور رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا دو، اور چونکہ معاد اور خدا کے امر و نہی کو قبول کر لینا اس راستے میں بہت سے موانع اور رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے اس لیے یہ لوگ اصل مطلب کے انکار کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آخرت کو کلی طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ مادیت کی طرف جھکاؤ اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک اہم سبب، شہوات و لذات اور ہر قسم کے گناہ کے مقابلہ میں بے قید و شرط آزادی حاصل کرنا ہے، نہ صرف گزشتہ زمانہ میں بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ معنیٰ زیادہ واضح اور آشکار صورت میں صادق آتا ہے۔

یہ دونوں آیات حقیقت میں اسی چیز کی ایک تاکید ہے جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، جس میں فرمایا تھا: بل یرید الانسان لیفجر امامه۔ یسئل ایان یوم القیامة [1]

اس کے بعد اس دن میں نیکوکار مومنین اور بدکار کفار کی حالت کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "اس دن کچھ صورتیں ہنسی خوشی اور نورانی و خوبصورت ہوں گی" (وجوه یومئذ ناضرة)۔

"ناضرة" "نضرة" کے مادہ سے ایک خاص قسم کی خوشی کے معنی میں ہے جو وفورِ نعمت اور مرفہ حالی کی وجہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہے جس میں سرور و زیبائی اور نورانیت ہوتی ہے، یعنی ان کے رخسار کا رنگ ان کی حالت کی خبر دیتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں میں کس طرح سے غرق ہیں، حقیقت میں یہ اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ مطففین کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے: تعرف فی وجوههم نضرة النعیم ——— "تم ان (بہشتیوں) کے چہروں پر نعمت کی شادابی کو مشاہدہ کرو گے"۔

یہ تو مادی جزاؤں کے لحاظ سے ہے، لیکن ان کی روحانی جزاؤں کے بارے میں فرماتا ہے "وہ صرف اپنے پروردگار کی پاک ذات کی طرف دیکھیں گے" (الی ربها ناظرة)۔

دل کی آنکھ اور شہودِ باطنی کا دیدار، وہ دیدار جس سے وہ اس بے مثال ذات اور اس کمال و جمال مطلق کے مجذوب بن جائیں گے اور ایک

---

[1] بعض نے اوپر والی آیات میں "کلّا" کو ان کے قرآن مجید میں تدبر کرنے کی نفی میں سمجھا ہے لیکن یہ تفسیر صحیح نہیں ہے، کیونکہ ——— جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ——— قرآن سے مربوط آیات میں مخاطب پیغمبر ہیں اور وہ جنبہ معترضہ رکھتی ہیں، لیکن زیر بحث آیات کا قیامت کے سلسلہ میں ایک تسلسل ہے۔

روحانی اور ناقابلِ بیان لذت انھیں حاصل ہوگی، جس کا ایک ایک لمحہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے برتر و بالاتر ہے۔

اس بات پر توجہ رہے کہ "الیٰ ربھا" کا "ناظرۃ" پر مقدم ہونا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی اسی کی طرف دیکھیں گے، نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بہشتی یقینی طور پر اس کے غیر کی طرف بھی نگاہ کریں گے تو ہم کہتے ہیں: اگر وہ اس کے غیر کی طرف نگاہ کریں گے تو ان سب کو اس کے آثار میں سے سمجھیں گے اور اثر کی طرف نگاہ کرنا مؤثر کی طرف نگاہ کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ہر جگہ اسی کو دیکھیں گے اور ہر چیز میں اسی کی قدرت اور جمال و کمال کا مشاہدہ کریں گے، لہٰذا جنت کی نعمتوں کی طرف توجہ بھی انھیں خدا کی ذات کی طرف نظر کرنے سے غافل نہیں کرے گی۔

اسی وجہ سے بعض روایات میں ——— جو اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں ——— آیا ہے کہ: وہ خدا کی رحمت، اس کی نعمت اور اس کے ثواب کی طرف نظر کریں گے"۔[1] کیونکہ ان چیزوں کی طرف دیکھنا بھی، اس ذاتِ مقدس کی طرف ہی دیکھنا ہے۔

بعض بے خبروں نے اوپر والی آیت کو قیامت میں خدا کے حسی مشاہدہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس دن خدا کو اسی ظاہری آنکھ کے ساتھ دیکھیں گے۔

حالانکہ اس قسم کے مشاہدہ کا لازمہ، خدا کا جسمانی ہونا، اور کسی خاص مکان، کیفیت اور حالتِ جسمانی میں ہونا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی پاک ذات ان آلودگیوں سے منزہ ہے، جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بارہا اس پر تکیہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار: "اس کو آنکھیں نہیں دیکھتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے"۔ یہ آیت مطلق ہے اور دنیا کے ساتھ کسی قسم کا اختصاص نہیں رکھتی۔

بہرحال خدا کے حسی مشاہدہ کا نہ ہونا، اس سے کہیں زیادہ واضح ہے کہ ہم اس پر مزید بحث کرنا چاہیں، جو شخص قرآن اور معارفِ اسلامی سے معمولی سی بھی آشنائی رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا۔

بعض نے "ناظرۃ" کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ "انتظار" کے مادہ سے ہے۔ یعنی اس دن مومنین صرف خدا کی ذات پاک سے توقع رکھتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال پر بھی تکیہ نہیں کریں گے۔ اور ہمیشہ اس کی رحمت اور نعمت کے منتظر رہیں گے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس انتظار میں ایک قسم کی پریشانی آمیختہ ہوگی حالانکہ وہاں مومنین کے لیے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

تو وہ جواب میں یہ کہتے ہیں: اس انتظار میں پریشانی ہوتی ہے جس کے انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو، لیکن جب اطمینان حاصل ہو، تو پھر ایسا انتظار آرام و سکون کے ساتھ آمیختہ ہوتا ہے[2]

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۶۴، ۴۶۵

[2] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "نظر" جو انتظار کے معنی میں ہے وہ "الیٰ" کے ساتھ متعدی نہیں ہوتا، بلکہ وہ حرفِ جر کے بغیر متعدی ہوگا، لیکن اشعارِ عرب میں سے کچھ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "نظر" جو انتظار کے معنی میں ہے وہ "الیٰ" کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"نظر کرنے" اور "انتظار کرنے" کے معنی کے درمیان جمع کرنا بھی بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ کا استعمال متعدد معانی میں جائز ہے لیکن اگر بناء یہ ہو کہ ان دو معانی میں سے صرف ایک ہی مراد ہو تو ترجیح پہلے معنی کو ہے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرمؐ کی ایک پُرمعنی حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"اذا دخل اهل الجنة الجنة يقول الله تعالى تريدون شيئًا ازيدكم؟
فيقولون الم تبيض وجوهنا؟ الم تدخلنا الجنة و تنجينا من النار؟
قال فيكشف الله تعالى الحجاب فما اعطوا شيئًا احب اليهم من النظر الى ربهم!"

"جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو خداوندِ عالم فرمائے گا، کیا تم کوئی اور چیز چاہتے ہو جس کا میں تمہارے لیے اضافہ کروں؟

وہ کہیں گے: (پروردگارا! تو نے ہمیں سب کچھ دیا ہے) کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور جہنم سے رہائی نہیں بخشی؟

اس وقت تمام پردے ہٹ جائیں گے (اور وہ خدا کا چشم دل سے مشاہدہ کریں گے) اور اس حالت میں ان کے نزدیک کوئی چیز اپنے پروردگار کی طرف نگاہ کرنے سے زیادہ محبوب نہیں ہوگی"[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں "انس بن مالک" کے واسطہ سے آنحضرتؐ سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ينظرون الى ربهم بلاكيفية ولاحد محدود ولاصفة معلومة:

"وہ اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، لیکن کسی کیفیت کو نہیں اور نہ ہی کسی محدود حد اور مشخص صفت کو"[2]

اور یہ حدیث شہودِ باطنی پر ایک تاکید ہے، نہ کہ آنکھ سے مشاہدہ کرنے پر۔

"مومنین کے اس گروہ کے مقابل میں ایک ایسا گروہ بھی ہوگا جن کے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے" (و وجوه يومئذ باسرة)۔

"باسرة" "بسر" (بروزن نصر) کے مادہ سے، ناپختہ چیز اور وعدہ سے پہلے کام کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے کھجور کے کچے پھل کو "بسر" (بروزن عسر) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چہرے کے بگڑنے اور ترشرو ہونے پر بولا جانے لگا، کیونکہ یہ وہ عکس العمل ہے، جس کا انسان رنج، تکلیف اور پریشانی کے آنے سے پہلے اظہار کرتا ہے۔

بہرحال جس وقت وہ لوگ عذاب کی نشانیوں کو دیکھیں گے اور اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے خالی اور برائیوں سے بھرا ہوا پائیں گے تو سخت پریشان، رنجیدہ اور غمگین ہوں گے اور منہ چڑھالیں گے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۹۸، اور تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۹۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

[1] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۴۵

[2] "تفسیر المیزان" جلد ۲۰ ص ۲۰۴

انھیں معلوم ہے کہ وہ سخت عذاب جوان کی کمر کو توڑ ڈالے گا ان پر واقع ہو کر رہے گا (تظن ان یفعل بھا فاقرۃ)۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں "ظن" علم کے معنی میں ہے یعنی انھیں اس قسم کے عذاب کے بارے میں یقین ہو جائے گا جبکہ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں "ظن" اپنے اصلی معنی یعنی گمان میں ہے البتہ وہ اجمالی طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں عذاب ہوگا، البتہ اس قسم کے کمر توڑ عذاب کے بارے میں وہ گمان کرتے ہیں[1]

"فاقرۃ" "فقرۃ (بروزن ضربۃ) کے مادہ سے ہے اور اس کی جمع فقار ہے جو پشت کے مہروں کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "فاقرہ" اس سنگین حادثہ کو کہتے ہیں جو کمر کے مہروں کو توڑ دیتا ہے اور "فقیر" کو اس وجہ سے فقیر کہا گیا ہے کہ گویا اس کی کمر ٹوٹی ہوئی ہے[2]

بہرحال یہ تعبیر ان سنگین اور سخت سزاؤں سے کنایہ ہے جو دوزخ میں اس گروہ کے انتظار میں ہیں، یہ گروہ کمر شکن عذابوں کا منتظر ہے جبکہ سابقہ گروہ پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہے اور محبوب کی ملاقات کے لیے آمادہ ہے۔ ان کے لیے بدترین عذاب ہے اور ان کے لیے بدترین جسمانی رحمت، نعمت اور روحانی لذت ہے۔

---

[1] منجملہ ان شواہد کے جو اس موضوع کے سلسلہ میں انھوں نے نقل کیے ہیں، یہ ہے کہ اگر "ظن" علم کے معنی میں ہو تو اس کے بعد جو "ان" ہے اسے "مثقلہ" نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ مخففہ ہونا چاہیے، حالانکہ زیر بحث آیت میں "ان" مصدریہ ہے اور اس میں قرینہ یہ ہے کہ اس نے نصب دی ہے۔

[2] "فاقرۃ" ایک محذوف موصوف کی صفت ہے اور تقدیر میں "داھیۃ فاقرہ" ہے اور "تظن" فعل ہے جس کا فاعل "وجوہ" ہے اور تقدیر میں "ارباب الوجوہ" یا "ذوات الوجوہ" ہے۔

۲۶۔ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ
۲۷۔ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۙ
۲۸۔ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ
۲۹۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ
۳۰۔ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمَسَاقُ ؕ

ترجمہ

۲۶۔ اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان گلے تک نہ پہنچے، وہ ایمان نہیں لائے گا۔
۲۷۔ اور یہ کہا جائے گا: کیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دے؟!
۲۸۔ اور دنیا سے فراق کا یقین پیدا کرے۔
۲۹۔ اور پاؤں کی پنڈلیاں (جان کنی کی شدت سے) ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں۔
۳۰۔ (ہاں) اس دن سب کا راستہ تیرے پروردگار (کی دادگاہ) کی طرف ہی ہوگا۔

تفسیر

دوسرے عالم اور مومنین و کفار کی سرنوشت سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں، موت کے دردناک لمحہ کے بارے میں گفتگو ہے جو دوسرے جہان کا ایک دریچہ ہے۔

فرماتا ہے: "اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان اس کے گلے تک نہ پہنچ جائے، وہ ایمان نہیں لائے گا" (كلّا اذا بلغت التراقی)۔[1]

اس دن اس کی برزخی آنکھ کھل جائے گی، حجاب اور پردے ہٹ جائیں گے اور وہ عذاب و کیفر کردار کی نشانیاں دیکھیں گے اور اپنے اعمال سے واقف ہو جائیں گے اور اس لمحہ میں وہ ایمان لے آئیں گے لیکن وہ ایسا ایمان ہوگا جو ان کی حالت کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

---

[1] یہاں "اذا" شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "اذا بلغت التراقی انکشف له حقیقة الامر و وجد ما عمله ضنًا" بلغت "کا فاعل" نفس "ہے جو محذوف ہے اور قرینہ کلام سے معلوم ہو جاتا ہے۔

" تراقی "" ترقوہ " کی جمع ہے جو حلق اور گلے کے گرد کی ہڈیوں کے معنی میں ہے اور روح کا گلے تک پہنچنا، عمر کے آخری لمحوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس وقت روح بدن سے نکلتی ہے تو وہ اعضاء جو دل سے زیادہ فاصلہ رکھتے ہیں (مثلاً ہاتھ پاؤں) وہ جلدی بیکار ہوجاتے ہیں، گویا روح خود کو بدن سے تدریجاً سمیٹتی ہے۔ یہاں تک کہ گلے تک پہنچ جاتی ہے۔

اس موقع پر اس کے اردگرد کے لوگ سراسیما اور پریشان ہوجاتے ہیں اور اس کی نجات کی تدبیریں کرتے ہیں" اور یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی ہے جو آکر اس بیمار کو نجات دے" (وقیل من راق)۔

یہ بات عجز، ناامیدی اور بے چارگی کی بناء پر کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اب کام بس سے باہر ہوگیا ہے۔ اور طبیب سے بھی اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

" راق "" رقی " (بروزن نہی) کے مادہ سے اور" رقیہ " (بروزن خفیہ) " اوپر جانے" کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ " رقیہ " ان اوراد اور دعاؤں پر بولا جاتا ہے جو بیمار کے لیے موجب نجات ہیں، خود طبیب کو بھی اسی وجہ سے کہ وہ بیمار کو رہائی بخشتا ہے اور اسے نجات دیتا ہے" راقی " کہا جاتا ہے، اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ مریض کے اردگرد کے لوگ اور کبھی وہ خود تکلیف کی شدت کی وجہ سے پکارتا ہے، کیا کوئی طبیب مل جائے گا؟ کیا کوئی ہے جو دعا پڑھے اور بیمار رہائی پائے۔؟

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے، کہ فرشتوں میں سے کون اس کی روح کو قبض کرے گا اور اوپر لے جائے گا؟ کیا عذاب کے فرشتے، یا رحمت کے فرشتے؟

اور بعض نے یہ اضافہ کیا ہے کہ چونکہ خدائی فرشتے اس قسم کے بے ایمان انسان کی روح کو قبض کرنا اور اوپر لے جانا پسند نہیں کرتے، تو ملک الموت کہتا ہے، کون ہے جو اس کی روح کو اوپر لے کر جائے؟

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعد والی آیت میں" محتضر" کی مکمل مایوسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:" اس حالت میں وہ زندگی سے مطلق طور پر مایوس ہوجائیگا اور اسے دنیا کے فراق اور جدائی کا یقین ہوجائے گا" (وظن انہ الفراق)۔

" اور پاؤں کی پنڈلیاں ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں گی اور موت کا لمحہ آن پہنچے گا" (والتفت الساق بالساق)۔

ان کا ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھانا یا تو جان کنی کی تکلیف کی شدت کی وجہ سے ہوگا، یا ہاتھ پاؤں کے بیکار ہوجانے اور ان سے روح کے نکل جانے کے نتیجہ میں ہوگا۔

اس آیت کے لیے اور تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے۔

التفت الدنیا بالاٰخرۃ

"دنیا آخرت کے ساتھ لپیٹ دی جائے گی"[1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔[2]

ابن عباس سے بھی یہی نقل ہوا ہے کہ اس سے مراد امرِ آخرت کی شدت میں امرِ دنیا سے مل جانا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد موت کے شدائد کا قیامت کے شدائد کے ساتھ مل جاتا ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ سب تفاسیر اسی معنی کی طرف لوٹتی ہیں جو امام باقرؑ سے نقل ہوئے ہیں۔

یہ تفسیر اس وجہ سے کی گئی ہے کہ لغتِ عرب میں ساق کا ایک معنی شدید حادثہ، مصیبت اور بلائے عظیم بھی ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد پاؤں کی پنڈلیوں کا کفن میں لپیٹا جانا ہے۔

البتہ یہ تفاسیر آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور یہ سب کی سب آیت کے معنی میں جمع ہو سکتی ہیں۔

آخری زیرِ بحث آیت میں فرماتا ہے: "اس دن تمام مخلوق کی بازگشت تیرے پروردگار کی عدالت کی طرف سے ہوگی" (الی ربك یومئذ المساق)۔

ہاں! سب کے سب اسی کی طرف لوٹیں گے اور اس کی دادگاہِ عدل میں حاضر ہوں گے اور تمام راستے اس پر جا کر ختم ہو جائیں گے۔

یہ آیت مسئلہ معاد و قیامت اور بندوں کی عمومی رستاخیز پر ایک تاکید بھی ہے اور اس کی ذاتِ پاک کی طرف مخلوق کی حرکت تکاملی کے رُخ کرنے کا اشارہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو ہر لحاظ سے غیر متناہی ہے۔

ایک نکتہ

موت کا دردناک لمحہ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن بار بار موت کے مسئلہ کی بات کرتا ہے اور انسانوں کو خبردار کرتا ہے کہ ان سب کو اس قسم کا لمحہ درپیش ہے کبھی تو اسے "سکرۃ الموت" (موت کی حالت کی مستی اور تنگی) سے تعبیر کیا ہے[3]

اور کبھی "غمرات الموت" یعنی "موت کے شدائد" سے تعبیر کیا ہے[4]

کبھی "روح کے حلق تک پہنچنے" کی تعبیر کی ہے[5] اور کبھی "روح کی تراقی تک پہنچنے کی تعبیر ہے، یعنی گلے کے گرد کی ہڈیوں تک۔

---

[1] [2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۶۵

[3] وجاءت سکرۃ الموت بالحق۔ (ق ـــ ۱۹)

[4] سورۂ انعام ۹۳

[5] فلولا اذا بلغت الحلقوم (واقعہ ـــــ ۸۳)

(زیر بحث آیات) ۔

ان تمام باتوں سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ لمحہ ——— بعض مادیین کے کہنے کے برخلاف ——— سخت اور دردناک لمحہ ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ وہ اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال کا لمحہ ہوگا۔ یعنی جس طرح انسان کے عالم جنین (شکم مادر) سے عالم دنیا کی طرف انتقال کا لمحہ بہت زیادہ درد اور تکلیف سے وابستہ ہوتا ہے، دوسرے جہان کی طرف انتقال بھی طبعی طور پر ایسا ہی ہوگا۔

لیکن اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لمحہ سچے مومنین پر آسانی کے ساتھ گزر جائے گا، جبکہ بے ایمان افراد کے لیے سخت دردناک ہوگا یہ اس بناء پر ہوگا کہ پروردگار کی لقاء اور اس کی بے پایاں رحمت اور نعمتوں کا شوق پہلے گروہ کو اس طرح اپنے آپ سے بے خود کردے گا کہ وہ انتقال کے لمحہ کی تکلیف کو محسوس ہی نہیں کرے گا۔

جبکہ دوسرے گروہ کے لیے سزا کی وحشت ایک طرف سے اور اس دنیا کے فراق کی مصیبت، جس سے اس نے دل لگایا ہوا تھا، دوسری طرف سے دنیا کے انتقال کے لمحہ کی تکلیفوں کو کئی گنا کردے گا۔

ایک حدیث میں امام علی بن الحسینؑ سے آیا ہے، جب آپ سے موت کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

"موت مومن کے لیے میلے کچیلے جوؤں سے بھرے ہوئے لباس کو اتارنے اور سنگین اور وزنی طوق اور زنجیروں کو کھولنے، اور انھیں بہترین لباسوں، خوشبو ترین عطروں، تیز رو سواریوں اور مرفہ ترین مکانوں سے تبدیل کرنے کے مانند ہے اور کافر کے لیے ایک فاخرہ لباس اتارنے، مرفہ مکانوں سے نقل مکانی کرنے اور اس کے کثیف ترین اور سخت ترین لباسوں، وحشت ناک ترین مکانوں اور عظیم ترین عذابوں میں بدل جانے کے مانند ہے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے موت کی تعریف کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے فرمایا:

للمؤمن کالطیب ریح یشمه فینعس لطیبه و ینقطع التعب والالم کله عنه، وللکافر کلسع الافاعی ولدغ العقارب اواشد!

"مومن کے لیے تو بہت ہی خوشبودار عطر کی مانند ہے، جسے سونگھنے سے نیند کے مانند کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور درد اور تکلیف کلی طور پر اس سے منقطع ہوجاتا ہے اور کافر کے لیے سانپوں اور بچھوؤں کے کاٹنے کی مانند ہے یا اس سے بھی زیادہ شدید"۔[2]

بہرحال موت عالم بقاء کے لیے ایک دریچہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لکل دار باب وباب دار الآخرة الموت

"ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور آخرت کے گھر کا دروازہ موت ہے"۔[3]

---

[1] بحارالانوار، جلد ۶ ص ۱۵۵

[2] وہی مدرک۔ ص ۱۵۲

[3] "شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲۰ ص ۳۴۵

ہاں! موت کی طرف توجہ، شہوات کے توڑنے، لمبی چوڑی آرزوؤں کو توڑنے، اور آئینۂ دل سے غفلت کا زنگ اتارنے میں ایک گہرا اثر رکھتی ہے، اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ذکر الموت یمیت الشهوات فی النفس و یقلع منابت الغفلة ویقوّی القلب بمواعد الله و یرقّ الطبع، و یکسر اعلام الهوی، ویطفئ نار الحرص، و یحقر الدنیا، و هو معنی ما قال النبی (ص) فکر ساعة خیر من عبادة سنة"

"موت کی یاد انسان کے اندر سرکش شہوتوں کو مار دیتی ہے اور غفلت کی جڑوں کو دل سے اکھاڑ دیتی ہے، دل کو خدائی وعدوں کے ساتھ تقویت بخشتی ہے، اور انسان کی طبیعت میں نرمی اور لطافت پیدا کرتی ہے ہوا پرستی کی نشانیوں کو توڑ دیتی ہے، حرص کی آگ کو بجھا دیتی ہے اور دنیا کو انسان کی نظروں میں حقیر بنا دیتی ہے اور اس بات کا مطلب جو پیغمبرؐ نے فرمائی تھی یہی ہے: ایک ساعت کی فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے"۔[1]

البتہ اس سے مراد غور و فکر کرنے کے ایک واضح مصداق کو بیان کرنا ہے، نہ یہ کہ غور و فکر کرنے کا موضوع بس اسی میں منحصر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بحث جلد ۲۲ ص ۲۲۵ پر (سورۂ ق کی آیہ ۱۹ کے ذیل میں) گزر چکی ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ ص ۱۲۲

۳۱۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۙ
۳۲۔ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۙ
۳۳۔ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ؕ
۳۴۔ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۙ
۳۵۔ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ؕ
۳۶۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ؕ
۳۷۔ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۙ
۳۸۔ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۙ
۳۹۔ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ؕ
۴۰۔ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۧ

ترجمہ

۳۱۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لایا اور نہ اس نے نماز پڑھی۔
۳۲۔ بلکہ اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔
۳۳۔ پھر وہ اپنے گھر والوں کی طرف متکبرانہ چال سے قدم اٹھاتے ہوئے پلٹ گیا۔
۳۴۔ عذابِ الٰہی تیرے لیے زیادہ شائستہ ہے، زیادہ شائستہ۔
۳۵۔ پھر بھی عذابِ الٰہی ہی تیرے لیے زیادہ شائستہ ہے، زیادہ شائستہ۔
۳۶۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یونہی فضول اور بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دیا جائے گا؟
۳۷۔ کیا وہ اس منی کا نطفہ نہیں تھا جو رحم میں ڈالا جاتا ہے۔؟
۳۸۔ پھر اس نے جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کرلی۔ پھر اس کو خلق کیا اور موزوں بنایا۔

۳۹۔ اور اس سے دو جوڑے مذکر و مؤنث بنائے۔
۴۰۔ کیا ایسی ہستی اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔

تفسیر

وہ خدا جس نے انسان کو ایک ناچیز نطفہ سے پیدا کیا

موت سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے، جو سفرِ آخرت کا پہلا قدم ہے اور وہ گزشتہ آیات میں آچکے ہیں، زیرِ بحث آیات میں، کافروں کے اس توشۂ مسافرت سے خالی ہاتھ ہونے کی بات کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "یہ منکر معاد انسان ہرگز ایمان نہیں لایا، نہ ہی اس نے آیاتِ خدا کی تصدیق کی، اور نہ ہی اس کے لیے نماز پڑھی" (فلا صدّق ولا صلّٰی)۔[1]

"بلکہ اس نے تکذیب کی راہ اختیار کی، اور حکمِ خدا کی طرف سے پشت پھیر لی" (و لکن کذّب و تولّٰی)۔

"فلا صدّق" کے جملہ سے مراد قیامت، حساب و کتاب، جزا و سزا، آیاتِ الٰہی، توحید و نبوت اور پیغمبر اسلام کی تصدیق نہ کرنا ہے، لیکن بعض نے اسے، اس کے نماز کے ساتھ ذکر ہونے کے باعث، کفار کی طرف سے "انفاق و صدقہ" کو ترک کرنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن دوسری آیت اچھی طرح سے اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اس تصدیق کا نقطہ مقابل تکذیب ہے۔ اس بناء پر پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "پھر وہ اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ گیا جبکہ وہ متکبرانہ چال کے ساتھ چل رہا تھا" (ثم ذھب الیٰ اھلہ یتمطّٰی)۔

وہ اس گمان میں کہ اس نے بے اعتنائی اور پیغمبر اور آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی بناء پر اہم کامیابی حاصل کر لی ہے۔ بادۂ غرور سے مست اپنے گھر والوں کی طرف آرہا تھا تاکہ معمول کے مطابق ان افتخار آمیز مسائل کو جو گھر سے باہر رونما ہوئے تھے ان کے سامنے بیان کرے، یہاں تک کہ اس کا چلنا اور اس کے جسم کے اعضاء کی حرکت، سب ہی اس کے کبر و غرور کو بیان کر رہے تھے۔

---

[1] "صدّق و صلّٰی" کے جملوں میں جو ضمیر ہے وہ معاد کے منکر انسان کی طرف لوٹتی ہے جو کلام کے لب و لہجہ سے سمجھا جاتا ہے، اور سورہ کے آغاز میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"یتمطّی" "مطی" کے مادہ سے اصل میں پشت کے معنی میں ہے اور "تمطی" بے اعتنائی، غرور یا تھکان اور بے حالی سے پشت کو کھینچنے کے معنی میں ہے اور یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے۔

بعض اس کو "مط" (بروزن خط) کے مادہ سے، پاؤں یا باقی اعضاء بدن کو بے اعتنائی یا تھکان کے اظہار کے وقت کھینچنے کے معنی میں سمجھتے ہیں، لیکن اس کا "مطا" سے اشتقاق ظاہر لفظ کے ساتھ زیادہ مناسب ہے[1]

بہرحال یہ مطلب اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ "مطففین" کی آیہ ۳۱ میں آیا ہے: واذا انقلبوا الی اھلھم انقلبوا فکھین: جس وقت وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو استہزاء کے طور پر مومنین کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

پھر اس قسم کے بے ایمان افراد کو مخاطب کرتے ہوئے تہدید کے طور سے کہتا ہے: "عذابِ الٰہی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے اور زیادہ مناسب ہے" (اولیٰ لک فاولیٰ)۔

"پھر بھی عذابِ الٰہی ہی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے اور زیادہ مناسب ہے" (ثم اولیٰ لک فاولیٰ)۔

مفسرین نے اور دوسری متعدد تفاسیر بھی اس آیت کے لیے بیان کی ہیں منجملہ ان کے یہ ہیں کہ:

یہ ان کے لیے ایک تہدید ہے کہ تجھ پر عذاب ہو اور پھر تجھ پر عذاب ہو۔

یا یہ حالت جو تو رکھتا ہے یہی تیرے لیے زیادہ لائق ہے اور زیادہ لائق ہے۔

یا سرزنش اور مذمت تیرے لیے بہتر ہے اور پھر بہتر ہے۔

یا وائے ہو تجھ پر اور پھر بھی وائے ہو تجھ پر

یا دنیا کی نیکیاں تجھ سے دور رہیں اور آخرت کی بھلائیاں بھی تجھ سے دور رہیں۔

یا شر و عذاب تجھے دامن گیر رہے اور پھر شر و عذاب تجھے دامن گیر رہے۔

یا جس عذاب کا میدانِ بدر میں تو نے مشاہدہ کیا ہے وہ تیرے لیے اس دنیا میں زیادہ مناسب ہے اور قبر و قیامت کا عذاب بھی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے[2]

---

[1] کیونکہ اگر یہ "مطا" کے مادہ سے ہو تو پھر تو ظاہر لفظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اگر یہ "مط" کے مادہ سے ہو تو پھر "یتمطی" کا اصل میں "یتمطط" تھا جس کی آخری "طاء" "یاء" کے ساتھ تبدیل ہو گئی ہے۔

[2] بعض تفاسیر کے مطابق یہاں "اولیٰ" "افعل تفضیل" ہے اور بعض کے مطابق "اولیٰ" فعل ماضی ہے۔ باب افعال سے "ولی" کے مادہ سے، اور جملہ کا مفہوم اس طرح سے ہوگا "قاربک اللہ العذاب" اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "اولیٰ" اسماء افعال سے ہے اور "قارب" کا معنی رکھتا ہے لیکن مناسب وہی پہلا معنی ہے۔ (البیان فی غریب اعراب القرآن، روح المعانی، المیزان اور المنجد کی طرف رجوع کریں)۔

لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ ان معانی میں سے اکثر ایک کلی اور واضح معنی کی طرف لوٹتے ہیں، جو عذاب، مذمت، شر اور عقاب کی تہدید کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، چاہے وہ عذابِ دنیا ہو یا عذابِ برزخ و قیامت۔

روایات میں آیا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کا ہاتھ پکڑا (اور بعض روایات کے مطابق اس کا گریبان پکڑا) اور فرمایا:

اولیٰ لک فاولیٰ ثم اولیٰ لک فاولیٰ

تو ابوجہل نے کہا:

"مجھے کس چیز کی دھمکی دیتے ہو تم اور تمھارا پروردگار مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، میں اس سرزمین کے قدرت مند ترین افراد میں سے ہوں"۔

اس موقع پر یہی جملے پیغمبر پر آیات کی صورت میں نازل ہوئے[1]

اس کے بعد قیامت کے بارے میں دو بہت ہی عمدہ استدلال پیش کرتا ہے، جن میں سے ایک تو "خلقت کے ہدف اور خدا کی حکمت" کے بیان کے طریق سے ہے اور دوسرا عالمِ جنین کے مختلف مراحل میں انسانی نطفہ کی تبدیلیوں اور تکامل وار تقاء کے استناد سے اس کی قدرت کے بیان کے طریق سے۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے فضول اور بے مقصد چھوڑ دیا جائے گا" (ایحسب الانسان ان یترک سدًی)۔

"سدًی" (بروزن ہدیٰ) مہمل، فضول، بے ہودہ اور بے مقصد کے معنی میں ہے۔ عرب کہتے ہیں "اہل سدی" اس اونٹ کے بارے میں جو ساربان کے بغیر چھوڑا گیا ہو اور جہاں چاہے چرنے کے لیے چلا جائے۔

اس آیت میں "انسان" سے مراد وہی انسان ہے، جو معاد و قیامت کا منکر ہے، آیت کہتی ہے کہ اسے کیسے یقین آگیا کہ خدا نے اس وسیع و عریض عالم کو تو اس عظمت اور ان تمام عجائبات کے ساتھ انسان کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن خود انسان کی خلقت میں کوئی ہدف اور مقصد نہ رکھا ہو۔ یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ انسان کے اعضاء میں سے ہر عضو تو کسی خاص ہدف اور مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہو، آنکھ دیکھنے کے لیے، کان سننے کے لیے اور دل غذا و آکسیجن اور پانی تمام بدن کے سلولوں تک پہنچانے کے لیے، یہاں تک کہ انسان کی انگلیوں کے پوروں کی لکیریں بھی حکمت و فلسفہ رکھتی ہیں لیکن اس کے پورے وجود کا کوئی ہدف و مقصد نہ ہو اور وہ یونہی فضول، مہمل اور کسی امر و نہی اور ذمہ داری اور مسئولیت کے پروگرام کے بغیر ہی پیدا کر دیا گیا ہو؟

ایک عام آدمی بھی اگر ایک چھوٹی سی چیز بغیر کسی مقصد کے بنائے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کا نام عقل مند انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیتے ہیں تو پھر حکیم علی الاطلاق خدا سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس قسم کی بے مقصد مخلوق کو پیدا کرے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۱

اب اگر یہ کہا جائے کہ ہدف و مقصد یہی دنیا کی چند روزہ زندگی ہے۔ یہی بار بار کا کھانا اور سونا، جس میں ہزاروں قسم کے درد اور تکلیفیں ملی ہوئی ہیں، تو یقیناً یہ ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم خلقت کی توجیہ کر سکے۔

اس بناء پر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ انسان ایک عظیم ترین ہدف، یعنی جوار قرب رحمتِ حق تعالیٰ میں جاودانی زندگی اور بے وقفہ اور بے پایاں تکامل وارتقاء کے لیے پیدا ہوا ہے[1]

اس کے بعد دوسری دلیل کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کیا انسان ابتداء میں منی کا ایک نطفہ نہیں تھا، جو رحم میں ڈالا جاتا ہے" (الم یك نطفة من منیٍّ یمنٰی)۔

"پھر اس مرحلہ کے بعد جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کی اور خدا نے اسے نئی خلقت بخشی اور موزوں بنایا" (ثم كان علقة فخلق فسوّٰی)۔

"پھر اس مرحلہ میں بھی متوقف نہ رہا، خدا نے اسی نطفہ سے دو جفت مرد و عورت پیدا کیے" (فجعل منه الزوجین الذكر والانثٰی)۔

کیا وہ ہستی، جو ایک چھوٹے سے حقیر و ناچیز نطفہ کو ظلمت کدہ رحم مادر میں، ہر روز ایک نئی آفرینش عطا کرتی ہے اور حیات و زندگی کا ایک نیا لباس اسے پہناتی ہے، اور ایک نئے سے نیا چہرہ اسے دیتی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک کامل مذکر و مؤنث انسان ہو جاتا ہے اور ماں سے متولد ہوتا ہے، تو کیا ایسی ذات مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے!؟" (الیس ذالك بقادر علٰی ان یحیَ الموتٰی)۔

یہ بیان حقیقت میں ایسے منکرین کے مقابلہ میں ہے جو معاد جسمانی کے مسئلہ میں عام طور پر اس کے محال ہونے کا دم بھرتے ہیں اور مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد زندگی کی بازگشت کے امکان کی نفی کرتے ہیں اور قرآن اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی خلقت کے آغاز کی طرف پلٹاتا ہے۔ جنین کے عجیب و غریب مرحلے، اور ان مرحلوں میں، انسان کی حیرت انگیز تبدیلیوں کی، اسے نشاندہی کراتا ہے۔ تاکہ وہ جان لے کہ خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے، اور دوسرے لفظوں میں کسی چیز کے وقوع کی بہترین دلیل اس کا وقوع میں آجانا ہے۔

---

[1] ہم نے اس سلسلہ میں ایک اور بحث سورۂ مومنون کی آیہ ۱۱۵ کے ذیل میں (جلد ۱۴ ص ۲۴۶ پر) بھی کی ہے۔

چند نکات

جنین کی تبدیلیاں یا بار بار کی رستاخیز

"نطفہ" اصل میں تھوڑے یا صاف پانی کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد پانی کے ان قطرات پر بولا جانے لگا جو لقاح اور جفتی کرنے کے طریقے سے انسان یا حیوان کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

حقیقت میں نطفہ کا جنینی دور میں مختلف مراحل میں تبدیل ہونا، عالم ہستی کے عجیب ترین مراحل میں سے ہے، جو "جنین شناسی" کے علم کا موضوع ہے اور آخری صدیوں میں اس کے اسرار سے بہت زیادہ حد تک پردہ اٹھ چکا ہے۔

قرآن نے اس زمانہ میں جبکہ ابھی تک یہ مسائل واضح نہیں ہوئے تھے، بارہا خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ہونے کے تحت اس کا ذکر کیا ہے، اور یہ بات خود اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت کی ایک نشانی ہے۔

اگرچہ ان آیات میں صرف جنین کے بعض مراحل ذکر ہوئے ہیں۔ لیکن قرآن کی دوسری آیات میں مثلاً سورۂ حج کے آغاز کی آیات اور سورہ مومنون کے اوائل میں بہت سے مراحل بیان ہوئے ہیں اور ہم نے ان آیات کے ذیل میں اس ضمن میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[1]

"ذالك" جو اسم اشارہ بعید ہے، خدا کے لیے اس کے مقام کی عظمت سے کنایہ ہے، اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی پاک ذات اس قدر بلند ہے کہ وہ افکار بشر کی دسترس سے باہر ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت الیس ذالك بقادر علی ان یحیی الموتی : کیا خدا ان تمام توانائیوں کے ساتھ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کرے"؟ کی آیات نازل ہوئیں؟ تو رسولِ خدا نے فرمایا:

سبحانك اللهم وبلی

"اے خدا! تیری ذات پاک ہے، بیشک تو یہ توانائی رکھتا ہے"

یہی معنی امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔[2]

۲۔ جہاں بشریت میں نظامِ جنسیت

ان تمام باتوں کے باوجود، جو جنین کی جنسیت کے عوامل کے بارے میں ہوئی ہیں اور اس بارے میں کہ کن امور کے ماتحت "مذکر" یا "مونث" کی جنس میں تبدیلی ہوتی ہے، ابھی تک کوئی شخص ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ اس کے عوامل اصلی کیا ہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ بعض مواد غذائی یا چند ایک دوائیاں ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں بے اثر ہوں، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یقینی طور پر تعین کنندہ شمار نہیں ہوتی، دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا علم خدا ہی کے پاس ہے۔

دوسری طرف تمام معاشروں میں ہمیشہ ایک تعادل نسبی ان دونوں صنفوں کے درمیان نظر آتا ہے، اگرچہ اکثر معاشروں میں عورتوں کی تعداد کچھ زیادہ

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۴ ص ۱۷ کے بعد اور ص ۲۰۶ کے بعد رجوع کریں

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۲

ہوتی ہے اور بعض معاشروں میں شاذ و نادر مردوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے لیکن مجموعی طور پر ان دونوں اصناف میں ایک تعادل نسبی پایا جاتا ہے۔

اگر فرض کریں کہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ یہ تعادل اور برابری ٹوٹ جائے اور مثلاً عورتوں کی تعداد مردوں سے دس گنا ہو جائے یا مردوں کی تعداد عورتوں سے دس گنا ہو جائے تو پھر غور کیجیے کہ انسانی معاشرے کا نظام کس طرح درہم برہم ہو سکتا ہے اور اس طرح سے کیسے عجیب و غریب مفاسد وجود میں آئیں گے کہ ہر ایک عورت کے مقابلہ میں دس مرد ہوں گے یا ہر دس مردوں کے مقابلہ میں ایک عورت ہو تو کیسا جنجال برپا ہونے کا خطرہ ہے

اوپر والی آیات جو یہ کہتی ہیں: فجعل منه الزوجين الذكر والانثى تو یہ ان دونوں موضوعات کی طرف ایک لطیف اور سربستہ اشارہ ہے: ایک طرف تو انسانوں کے پراسرار تنوع اور ان کے جینی دور میں، ان دو جنسوں میں تقسیم ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس تعادل نسبی[1] اور برابری کی طرف اشارہ ہے۔

خداوندا! ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک ہی لمحہ میں تمام مردوں کو حیات و زندگی کا لباس پہنا دے، کوئی بھی چیز تیری قدرت کے مقابلہ میں مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے۔

پروردگارا! جس دن روحیں گلے تک پہنچ جائیں گی، اور ہم ہر چیز سے قطع امید کر لیں گے، تیری پاک ذات ہی ہماری امید ہے۔

بارالٰہا! ہمیں خلقت و آفرینش کے ہدف سے آشنا فرما۔

آمین یارب العالمین

سورۂ قیامت کا اختتام

۷ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

۲۰ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء

بروز بدھ بوقت تقریباً ساڑھے سات بجے شب

۱۸ ر ای ماڈل ٹاؤن ——— لاہور

صفدر حسین نجفی

---

[1] یہ جو مشہور ہے کہ ہر معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے اور اسے وہ تعدد ازدواج کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ قابل قبول ہے، لیکن یہ بات تعادل نسبی کے ساتھ منافات نہیں رکھتی مثال کے طور پر ایک معاشرے میں ۵۰ ملین افراد ہیں، جن میں سے ممکن ہے کہ ۲۶ ملین عورتیں اور ۲۴ ملین مرد ہوں یعنی ان دونوں کا فرق ۱ یا اس سے بھی کم کا ہو۔ لیکن یہ بات کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہو کسی بھی معاشرے میں نہیں دیکھی گئی۔

سُورۂ انسان (دہر)

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۳۱ آیات ہیں

تاریخ شروع

۷ ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ

سورۂ انسان (دہر) کے مضامین

یہ سورہ مختصر ہونے کے باوجود عمیق، متنوع اور جامع مضامین رکھتا ہے اور ایک لحاظ سے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلے حصہ میں انسان کی آفرینش اور اس کی نطفۂ امشاج (ملے جلے) سے خلقت اور پھر اس کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

دوسرے حصہ میں ابرار اور نیک افراد کے اجر و ثواب کے بارے میں گفتگو ہے، جو اہلِ بیت کے بارے میں ایک خاص شانِ نزول رکھتا ہے، جس کی طرف اشارہ ہوگا۔

تیسرے حصہ میں ان ثوابوں کے استحقاق کے دلائل کو مختصر اور موثر جملوں میں بیان کرتا ہے۔

چوتھے حصہ میں قرآن کی اہمیت، اور اس کے احکام کے اجراء کے طریقہ اور خودسازی کی نشیب و فراز سے بھری ہوئی راہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اور پانچویں حصہ میں (انسان کے مختار ہونے کے باوجود) مشیت الٰہی کی حاکمیت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

اس سورہ کے متعدد نام ہیں جن میں سے زیادہ مشہور سورۂ "انسان" اور سورۂ "دہر" اور سورۂ "ہل اتیٰ" ہے۔ جن میں سے ہر ایک اس سورہ کے اوائل کے الفاظ سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ ان روایات میں جو بعد میں اس سورہ کی فضیلت کے متعلق بیان ہوں گے۔ صرف "ہل اتیٰ" کا ذکر آیا ہے۔

کیا یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے؟

اس بارے میں کہ سورہ "ہل اتیٰ" مدنی ہے یا مکی؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن شیعہ علماء و مفسرین کا اجماع و اتفاق اس بات پر ہے کہ سارا کا سارا سورہ، یا کم از کم سورہ کے آغاز کی آیات کا وہ حصہ جو ابرار کے مقام اور ان کے اعمال صالح کو بیان کرتا ہے، وہ مدینہ میں نازل ہوا ہے، جس کا شانِ نزول، یعنی علیؑ، فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور فضہ کے نذر کرنے کی داستان تفصیل کے ساتھ بیان ہوگی اور اسی طرح سے علماء اہلِ سنت کے درمیان بھی مشہور اس کا مدینہ میں نزول ہی ہے جیسا کہ اہلِ سنت کے مشہور مفسر قرطبی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں۔

وقال الجمهور مدنية

"مشہور علماء کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے"[1]

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۶۹۰۹

ان علماء میں سے جو اس ساری سورت کو یا اس کی آیات کے ایک حصہ کو ـــــ جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے ـــــ "مدنی" سمجھتے ہیں، ذیل کے علماء کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حاکم ابوالقاسم حسکانی نے ابن عباس سے ان آیات کی تعداد، جو مکہ میں اور مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، بالترتیب تفصیل کے ساتھ نقل کی ہیں اور اس سورہ کو مدنی سورتوں میں شمار کیا ہے، جو سورہ "رحمٰن" کے بعد اور سورہ "طلاق" سے پہلے نازل ہوا ہے[۱]

صاحب کتاب "ایضاح" استاد احمد زاہد نے بھی یہی معنی ابن عباس سے نقل کیا ہے[۲]

۲۔ "تاریخ القرآن" میں ابوعبداللہ زنجانی نے کتاب "نظم الدرر وتناسق الآیات والسور" سے اہل سنت کے بزرگوں کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے سورۂ انسان کو مدنی سورتوں کی ردیف میں شمار کیا ہے[۳]

۳۔ اور اسی کتاب میں "فہرست ابن ندیم" سے بھی ابن عباس ہی سے یہ نقل ہوا ہے کہ وہ سورہ ہل اتیٰ کو گیارہویں مدنی سورت شمار کرتے ہیں[۴]

۴۔ سیوطی نے "اتقان" میں بیہقی کی "دلائل النبوت" سے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ سورہ ہل اتی مدینہ میں نازل ہوا ہے[۵]

۵۔ "درالمنثور" میں بھی یہی مضمون ابن عباس سے مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے[۶]

۶۔ زمخشری نے "تفسیر کشاف" میں اس سورہ کی ابتدائی آیات کا مشہور شانِ نزول علیؑ اور ان کی زوجہ محترمہ اور ان کے بچوں کی نذر کے بارے میں نقل کیا ہے[۷]

۷۔ مذکورہ بالا موارد کے علاوہ اہل سنت کے دوسرے بزرگ علماء کی ایک کثیر جماعت نے اس سورہ کی ابتدائی آیات (ان الابرار...) کا نزول علیؑ، فاطمہ زہراؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے بارے میں نقل کیا ہے، جو اس بات کی شہادت ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے (کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ولادت مدینہ میں ہوئی ہے)۔ مثلاً واحدی نے "اسباب النزول" میں، بغوی نے "معالم التنزیل" میں، سبط بن جوزی نے "تذکرہ" میں، گنجی شافعی نے "کفایت الطالب" میں، اور بہت سے دوسرے علماء نے[۸]

یہ مسئلہ اس قدر مشہور و معروف ہے کہ (اہل سنت کے چار اماموں میں سے ایک) "محمد بن ادریس شافعی" اپنے مشہور اشعار میں کہتے ہیں

الی م الی م وحتی متی ؟ اعاتب فی حب ھٰذا الفتیٰ

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۵

[۲] گزشتہ مدرک

[۳] تاریخ القرآن ص ۵۵

[۴] تاریخ القرآن

[۵] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۲۲۱

[۶] کشاف جلد ۴ ص ۶۷۰

[۷] احقاق الحق جلد ۳ ص ۱۵۷ تا ۱۷۰ (کتابوں کے نام اور صفحات کے ذکر کے ساتھ)۔

وھل زوجت فاطم غیرہ؟ وفی غیرہ ھل اتیٰ ھل اتیٰ؟

"کب تک، کس وقت تک اور کس زمانہ تک؟

مجھے اس جواں مرد کی محبت میں سرزنش کرتے رہو گے

کیا فاطمہ کی اس کے علاوہ کسی اور سے شادی ہوئی ہے؟

اور کیا سورۂ ہل اتی اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں نازل ہوئی ہے[1]

اس سلسلہ میں اور بھی بہت سے مدرک موجود ہیں، جن کے ایک حصہ کی طرف ہم ان الابرار یشربون ..... والی آیات کا شانِ نزول بیان کرتے وقت اشارہ کریں گے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بعض متعصب افراد کا اصرار ہے کہ اس سورہ کو مکی سمجھیں اور مدینہ میں اس کے نزول کی تمام روایات کا اور اسی طرح اس سورہ کے علیؑ و فاطمہؑ اور حسنینؑ کے بارے میں نزول کا انکار کریں۔

واقعاً عجیب بات ہے کہ جب کوئی آیت یا روایت علیؑ اور اہل بیتؑ کے فضائل بیان کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو ایک گروہ داد و فریاد بلند کرنے لگ جاتا ہے اور حد سے زیادہ حساسیت دکھانے لگتا ہے، گویا کہ اسلام خطرے میں پڑ گیا ہے۔

حالانکہ دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ علیؑ کو خلفاء راشدین اور اسلام کے عظیم پیشواؤں میں سے سمجھتے ہیں اور اہل بیت کے بارے میں بھی اظہارِ عقیدت کرتے ہیں، ہمارے نظریہ کے مطابق یہ تعصب اس گروہ کے افکار پر روح اموی کی حاکمیت کا نتیجہ ہے اور اسی شوم و منحوس دور کے پروپیگنڈوں کی پیداوار ہے۔ خدا ہم سب کو اسی قسم کے اشتباہات سے محفوظ رکھے۔

سورۂ انسان (دہر) کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من قرأ سورۃ "ھل اتیٰ" کان جزاؤہ علی اللہ جنۃ و حریرًا

"جو شخص سورہ ہل اتی کو پڑھے گا اس کی جزا و ثواب خدا پر جنت اور جنت کے ریشمی لباس ہیں[2]

اور ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

"جو شخص ہر جمعرات کی صبح کو سورۂ ہل اتی پڑھے گا، اس کی جزاؤں میں سے ایک جزا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن پیغمبرؐ خدا کے ساتھ ہو گا[3]

---

[1] گذشتہ مدرک ص ۱۵۸

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۲

سورۂ انسان (دہر)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

۱۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا○

۲۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا○

۳۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا○

۴۔ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ انسان پر ایک طویل زمانہ ایسا گزرا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟

۲۔ ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے، ہم اس کو آزمائیں گے (اس لیے) ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے۔

۳۔ ہم نے اسے راستے کی نشاندہی کر دی ہے، اب چاہے وہ شاکر ہو جائے (اور قبول کرلے) یا کفران کرے۔

۴۔ ہم نے کفار کے لیے زنجیریں، طوق اور جلانے والے شعلے تیار کر رکھے ہیں۔

تفسیر

ہم نے ناچیز نطفہ کو انسان بنا دیا، اور ہدایت کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں دے دیئے

اس کے باوجود کہ اس سورہ کے زیادہ تر مباحث قیامت اور جنت کی نعمتوں کے بارے میں ہیں، لیکن اس کی ابتداء میں گفتگو انسان کی خلقت کے بارے میں ہے، کیونکہ اس زمینہ ساز خلقت کی طرف توجہ کرنا، قیامت و معاد کی طرف توجہ کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم سورہ قیامت کی تفسیر میں اس سے چند صفحہ پہلے تشریح کر چکے ہیں۔

فرماتا ہے: "کیا ایسا نہیں ہے کہ انسان پر ایک طویل زمانہ ایسا گزرا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا" (ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئًا مذکورًا)۔

ہاں! اس کے وجود کے ذرات میں سے ہر ذرہ کسی گوشہ میں بکھرا پڑا تھا۔ مٹی کے درمیان، دریاؤں اور سمندروں کے پانی کے قطروں میں، اس ہوا میں جو زمین کی فضا میں موجود ہے، اس کے وجود کا اصلی مواد، ہر ایک ان تینوں وسیع محیطوں کے کسی ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا، اور وہ حقیقت میں ان کے درمیان گم شدہ اور بالکل قابلِ ذکر نہیں تھا۔

کیا یہاں "انسان" سے مراد نوعِ انسانی ہے، اور یہ تمام افرادِ بشر کو شامل ہے؟ یا اس سے خاص طور پر حضرت آدمؑ مراد ہیں۔؟

بعد والی آیت جو یہ کہتی ہے کہ ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے، وہ پہلے معنی پر ایک واضح اور روشن قرینہ ہے۔ اگرچہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان" پہلی آیت میں حضرت آدمؑ کے معنی میں ہے اور دوسری آیت میں اولادِ آدم اشارہ ہے، لیکن اس مختصر سے فاصلہ میں یہ جدائی بعید نظر آتی ہے۔

"لم یکن شیئًا مذکورًا" (کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا) کے جملہ کی تفسیر میں، دوسرے نظریات کا بھی اظہار ہوا ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ: انسان جب عالمِ نطفہ میں تھا اور جنین تھا تو وہ کوئی قابلِ ذکر وجود نہیں تھا، لیکن بعد میں جب اس نے تکامل دار تقاء کے مراحل طے کر لیے تو وہ ایک قابلِ ذکر وجود میں تبدیل ہو گیا۔

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"انسان" "علمِ خدا میں" مذکور تھا، اگرچہ "عالمِ خلق" میں مذکور نہیں تھا"۔[۲]

بعض تفاسیر میں یہ بھی آیا ہے کہ یہاں "انسان" سے مراد علماء اور دانش مند ہیں، جو علم کے حاصل کرنے سے پہلے قابلِ ذکر نہیں تھے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد، زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی، تمام لوگوں کے درمیان ہر جگہ ان کا ذکر ہوتا ہے۔

بعض نے یہ نقل کیا ہے کہ "عمر بن خطاب" نے کسی سے یہ آیت سنی تو کہا: اے کاش! آدم اسی طرح سے غیر مذکور رہتا اور ماں۔

---

[۱] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۰۶

[۲] ایضًا

پیدا ہی نہ ہوا ہوتا اور اس کی اولاد امتحان میں مبتلا نہ ہوتی۔[1]

یہ بات حیرت انگیز ہے چونکہ یہ تو مسئلہ آفرینش و خلقت پر ایک اعتراض ہے۔

بہرحال اس مرحلہ کے بعد انسان کی خلقت اور اس کے قابلِ ذکر موجود ہونے کی بات آتی ہے، فرماتا ہے: "ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے اور ہم اس کو آزمائیں گے لہٰذا ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے" (انّا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج نبتلیہ فجعلناہ سمیعًا بصیرًا)۔

"امشاج" "مشج" (بروزن نسج یا بروزن سبب) کی جمع ہے یا "مشیج" (بروزن مریض) کی جمع ہے، جو مخلوط اور ملی جلی چیز کے معنی میں ہے۔

"نطفہ مخلوط" سے انسان کی خلقت، ممکن ہے کہ عورت اور مرد کے نطفہ کے ملنے اور "اسپرز" اور "اوول" کی ترکیب کی طرف اشارہ ہو، جیسا کہ روایات اہلِ بیتؑ میں اجمالی طور پر اس کی طرف اشارہ ہوا ہے یا ان مختلف استعدادوں کی طرف اشارہ ہے جو عامل وراثت کے لحاظ سے، کروموسوم اور اس کے مانند دوسری چیزوں کے طریق سے نطفہ کے اندر پائی جاتی ہیں، یا نطفہ کی ترکیب میں مختلف مواد کے اختلاط کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ دسیوں مختلف مادوں سے مل کر بنا ہے یا ان سب کا ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط، آخری معنی سب سے زیادہ جامع اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ امشاج، جنینی دور میں نطفہ کی مختلف حالات میں تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔[2]

"نبتلیہ" کا جملہ انسان کے "تکلیف و ذمہ داری" تعہد و مسئولیت اور آزمائش و امتحان کے مقام تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے، جو اس نے انسان کو ودیعت فرمائی ہے اور اسے "تکلیف، ذمہ داری اور مسئولیت" کے لیے شائستہ اور اہل قرار دیا ہے۔

اور چونکہ آزمائش اور تکلیف "آگاہی اور علم" کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے آیت کے آخر میں شناخت اور معرفت کے آلات، آنکھ اور کان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس نے انسانوں کے اختیار میں دے دیئے ہیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ابتلاء و آزمائش سے مراد وہ تبدیلیاں ہیں، جو جنین کو نطفہ کے مرحلہ سے لے کر ایک مکمل انسان تک پہنچنے کے لیے پیش آتی ہیں، لیکن "نبتلیہ" کی تعبیر اور اسی طرح "انسان" کی تعبیر کی طرف توجہ کرنے سے پہلی تفسیر ہی زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے تمام ادراکات کی اصل اور بنیاد اس کے حسّی ادراکات ہوتے ہیں، دوسرے لفظوں میں

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۶

[2] اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ نطفہ کے مفرد ہونے کے باوجود اس کی صفت "امشاج" جمع کی صورت میں آئی ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ نطفہ مختلف اجزاء سے ترکیب پایا ہے اور جمع کے حکم میں ہے اور بعض مثلاً "زمخشری" نے "کشاف" میں کہا ہے کہ امشاج مفرد ہے اگرچہ جمع کے وزن پر ہے۔

حسی ادراکات تمام "معقولات" کی "ماں" ہوتے ہیں، اور بہت سے اسلامی فلاسفہ کا یہی نظریہ ہے، اور فلاسفہ یونان میں "ارسطو" بھی اسی نظریہ کا طرفدار تھا۔

چونکہ انسان کی تکلیف و ذمہ داری اور آزمائش، علم و آگاہی اور آلات شناخت کے علاوہ دو اور عوامل کی محتاج ہے، یعنی مسئلہ "ہدایت" و "اختیار" اس لیے بعد والی آیت میں ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے اسے راستہ کی نشاندہی کردی ہے، اب چاہے وہ شاکر ہوجائے اور اسے قبول کرلے، یا کفران کرکے قبول نہ کرنے والا بن جائے" (انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا)[1]۔

"ھدایت" یہاں ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے جو "ہدایت تکوینی" کو بھی شامل ہے اور "ہدایت فطری" اور "ہدایت تشریعی" کو بھی اگرچہ آیت کا سیاق زیادہ تر ہدایت تشریعی کی طرف ہے۔

اس کی "وضاحت" اس طرح ہے کہ چونکہ خدا نے انسان کو ابتلاء و آزمائش اور تکامل و ارتقاء کے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہذا اس مقصد تک پہنچنے کے مقدمات تو اس نے اس کے وجود میں پیدا کی ہیں اور اسے ضروری قوتیں بخشی ہیں، اور اسی کو ہدایت تکوینی کہتے ہیں، اس کے بعد اس کی فطرت کی گہرائیوں میں اس راستہ کو طے کرنے کا عشق پیدا کردیا اور فطری الہامات کے طریق سے اسے راستہ کی نشاندہی کردی، لہذا اس لحاظ سے اسے "فطری" ہدایت بھی کردی اور دوسری طرف سے آسمانی رہبر اور بزرگ انبیاء روشن اور واضح تعلیمات اور قوانین کے ساتھ راستہ دکھانے کی لیے مبعوث کیے اور ان کے ذریعہ "ہدایت تشریعی" فرمائی، البتہ ہدایت کے یہ تینوں شعبے عمومی پہلو رکھتے ہیں، اور تمام انسانوں کو شامل ہیں۔

مجموعی طور پر یہ آیت انسانی زندگی میں تین اہم اور سرنوشت ساز مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"مسئلہ تکلیف" و "مسئلہ ہدایت" اور "مسئلہ آزادی ارادہ و اختیار" جو ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

ضمنی طور پر "انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا" کا جملہ مکتب جبر پر خط بطلان کھینچتا ہے۔

"شاکرا" اور "کفورا" کی تعبیر وہ مناسب ترین تعبیر ہے جو یہاں ممکن ہوسکتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے خدا کی ہدایت جیسی عظیم نعمت کو قبول کرتے ہوئے اس کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور راہ ہدایت پر چل پڑے تو وہ اس نعمت کا شکر بجالائے اور جنھوں نے مخالفت کی انھوں نے کفران کیا۔

اور چونکہ ہاتھ اور زبان سے کوئی شخص بھی اس کے شکر سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ لہذا شکر کے بارے میں اسم فاعل کی تعبیر لایا ہے، جبکہ کفران کے بارے میں "کفور" (مبالغہ کا صیغہ) آیا ہے کیونکہ وہ لوگ جو اس نعمت کو نظر انداز کردیتے ہیں وہ سب سے بڑے

---

[1] بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "شاکرا" اور "کفورا" "ھدیناہ" کے مفعول کی ضمیر سے حال ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ یہ "یکون" محذوف کی خبر ہو اور تقدیر میں اس طرح ہو (اما یکون شاکرا و اما یکون کفورا)۔

کفران کا ارتکاب کرتے ہیں، کیونکہ خدا نے انواع واقسام کے وسائل ہدایت ان کے اختیار میں دے رکھے ہیں اور یہ انتہائی کفران ہے کہ انھیں نظر انداز کر کے خطا اور غلطی کی راہ پر چل پڑیں۔

ضمنی طور پر اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "کفور" ایک ایسا لفظ ہے جو کفرانِ نعمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور کفر اعتقادی کے بارے میں بھی، (جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے)۔

آخری زیر بحث آیت میں، ان لوگوں کی سرنوشت کی طرف جو کفر و کفران کا راستہ طے کرتے ہیں، ایک مختصر اور پر معنی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے کفار کے لیے زنجیریں طوق اور جلانے والے شعلے تیار کر رکھے ہیں" (انّا اعتدنا للکافرین سلاسلاً واغلالاً وسعیرًا)۔

"اعتدنا" (ہم نے تیار کر رکھا ہے) کی تعبیر اس گروہ کی سزا کے حتمی و یقینی ہونے کے مسئلہ پر ایک تاکید ہے یہ ٹھیک ہے کہ پہلے سے تیار کر رکھنا، ایسے لوگوں کا کام ہے جو محدود توانائی رکھتے ہوں اور انھیں یہ احتمال ہو کہ ضرورت کے وقت توانائی پیدا نہ کر سکیں گے لیکن یہ مفہوم خدا کے بارے میں کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ خدا تو جس چیز کا ارادہ کرے وہ "کن" کے فرمان سے فوراً موجود ہو جاتی ہے اس کے باوجود کافروں کی سزا کے قطعی ہونے کے بیان کے لیے اعلان کرتا ہے کہ ان کی سزا کے وسائل ابھی سے آمادہ و تیار ہیں۔

"سلاسل" جمع ہے سلسلہ کی، جو زنجیر کے معنی میں ہے اور "اغلال" جمع ہے "غل" کی جو اس حلقہ (طوق) کے معنی میں ہے جسے گردن یا ہاتھوں میں ڈال دیتے ہیں، اس کے بعد اسے زنجیر سے باندھ دیتے ہیں[1]

بہر حال غل و زنجیر کا ذکر اور اس کے بعد آگ کے جلانے والے شعلوں کا تذکرہ، اس گروہ کی بہت بڑی سزا کو بیان کرتے ہیں جس کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے، اور اس میں "عذاب" اور "اسارت" دونوں جمع ہیں۔

یہاں کی شہوات میں آزادی ان کے لیے وہاں کی اسارت کا سبب بن جائے گی اور وہ آگ جو انھوں نے اس دنیا میں بھڑکائی ہے وہ وہاں جہنم اختیار کرے گی اور وہ ان کے دامن گیر ہو جائے گی۔

ایک نکتہ

جنین کا پُر غوغا عالم

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا نطفہ، مرد اور عورت کے نطفہ سے ——— جن میں سے پہلا "اسپرم" یا (جرثومہ) اور دوسرا "اوول" یا (بیضہ) کہلاتا ہے ——— مل کر بنتا ہے۔

"نطفہ" کا اصل وجود، اور اس کے بعد اس کی ترکیب، اور پھر جنین کے مختلف مراحل، عالم آفرینش کے عظیم عجائبات میں سے ہیں، جس کے اسرار سے "جنین شناسی" کے علم کی پیش رفت کے باعث پردہ ہٹ چکا ہے۔ اگرچہ بہت سے اسرار

---

[1] "اغلال" کے معنی کی مزید وضاحت سورۂ یٰس کی آیہ ۸ کے ذیل میں (جلد ۱۸ ص ۲۲۱) مطالعہ فرمائیں۔

ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں۔

مذکورہ عجائبات میں سے، جو ایک چھوٹے سے گوشہ کو تشکیل دیتے ہیں، ذیل کے امور ہیں۔

۱۔ "سپرم" جو مرد کے نطفہ کے پانی کے ساتھ خارج ہوتا ہے، ایک بہت ہی چھوٹا سا خوردبینی زندہ و متحرک موجود ہے، جو ایک سر، گردن اور متحرک دم کا حامل ہوتا ہے، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مرد کے ہر انزال میں دو سو سے پانچ سو ملین تک اسپرم موجود ہو سکتے ہیں جو کئی ملکوں کی لوگوں کی تعداد کے برابر ہوتے ہیں، لیکن اس بے شمار تعداد میں سے صرف ایک یا چند عدد بیضہ میں داخل ہوتے ہیں، اور وہ بارور ہو جاتا ہے۔ نر کے نطفہ کی اس تعداد کے وجود کی وجہ یہ ہے کہ سپرموں کے بیضوں تک پہنچنے اور اس سے ترکیب پانے کے لیے، بہت زیادہ تلف ہو جاتے ہیں اور اگر یہ اتنی بڑی تعداد نہ ہوتی تو شاید بارآور ہونے کا معاملہ مشکل ہو جاتا۔

۲۔ رحم حاملہ ہونے سے پہلے صرف ایک اخروٹ کے برابر ہوتا ہے، لیکن نطفہ کے انعقاد، اور جنین کی پرورش کے بعد اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ کافی جگہ کو گھیر لیتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی دیوار اپنی پہلی حالت پر آجانے کی اتنی قابلیت رکھتی ہے کہ اس عظیم حجم کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہے۔

۳۔ رحم کی دیوار کی رگوں میں خون نہیں ہوتا، بلکہ وہ عضلات کے اندر پرنالے کی صورت میں جاری ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی رگ ہوتی، تو یقینی طور پر رحم کی دیوار کی حد سے زیادہ کشش کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکتی۔

۴۔ بعض ماہرین کا نظریہ یہ ہے کہ عورت کا نطفہ "مثبت برقی بار" کا حامل ہوتا ہے اور "سپرم" "منفی برقی بار" رکھتا ہے، لہٰذا وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں، اور اسی بناء پر دوسرے "سپرم" جو اس کے اطراف میں ہوتے ہیں، پیچھے دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سپرم" کے داخل ہونے کے ساتھ ہی اس سے مخصوص کیمیائی مادہ نکلتا ہے جو باقی تمام سپرموں کو دور دھکیل دیتا ہے۔

۵۔ جنین ایک بڑے تھیلے کے اندر ایک گاڑھے قسم کے پانی میں ——— جسے "آمنی یوس" کہا جاتا ہے۔ غوطہ ور ہوتا ہے، جو ماں کی طرح طرح کی تند و تیز حرکات، یا شکم کے اوپر کسی چیز کے لگنے کے مقابلہ میں ضربِ ضرب کی خاصیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں جنین کو ایک خاص حد تک گرم رکھنے کی صورت میں حفاظت کرتا ہے اور بیرونی حرارت میں تبدیلیاں اس میں جلدی سے اثر نہیں کرتیں، اور سب سے زیادہ عمدہ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اسے بے وزنی کی حالت میں قرار دے دیتا ہے، اور جنین کے مختلف اعضاء کو، ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے سے ——— جو بعض نقصانات کا سبب بن سکتے ہیں ——— روکتا ہے۔

۶۔ جنین کی خوراک اور غذا "جفت" (آنول) "بندناف" کے راستہ سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ یعنی ماں کا خون تمام غذائی مواد اور آکسیجن کے ساتھ آنول نال میں داخل ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے صاف ہو کر بندناف کی راہ سے جنین کے دل میں داخل ہو جاتا ہے، اور وہاں سے تمام اعضائے بدن میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ دل کا دایاں اور بایاں بطن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ چونکہ وہاں خون کے صاف ہونے کا مسئلہ پھیپھڑے کے ذریعہ نہیں ہوتا، کیونکہ جنین سانس نہیں لیتا، لیکن پیدا ہونے کے ساتھ ہی بطن کے دونوں غار (گڑھے) ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، اور آلاتِ تنفس اپنا کام شروع کر دیتے ہیں[1]

---

[1] اس بحث میں کتاب "اولین دانش گاہ و آخرین پیغمبر" کی جلد اوّل اور دوسری کتابوں سے استفادہ ہوا ہے۔

۵۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا ۚ
۶۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ۝
۷۔ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ۝
۸۔ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝
۹۔ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوْرًا ۝
۱۰۔ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ۝
۱۱۔ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْیَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۚ

ترجمہ

۵۔ ابرار (نیک لوگ) ایسے پیالے سے پئیں گے، جس میں عمدہ عطر کی آمیزش ہوگی۔
۶۔ وہ ایسا چشمہ ہوگا جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے اور وہ اسے جہاں چاہیں گے جاری کرلیں گے۔
۷۔ وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں، اور اس دن سے کہ جس کا عذاب وسیع ہوگا، ڈرتے رہتے ہیں۔
۸۔ اور "اپنا" کھانا، اس کی خواہش اور احتیاج رکھنے کے باوجود، مسکین و یتیم و اسیر کو دے دیتے ہیں۔
۹۔ (اور وہ یہ کہتے ہیں:) ہم تو تمھیں خدا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، اور ہم تم سے نہ تو کسی قسم کا کوئی اجر مانگتے ہیں اور نہ ہی ہم تم سے کسی شکریہ کے طلبگار ہیں۔
۱۰۔ ہم تو اپنے پروردگار سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت ہی سخت اور شدید ہوگا۔
۱۱۔ اسی وجہ سے خدا انھیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور ان کا اس حال میں استقبال کرے گا کہ وہ شادمان اور مسرور ہوں گے۔

شانِ نزول

اہلِ بیت پیغمبرؐ کی فضیلت پر ایک عظیم سند

ابنِ عباس کہتے ہیں کہ حسن و حسین بیمار ہوئے تو پیغمبرؐ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے آئے اور علیؑ سے کہا اے ابوالحسن بہتر یہ ہے کہ تم اپنے بچوں کی شفا کے لیے نذر مانو، تو علیؑ اور فاطمہؑ اور فضہ نے ——— جو ان کی خادمہ تھیں، نذر مانی، کہ اگر انھوں نے شفاء پائی تو وہ تین دن روزہ رکھیں گے۔ (بعض روایات کے مطابق حسنؑ و حسینؑ نے بھی کہا کہ ہم بھی نذر مانتے ہیں کہ ہم بھی روزہ رکھیں گے)

زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ دونوں شفایاب ہو گئے لیکن حالت یہ تھی کہ ان کے پاس کھانے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ علیؑ نے تین صاع جَو قرض لیے اور فاطمہؑ نے اس میں سے ایک تہائی کا آٹا پیسا اور روٹیاں پکائیں، ایک سائل گھر کے دروازے پر آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم اہلِ بیت محمدؐ! اے اہلِ بیتِ محمد تم پر سلام ہو! میں ایک مسلمان فقیر و مسکین ہوں، مجھے کھانا دو، خدا تمھیں بہشتی کھانے دے، ان سب نے مسکین کو اپنے اوپر ترجیح دی اور اپنا اپنا حصہ اس کو دے دیا اور اس رات انھوں نے صرف پانی سے افطار کیا۔

دوسرے دن اسی طرح روزہ رکھا اور افطار کے وقت جب (اسی نانِ جویں کا) کھانا تیار ہو گیا تو ایک یتیم گھر کے دروازے پر آیا، تو اس دن بھی ایثار کیا اور اپنا کھانا اسے دے دیا (دوبارہ پھر پانی سے ہی افطار کیا اور تیسرا روزہ بھی رکھا)۔

تیسرے دن غروب آفتاب کے وقت ایک اسیر (قیدی) گھر کے دروازے پر آیا، پھر سب نے اپنے اپنے کھانے کا حصہ اسے دے دیا، جب صبح ہوئی تو علیؑ نے حسنؑ و حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے، جب پیغمبرؐ نے مشاہدہ کیا تو دیکھا کہ وہ بھوک کی شدت سے کانپ رہے تھے، آپ نے فرمایا: تمھاری یہ حالت جو میں دیکھ رہا ہوں میرے لیے بہت ہی گراں ہے۔ پھر آپ کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ چل پڑے جب آپ فاطمہؑ کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ مخدومہ محرابِ عبادت میں کھڑی ہیں اور بھوک کی شدت سے ان کا پیٹ پشت سے لگا ہوا ہے اور آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں۔ پیغمبرؐ کو بہت دکھ ہوا۔

اسی وقت جبرئیل نازل ہوئے اور کہا اے محمدؐ! یہ سورہ لیجیے، خدا ایسے اہلِ بیت کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہے۔ اس کے بعد سورہ "ہل اتیٰ" کی تلاوت کی۔ (بعض نے کہا ہے کہ آیہ "ان الابرار" سے لے کر "کان سعیکم مشکورًا" کی آیت تک، جو مجموعی طور پر اٹھارہ آیات ہیں اسی موقع پر نازل ہوئی ہیں)۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، یہ اس حدیث کی نص ہے جو کتاب "الغدیر" میں اسی سلسلہ کی بہت سی روایات میں "قدر مشترک" کے عنوان سے، تھوڑے سے اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور اسی کتاب میں اہلِ سنت کے مشہور علماء میں سے ۳۴ افراد کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے (کتاب کے نام اور اس کے صفحہ کے ذکر کے ساتھ)۔

اس طرح سے اوپر والی روایت ان روایات میں سے ہے جو اہلِ سنت میں مشہور بلکہ متواتر ہے[1]

---

[1] "الغدیر" جلد ۳ ص ۱۰۷ تا ۱۱۱، اور کتاب "احقاق الحق" جلد ۲ ص ۱۵۷ تا ۱۷۱، میں اوپر والی حدیث اہلِ سنت کے ۲۶ علماء سے ماخذ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

باقی رہے شیعہ علماء تو وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اٹھارہ آیات، یا یہ سارے کا سارا سورہ، اوپر والے واقعہ میں نازل ہوا ہے اور سب نے بلا استثناء، تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں، اس واقعہ سے مربوط روایت کو، علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے بیٹوں کے افتخارات اور اہم فضائل میں سے ایک کے عنوان سے نقل کیا ہے۔

یہاں تک کہ ——— جیسا کہ ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کیا تھا ——— یہ مطلب اتنا مشہور و معروف ہے کہ شعراء کے اشعار اور حتیٰ کہ "امام شافعی" کے مشہور اشعار میں آیا ہے۔

یہاں بہانہ جوئی کرنے والے لوگوں نے ——— جو علیؑ کے فضائل تک پہنچتے ہی حد سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں ——— اس شانِ نزول کے سلسلہ میں انتہائی محنت کے ساتھ اعتراض گھڑے ہیں اور بہت زیادہ نکتہ چینیاں کی ہیں، منجملہ ان کے یہ ہیں:۔

۱۔ یہ سورہ "مکی" ہے، جبکہ شانِ نزول کی داستان امام حسینؑ اور امام حسنؑ کی ولادت کے بعد سے مربوط ہے، جو یقینی طور پر مدینہ میں ہوئی ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمارے پاس ایسے واضح اور روشن دلائل موجود ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سارے کا سارا سورہ "ہل اتی" یا کم از کم اس کی اٹھارہ آیات مدنیہ میں نازل ہوئی ہیں۔

۲۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، انھیں معین افراد کے ساتھ کس طرح تخصیص دی جا سکتی ہے۔

لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ آیت کے مفہوم کا عام ہونا، اس کے خاص محل میں نازل ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، قرآن کی بہت سی آیات عام اور وسیع مفہوم رکھتی ہیں، لیکن اس کی شانِ نزول جو اس کا کامل اور اعلیٰ مصداق ہے۔ وہ ایک خاص محل کے لیے ہوتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص آیت کے مفہوم کو شانِ نزول کی نفی پر دلیل قرار دے۔

۳۔ بعض نے کچھ اور دوسرے شانِ نزول نقل کیے ہیں جو اوپر والے شانِ نزول کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، منجملہ ان کے "سیوطی" نے "درالمنثور" میں یہ نقل کیا ہے کہ ایک سیاہ فام آدمی پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا، اور اس نے "تسبیح" و "تہلیل" کے بارے میں سوال کیا۔ تو عمر نے کہا بس کرو۔ رسولِ خداؐ سے زیادہ سوالات نہ کرو، پیغمبرؐ نے فرمایا: اے عمر خاموش رہ، تو اس موقع پر "سورہ ہل اتی" پیغمبرؐ پر نازل ہوئی[1]

ایک اور دوسری حدیث میں اسی کتاب میں آیا ہے کہ حبشہ کا ایک شخص رسولِ خداؐ کی خدمت میں آیا، وہ آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا، کہ سوال کرو اور اس کا جواب لو، اس نے عرض کیا: اے رسولِ خدا آپ کا گروہ رنگ، صورت اور نبوت کے لحاظ سے ہم پر برتری رکھتا ہے۔ لیکن اگر میں اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ ایمان لائے ہیں اور جو عمل آپ کرتے ہیں میں بھی وہی عمل کروں، تو کیا میں جنت میں آپ کے ساتھ ہوں گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جنت میں سیاہ رنگ والوں کی سفیدی ہزار سال کی راہ سے نظر آئے گی اور پھر پیغمبرؐ نے لا الٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ وبحمدہ کہنے کے لیے بہت سے اہم ثواب بیان فرمائے اور اس موقع پر سورہ "ہل اتیٰ" نازل ہوئی[2]

---

[1] "درالمنثور"، جلد ۶ ص ۲۹۷

[2] گزشتہ ماخذ

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ روایات تقریباً کسی قسم کی مناسبت، سورہ "ہل اتی" کی آیات کے مضمون کے ساتھ نہیں رکھتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شانِ نزول کو پائمال کرنے کے لیے، بنی امیہ کے کارندوں یا ان ہی جیسے لوگوں کی طرف سے گھڑی گئی ہے۔

۴۔ ایک اور بہانہ جو ممکن ہے یہاں پیش کیا جائے، یہ ہے کہ انسان تین دن تک کس طرح سے بھوکا رہ سکتا ہے کہ صرف پانی پر ہی افطار کرے؟

لیکن یہ ایک عجیب اعتراض ہے، کیونکہ ہم نے خود کئی ایسے افراد کو دیکھا ہے کہ انھوں نے بعض طبی علاجوں کے لیے ——— تین دن تو بہت ہی آسان ہیں ——— مشہور "چالیس دن" کا چلّہ کاٹا ہے، یعنی مکمل چالیس دن تک صرف پانی پیا ہے اور بالکل کوئی کھانا نہیں کھایا اور یہی چیز ان کو بہت سی بیماریوں کا شفاء کا باعث بن گئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم مشہور طبیب "الکسی سوفورین" نے ایک کتاب اس قسم کے صبر کرنے سے علاج کے اہم اثرات کے سلسلہ میں، اس کے دقیق پروگرام کے ذکر کے ساتھ لکھی ہے[1]

یہاں تک کہ اگر آپ تعجب نہ کریں تو تفسیر نمونہ کے بعض ہم کاروں نے یہ چلّہ ۲۲ دن تک عملاً انجام دیا ہے۔

۵۔ بعض دوسرے افراد اس بناء پر کہ آسانی کے ساتھ اس فضیلت کے قریب سے گزر جائیں، ایک اور طریقہ سے وارد ہوتے ہیں مثلاً "آلوسی" کہتا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ سورہ علیؑ و فاطمہؑ کے بارے میں نازل نہیں ہوا تو ان کی قدر و منزلت میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی، کیونکہ ان کا "ابرار" کے عنوان میں داخل ہونا ایک واضح و آشکار مطلب ہے، جسے ہر شخص جانتا ہے، اس کے بعد ان کے بعض فضائل پیش کر کے کہتا ہے، ان دو بزرگ ہستیوں کے بارے میں انسان کیا کہہ سکتا ہے، سوائے اس کے کہ علیؑ مومنین کے مولا اور پیغمبرؐ کے وصی ہیں، اور فاطمہ پیغمبر کے بدن کا حصہ اور وجودِ محمدیؐ کا جز ہیں اور حسنینؑ روح و ریحان اور جوانانِ جنت کے سردار ہیں، لیکن اس بات کا مفہوم دوسروں کو چھوڑ دینا اور انھیں ترک کرنا نہیں ہے، بلکہ جو شخص اس راستہ کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرے وہ گمراہ ہے[2]

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر بناء یہ ہو کہ اس فضیلت کو باوجود اس شہرت کے نظر انداز کر دیں، تو باقی فضائل بھی آہستہ آہستہ اس قسم کی سرنوشت سے دوچار ہو جائیں گے اور ایک دن ایسا آجائے گا کہ بعض لوگ علیؑ اور خاتون اسلام اور حسنین علیہما السلام کی اصل فضیلت کا ہی انکار کر دیں گے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں خود علیؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے متعدد موارد میں، ان آیات کے اپنے اور اپنے شہزادوں کے بارے میں نزول سے مخالفین کے مقابلہ میں استدلال کیا ہے[3]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "اسیر" عام طور پر "مدینہ" میں ہی موجود تھے اور مکہ میں اس بناء پر کہ ابھی اسلامی جنگیں شروع ہی نہیں ہوئی تھیں، لہٰذا کسی اسیر کا وجود ہی نہیں تھا، اور یہ اس سورہ کے مدنی ہونے کی ایک اور گواہی ہے۔

---

[1] یہ کتاب "روزہ، روشن نوین برائے درمان بیماریہا" کے نام سے فارسی میں ترجمہ و نشر ہو چکی ہے۔

[2] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۵۸

[3] "احتجاج طبرسی" و "خصال صدوق" (مطابق نقل المیزان جلد ۲۰ ص ۲۲۴)

آخری نکتہ کہ جس کا ذکر کرنا ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ علماء اسلام کی ایک جماعت کے قول کے مطابق جن میں اہلِ سنت کے مشہور مفسر "آلوسی" بھی ہیں، اس سورہ میں جنت کی بہت سی نعمتوں کو شمار کیا گیا ہے۔ لیکن حور العین کے بارے میں ——— جنھیں عام طور پر قرآن مجید میں جنت کی نعمتوں کو شمار کرتے وقت بیان کیا جاتا ہے ——— بالکل گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ امر اس بناء پر ہو کہ چونکہ اس سورہ کا نزول فاطمہ زہراؑ، ان کے شوہر نامدار اور ان کے فرزندانِ عالی قدر کے بارے میں ہے، لہٰذا بانوئے اسلام کے احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے "حور" کا کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا۔[1]

اگرچہ ہماری بحث اس شانِ نزول کے سلسلہ میں طویل ہو گئی ہے، لیکن بہانہ گھڑنے والے لوگوں کی اعتراض تراشیوں کے مقابلہ میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

تفسیر

ابرار کے لیے عظیم اجر

گزشتہ آیات میں، انسانوں کو دو گروہوں "شکور" و "کفور" یا "شکر گزار" اور "کفران کرنے والوں" میں تقسیم کرنے کے بعد، کفران کرنے والوں کے لیے سخت سزا اور عذاب کا ایک مختصر سا اشارہ ہوا تھا۔ زیرِ بحث آیات میں شکر کرنے والوں اور ابرار (نیک و پاک) لوگوں کی جزا کو بیان کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں بہت ہی عمدہ نکات پیش کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "نیک لوگ ایسے جام سے نوش کریں گے، جس میں بہت ہی اچھے عطر کی آمیزش ہوگی" (ان الابرار یشربون من کأس کان مزاجها کافورًا)۔

"ابرار" جمع ہے "بر" (بروزن رب) کی جو اصل میں وسعت اور پھیلاؤ کے معنی میں ہے اور اسی بناء پر وسیع و عریض صحراؤں کو "بر" کہتے ہیں اور چونکہ نیکو کار افراد کے اعمال معاشرے کی سطح پر وسیع نتائج رکھتے ہیں، لہٰذا اس لفظ کا ان پر اطلاق ہوتا ہے اور "بر" (با کی زیر کے ساتھ) "نیکو کاری" کے معنی میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کے اور "خیر" کے درمیان یہ فرق ہے کہ "بر" اس نیکی کے معنی میں ہے جو توجہ کے ساتھ ملی ہوئی ہو، جبکہ خیر اس سے عام معنی رکھتا ہے۔

"کافور" کے لغت میں متعدد معنی ہیں، اس کے مشہور معانی میں سے ایک اچھی خوشبو ہے اسی طرح سے ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے اور اس کے معانی میں سے ایک وہی عام "کافور" ہے جس کی بُو تیز ہوتی ہے اور طبی مصارف کے لیے، منجملہ ان کے عفونت کے توڑ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال اوپر والی آیت بتاتی ہے کہ جنت کی یہ شراب طہور بہت ہی معطر اور خوشبودار ہے، جس سے قوتِ ذائقہ بھی لذت

---

[1] روح المعانی جلد ۲۹ ص ۱۵۸

حاصل کرتی ہے اور قوتِ شامہ بھی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ کافور "جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے، لیکن یہ تفسیر "کان مزاجھا کافورًا" کی تعبیر کے ساتھ جو یہ کہتی ہے کہ کافور کی اس میں آمیزش ہو گی، سازگار نہیں ہے۔

دوسری طرف اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ "کافور" "کفر" کے مادہ سے "ڈھانپنے" کے معنی میں ہے۔ بعض اربابِ لغت کا نظریہ، جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں لکھا ہے، یہ ہے کہ "کافور" کے لیے اس نام کا انتخاب اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ اس درخت کا پھل ——— جس سے یہ مادہ لیا جاتا ہے ——— غلافوں کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے۔

بعض نے "کافور" کی تعبیر کو اس کی حد سے زیادہ سفیدی اور ٹھنڈک کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ عام کافور بھی "ٹھنڈک" اور "سفیدی" کے لحاظ سے ضرب المثل ہے۔

لیکن مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے، خصوصًا اس بناء پر کہ بعض اوقات تعبیروں میں کافور کو مشک و عنبر کا ہم پلہ شمار کرتے ہیں جو بہترین خوشبوؤں میں سے ہیں۔

اس کے بعد اس سرچشمہ کی طرف جس سے شرابِ طہور کا یہ جام پُر ہوتا ہے، اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ ایک خاص چشمہ ہے جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے اور اسے جہاں چاہیں گے، جاری کر لیں گے" (عینًا یشرب بھا عباد اللہ یفجرونھا تفجیرًا)۔[۱]

ہاں! یہ شرابِ طہور کا چشمہ کچھ اس طرح سے ابرار اور عباد اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جہاں کہیں سے ارادہ کریں گے وہیں سے پھوٹ پڑے گا اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس کی تعریف و توصیف میں فرمایا:

ھی عین فی دار النبی (ص) تفجر الی دور الانبیاء والمؤمنین

"یہ ایک ایسا چشمہ ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے گھر میں ہے اور وہاں سے تمام انبیاء اور مومنین کے گھروں میں جاری ہو گا"۔[۲]

ہاں! جس طرح دنیا میں علم و رحمت کے چشمے پیغمبر اکرمؐ کے گھر سے خدا کے بندوں اور نیک لوگوں کی طرف جاتے ہیں، آخرت میں بھی جو اس

---

[۱] اس بارے میں کہ "عینًا" کی نصب کس بناء پر ہے بہت سے احتمال دیئے گئے ہیں، شاید سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "عینا" "منصوب بہ نزع خافض" ہے اور تقدیر میں "من عین" تھا اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "کافورًا" سے "بدل" ہے، یا اختصاص یا مدح کی بناء پر منصوب ہے، یا ایک مقدر فعل کا مفعول ہے اور تقدیر میں "یشربون عینا" ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

[۲] "یشرب" "باء" کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے اور اس کے بغیر بھی، اور "بھا" کی "باء" ممکن ہے کہ "من" کے معنی میں ہو۔

[۳] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۷۷ اور
روح المعانی جلد ۲۹ ص ۱۵۵

پروگرام کا ایک عظیم تبسم ہے۔ خدا کی شراب طہور کا چشمہ اسی بیت وحی سے پھوٹے گا، اور اس کی شاخیں مومنین کے گھروں تک جائیں گی

"یفجرون" "تفجیر" کے مادہ سے اصل میں "فجر" سے لیا گیا ہے، جو وسیع پیمانہ پر شگاف کرنے کے معنی میں ہے چاہے زمین میں شگاف کرنا ہو، یا کسی دوسری چیز میں اور چونکہ صبح کی روشنی گویا رات کے پردے کو پھاڑ دیتی ہے، اس لیے اس کو فجر کہا جاتا ہے اور فاسق شخص کو اس لیے "فاجر" کہتے ہیں، کیونکہ اس نے حیا و شرم اور پاکیزگی کے پردہ کو چاک کر دیا ہے، اور حق کے راستہ سے باہر ہو گیا ہے۔

لیکن زیر بحث آیت میں زمین میں شگاف کرنے کے معنی میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جنت کی فراواں نعمتوں میں سے جو اس سورہ میں بیان کی گئی ہیں، پہلی نعمت "خاص قسم کی معطر شراب طہور" کا ذکر ہوا ہے، اور یہ شاید اس بناء پر ہے کہ محشر کے حساب سے فارغ ہونے کے بعد، پہلے ہی قدم میں جو وہ جنت میں رکھیں گے، تو اس شراب کے پیتے ہی ہر قسم کے غم واندوہ پریشانی اور آلائش کو اپنی جان سے دھو ڈالیں گے، اور حق تعالیٰ کے عشق سے سرمست ہو کر جنت کے باقی مواہب اور نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔

بعد والی آیت میں ان اعمال و اوصاف کا ذکر کرتا ہے جو "ابرار" اور "عباد اللہ" میں پائے جاتے ہیں، پانچ صفات کا ذکر کرنے کے ساتھ ان بے مثل و بے نظیر نعمتوں کے لیے ان کے استحقاق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں" (یوفون بالنذر)۔

"اور اس دن سے کہ جس کا شر اور عذاب پھیلا ہوا ہو گا، ڈرتے ہیں" (و یخافون یوما کان شرہ مستطیرا)۔

"یوفون" و "یخافون" اور اس کے بعد والے جملے، جو سب کے سب "فعل مضارع" کی صورت میں آئے ہیں اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ ان کا دائمی اور ہمیشہ کا پروگرام ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے شان نزول میں بیان کیا ہے۔ ان آیات کے اتم و اکمل مصداق امیر المومنین علیؑ و فاطمہؑ زہرا اور ان کے فرزند حسنؑ و حسینؑ "سلام اللہ علیہم اجمعین" ہیں، جنھوں نے تین دن روزہ رکھنے کے سلسلہ میں اپنی نذر پوری کی، اور انھوں نے پانی کے علاوہ اور کسی چیز سے افطار نہیں کیا اور ان کا دل خوف خدا اور خوف قیامت سے مالا مال تھا۔

"مستطیر" وسیع اور پھیلے ہوئے کے معنی میں ہے اور اس دن کے گوناگوں اور وسیع عذابوں کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال جب وہ ان نذروں کو جو انھوں نے اپنے اوپر واجب کر لی ہیں، پورا کرتے ہیں، تو واجبات الٰہی کو تو بطریق اولیٰ احترام کے ساتھ پورا کرتے ہیں، یعنی ان کو بخوبی انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس عظیم دن کے شر سے ان کا خوف، مسئلہ معاد کے بارے میں ان کے ایمان، اور حکم خدا کے مقابلہ میں شدید احساس مسئولیت کی طرف اشارہ ہے۔

وہ معاد پر اچھی طرح یقین رکھتے ہیں اور بدکاروں کی تمام سزاؤں پر ان کا ایمان ہے اور اس ایمان کا اثر ان کے اعمال میں پورے طور پر نمایاں ہے۔

اس کے بعد ان کے تیسرے اچھے عمل کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اپنا کھانا اس کی ضرورت واحتیاج ہونے کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیتے ہیں"۔ (ویطعمون الطعام علیٰ حبّہ مسکینًا ویتیمًا واسیرًا)۔

ان کا کھانا کھلانا کوئی آسان بات نہیں ہے، بلکہ شدید ضرورت اور احتیاج کے وقت میں ایثار وقربانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دوسری طرف وہ ایک ایسا وسیع پیمانہ کا کھانا کھلانا ہے جو کئی قسم کے ضرورت مندوں، مسکین، یتیم واسیر کو شامل ہے، تو اس طرح سے ان کی رحمت عام اور ان کی خدمت وسیع ہے۔

"علیٰ حبّہ" کی ضمیر "طعام" کی طرف لوٹتی ہے، یعنی باوجود اس کے کہ انھیں کھانے کی خود ضرورت ہے، پھر بھی وہ انفاق کر دیتے ہیں، اس طرح یہ اسی چیز سے مشابہ ہے جو سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۹۲ میں آئی ہے، (لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون) تم ہرگز بھی نیکوکاری کی حقیقت کو نہ پہنچو گے، جب تک کہ تم اس میں سے خرچ نہ کرو، جسے تم دوست رکھتے ہو۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مذکورہ ضمیر "اللہ" کی طرف لوٹتی ہے، جو گزشتہ آیات میں آیا ہے، یعنی وہ پروردگار کے عشق میں کھانا کھلاتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ معنی بعد والی آیت میں آرہا ہے، پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

"مسکین" و "یتیم" و "اسیر" کے معنی واضح ہیں، لیکن اس بارے میں کہ اسیر سے مراد کون سا اسیر ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بہت سوں نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ اسیر ہیں جنھیں مشرکین وکفار میں سے پکڑ کر حکومت اسلامی کے قلمرو، مدینہ میں لے آتے تھے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جو اپنے مالک کے ہاتھوں میں اسیر ہوتے ہیں اور بعض نے اس کی زندان کے قیدیوں کے ساتھ تفسیر کی ہے، لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ شانِ نزول کے مطابق وہ اسیر شخص علیؑ کے گھر کے دروازے پر افطار کے وقت آیا، تو کیا قیدی زندان میں نہیں ہوتے تھے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ سوال واضح ہو جاتا ہے کہ تواریخ کی نقل کے مطابق پیغمبرؐ کے زمانہ میں کوئی قید خانہ نہیں تھا، اور آنحضرتؐ اسیروں کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے، اور انھیں یہ حکم دیا کرتے تھے کہ تم ان کی نگرانی کرو، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مگر جب وہ ان کو کھانا دینے کی توانائی نہیں رکھتے تھے، تو وہ دوسرے مسلمانوں سے قیدیوں کے کھانے کے سلسلہ میں مدد لیتے تھے، اور انھیں اپنے ہمراہ لے جا کر یا کبھی اپنی ہمراہی کے بغیر بھی دوسرے مسلمانوں کی طرف بھیج دیتے تھے، تاکہ وہ ان کی مدد کریں، کیونکہ اس وقت مسلمان انتہائی تنگی میں تھے۔

البتہ بعد میں جب سلطنت اسلامی میں وسعت پیدا ہوگئی اور اسیروں کی تعداد بڑھ گئی، اور حکومت کے دامن کی وسعت کی بناء پر مجرمین کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تو پھر قید خانے بنائے گئے اور اسیروں اور مجرموں کے کھانے پینے کا انتظام بیت المال کے ذریعہ ہونے لگا۔[1]

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "احکام زندان در اسلام" کی طرف رجوع کریں۔

بہرحال اوپر والی آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بہترین اعمال میں سے ایک عمل محروم اور ضرورت مندوں کو کھانا کھلانا ہے، نہ صرف مسلمان ضرورت مند بلکہ بلا دشرک کے اسیر بھی اسلام کے اس حکم کے ماتحت آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو کھانا کھلانا "ابرار" کے عمدہ کاموں میں سے ایک عمدہ کام شمار ہوا ہے۔

ایک حدیث میں رسولِ خداؐ سے آیا ہے:

استوصوا بالاسرٰی خیرًا وکان احدھم یؤثر اسیرہ بطعامہ

اسیروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مسلمانوں نے جب یہ بات سنی تو وہ بعض اوقات اپنا کھانا بھی قیدی کو دے دیتے تھے، اور اسے اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے[1]

ابرار کا چوتھا عمدہ عمل اخلاص کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمھیں صرف خدا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے نہ تو اس کا کوئی اجر مانگتے ہیں، اور نہ ہی کسی شکریہ کے طالب ہیں" (انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورًا)۔

یہ پروگرام مسئلہ اطعام پر ہی منحصر نہیں ہے، بلکہ ان کے تمام اعمال مخلصانہ اور خدا کی پاک ذات کے لیے ہوتے تھے، اور وہ لوگوں کی طرف سے کسی اجر کی امید، بلکہ ان کی طرف سے کسی قدردانی اور تشکر کی تمنا بھی نہیں کرتے، اور اسلام میں اصولی طور پر عمل کی قدر و قیمت خلوصِ نیت پر ہے، ورنہ وہ اعمال جو غیر اللہ کے لیے کئے جائیں، چاہے وہ ریاکارانہ ہوں یا ہوائے نفس کی بناء پر ہوں، یا لوگوں کے تشکر اور قدردانی کی وجہ سے یا مادی اجر و پاداش کی بناء پر، ان کی کوئی معنوی اور خدائی قدر و قیمت نہیں ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث:

"لا عمل الا بالنیۃ و انما الاعمال بالنیات"

بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

"وجہ اللہ" سے مراد، وہی خدا کی ذات ہی ہے، ورنہ خدا کوئی جسمانی چہرہ نہیں رکھتا، اور یہ وہی چیز ہے، جس پر قرآن کی تمام آیات میں تکیہ و تاکید ہوئی ہے، سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۷۲ میں آیا ہے: (و ما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ) تم خدا کے علاوہ اور کسی کے لیے انفاق نہ کرو، اور سورۂ کہف کی آیہ ۲۸ میں پیغمبر کے شائستہ اصحاب کی توصیف میں اس طرح آیا ہے:

(واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ و العشی یریدون وجھہ)

"ایسے لوگوں کے ساتھ رہ جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور صرف اسی کی ذات کو چاہتے ہیں۔

اور "ابرار" کی آخری توصیف میں فرماتا ہے: "وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے پروردگار سے اس دن کے لیے خائف ہیں جو بہت ہی سخت اور شدید ہوگا" (انا نخاف من ربنا یومًا عبوسًا قمطریرًا)۔

---

[1] "کامل ابن اثیر" جلد ۲ ص ۱۲۱

یہ بات " ابرار " کی زبانِ حال بھی ہوسکتی ہے اور زبانِ قال بھی ۔

روزِ قیامت کی " عبوس " اور " سخت " دن کے ساتھ تعبیر، جبکہ عبوس انسان کی ایک صفت ہے اور ایسے افراد کو کہتے ہیں، جن کے چہرے بگڑ جائیں، یہ اس دن کی وحشت ناک وضع وکیفیت کی تاکید کے لیے ہے، یعنی اس دن کے حوادث اس قدر سخت اور تکلیف دہ ہیں کہ نہ صرف انسان اس دن عبوس اور ترشرو ہوں گے، بلکہ گویا خود وہ دن بھی عبوس اور بگڑے ہوئے چہرہ والا ہوگا ۔

اس بارے میں کہ " قمطریر " کس مادہ سے لیا گیا ہے، مفسرین اور اربابِ لغت کے درمیان اختلاف ہے، بعض اس کو " قمطر " سے سمجھتے ہیں اور بعض اس کو " قطر " (بروزن مرغ) سے مشتق اور اس کی میم کو زائد سمجھتے ہیں ۔

لیکن مشہور وہی پہلا ہے جو شدید اور عبوس کے معنی میں ہے [1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر " ابرار "، صرف خدا ہی کی پاک ذات کے لیے کام کرتے ہیں تو پھر وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہم قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرتے ہیں، کیا خدائی محرک، قیامت کے عذاب کے خوف کے محرک کے ساتھ سازگار ہے؟ :

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بہرحال خدا کے لیے قدم اٹھاتے ہیں، اور اگر وہ قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کا عذاب ہے، اور اگر وہ جنت کی نعمتوں کو چاہتے ہیں تو اس بناء پر کہ وہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں، اور یہ وہی چیز ہے جو فقہ میں " نیّت عبادت " کے باب میں بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ : عبادات میں قصدِ قربت، ثواب کی آرزو، عذاب کے خوف، یہاں تک کہ خدا سے اس دنیا کی مادی نعمتوں کے طلب کرنے (مثلاً بارش کے طلب کرنے کے لیے نمازِ استسقاء) کے محرکات کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا، کیونکہ ان سب کی بازگشت خدا کی طرف سے ہے اور اصطلاح کے مطابق " داعی پر داعی " کی قسم سے ہے، اگرچہ عبادت کا اعلیٰ ترین مرحلہ یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کی خواہش اور دوزخ کے عذاب کا خوف بھی اس کا محرک نہ ہو بلکہ وہ سراسر " حبا اللہ " کے عنوان سے انجام پائے ۔

" انّا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا " کی تعبیر بھی اس بات پر شاہد ہے کہ یہ خوف بھی پروردگار کے خوف میں سے ہے ۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان پانچوں اوصاف میں سے دوسرا وصف اور پانچواں وصف، دونوں خوف کا مسئلہ ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ پہلی میں صرف قیامت کے دن کے خوف کے متعلق گفتگو ہے اور دوسری میں قیامت کے دن پروردگار کا خوف ہے، ایک موقع پر روزِ قیامت کی اس طرح سے توصیف ہوئی ہے کہ اس کا شر اور عذاب وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور دوسرے موقع پر عبوس اور شدید ہے، جو حقیقت میں ایک تو اس کی وسعت کو بتاتی ہے اور دوسری اس کی کیفیت کی وسعت کو ۔

آخری زیرِ بحث آیت میں " ابرار " کے نیک اعمال اور پاک نیّتوں کے اجمالی نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " انھیں امور کی بناء پر خدا انھیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور ان کا مسرت وشادمانی کی حالت میں استقبال کرے گا (فوقاھم اللہ شر

---

[1] " مفردات " " راغب " " لسان العرب " " المنجد " " قرطبی " و " مجمع البیان "

ذالك اليوم ولقّاهم نضرة وسرورًا)۔

" نضرة " طراوت، خرمی اور ایک خاص قسم کی شادابی کے معنی میں ہے جو فورِ نعمت اور آسودگی کے زیر اثر انسان کو حاصل ہوتی ہے، ہاں! اس دن ان کے رخساروں کا رنگ ان کے سکون و آرام اور اندرونی سرور و نشاط کی خبر دے گا۔

اس بنا پر اگر وہ دنیا میں اس دن کے احساسِ مسئولیت سے خوف زدہ تھے، تو خدا اس کے بدلے میں انھیں قیامت کے دن سرور و شادمانی میں غرق کر دے گا۔

" لقّاهم " کی تعبیر بہت ہی عمدہ تعبیروں میں سے ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خداوندِ عالم ان گرامی قدر مہمانوں کا اپنے خاص لطف سے استقبال کرے گا اور انھیں جو خوشی و سرور میں غرق ہوں گے، اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے گا۔

ایک نکتہ

بھوکوں کو سیر کرنا بہترین حسنات میں سے

نہ صرف زیرِ بحث آیات میں، کھانا کھلانے کو ابرار اور عبادالله کے عمدہ کاموں میں سے ایک شمار کرتا ہے، بلکہ قرآن کی بہت سی آیات میں اس معنی پر تکیہ اور تاکید ہوئی ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کام خدا کی بارگاہ میں ایک خاص قسم کی محبوبیت رکھتا ہے۔

اور اگر ہم آج کی دنیا پر نگاہ کریں تو منتشر ہونے والی خبروں کے مطابق، ہر سال کئی ملین افراد بھوک سے مرجاتے ہیں، جبکہ دنیا کے دوسرے امیر علاقوں میں، اس قدر زیادہ بچے ہوئے کھانے کوڑے میں پھینک دیئے جاتے ہیں کہ جس کا کوئی حساب نہیں ہے، اس سے ایک طرف تو اس اسلامی حکم کی اہمیت اور دوسری طرف سے آج کی دنیا کا اخلاقی اقدار و موازین سے دور ہوجانا واضح ہوجاتا ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے، ہم نمونہ کے طور پر یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من اطعم ثلاثة نفر من المسلمين اطعمه الله من ثلاث جنات في ملكوت السماوات

" جو شخص مسلمانوں میں سے تین افراد کو کھانا کھلائے گا تو خدا اسے آسمانوں کے ملکوت میں جنت کے تین باغوں سے کھانا کھلائے گا"۔[1]

---

[1] " اصول کافی" جلد دوم باب " اطعام المومن" حدیث ۳

۲۔ ایک اور حدیث میں امام صادق سے یہ آیا ہے :

من اطعم مؤمنًا حتّٰی یشبعه لم یدر احد من خلق الله ماله من الاجر فی الاٰخرة ، لا ملك مقرب ولا نبیّ مرسل الّا الله رب العالمین

" جو شخص کسی مومن کو کھانا کھلائے گا ، یہاں تک کہ وہ سیر ہوجائے ، تو مخلوقِ خدا میں سے کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ اسے آخرت میں کس قدر اجر و ثواب ملے گا ، نہ کوئی خدا کا مقرب فرشتہ اور نہ ہی کوئی نبی مرسل ، سوائے خدا کے جو عالمین کا پروردگار ہے "[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں اسی امامؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

لان اطعم مؤمنًا محتاجًا احب الیّ من ان ازوره ، ولان ازوره احب الیّ من ان اعتق عشر رقاب

" اگر میں کسی محتاج مومن کو کھانا کھلاؤں ، تو یہ بات میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں صرف اس کے دیدار اور زیارت کے لیے جاؤں ، اور اگر میں اس کے دیدار اور زیارت کے لیے جاؤں تو یہ میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں دس غلاموں کو آزاد کروں "[2]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ روایات میں صرف محتاجوں اور بھوکوں پر تکیہ نہیں ہوا ہے ، بلکہ بعض روایات میں تو صراحت کے ساتھ آیا ہے ، کہ مومنین کو کھانا کھلانا ، اگرچہ وہ بے نیاز ہی کیوں نہ ہوں ، غلام آزاد کرنے کے مانند ہے ، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کام کا مقصد احتیاجات کو دور کرنے اور ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ ، جلب محبت اور دوستی و الفت کے رشتوں کی مضبوطی بھی ہے ۔ اس کے برعکس کہ جو کچھ آج کی مادی دنیا میں معمول ہوچکا ہے کہ بعض اوقات دو قریبی دوست یا دو رشتہ دار کسی ہوٹل یا مہمان خانے میں جاتے ہیں ، تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصّہ کی رقم ادا کرتا ہے ، گویا مہمان بنانے کا مسئلہ خصوصًا زیادہ افراد کو مہمان بنانا گویا ان کے لیے بہت ہی تعجب کا باعث ہے ۔

۴۔ بعض روایات میں یہ تصریح بھی ہوئی ہے کہ بھوکوں کو مطلق طور پر کھانا کھلانا (چاہے وہ مومن اور مسلمان نہ بھی ہوں) افضل اعمال میں سے ہے ۔ جیسا کہ ایک روایت میں پیغمبر گرامیٔ اسلامؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

من افضل الاعمال عند الله ابراد الکباد الحارة واشباع الکباد الجائعة والذی نفس محمد صلی الله علیه وآله ، بیده لا یؤمن بی عبد یبیت شبعان واخوه ـ او قال جاره ـ المسلم جائع

" خدا کے نزدیک افضل اعمال میں سے ایک عمل پیاسوں کو ٹھنڈا پانی پلانا ، اور بھوکے شکموں کو

---

[1] اصول کافی جلد دوم باب " اطعام المومن " حدیث ۶ ۔

[2] مدرک بالا ، حدیث ۱۰ ۔

سیر کرتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے، جو بندہ رات کو سیر ہو کر سو جائے اور اس کا بھائی ——— یا یہ فرمایا کہ اس کا مسلمان ہمسایہ ——— بھوکا ہو تو وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔[1]

اوپر والی حدیث کا آخری حصہ اگرچہ مسلمانوں کو سیر کرنے کے بارے میں ہے، لیکن اس کا آغاز ہر پیاسے اور بھوکے سے ہوا ہے اور بعید نہیں ہے کہ اس کے مفہوم کی وسعت جانوروں تک کو بھی شامل ہو۔

اور اس سلسلہ میں روایات بہت ہیں۔[2]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۴، ص ۳۹۹، قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مرحوم علامہ مجلسی نے اس سلسلہ میں ایک باب عنوان کیا ہے جس میں ۱۱۲، احادیث نقل کی ہیں جو مومن کو کھانا کھلانے، سیراب کرنے، لباس پہنانے اور اس کا قرض ادا کرنے کے بارے میں ہیں اور ان میں سے بعض عمومیت بھی رکھتی ہیں۔

[2] مدرک بالا

۱۲۔ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۙ

۱۳۔ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۚ

۱۴۔ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝

۱۵۔ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۙ

۱۶۔ قَوَارِيْرَا ۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝

۱۷۔ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۚ

۱۸۔ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝

۱۹۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝

۲۰۔ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝

۲۱۔ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝

۲۲۔ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ ع

ترجمہ

۱۲۔ خدا ان کے صبر کرنے کے صلہ میں بطور جزا، انھیں جنت اور بہشت کے ریشمی لباس عطا کرے گا۔

۱۳۔ وہ اس میں خوبصورت تختوں کے اوپر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ وہاں وہ سورج کو دیکھیں گے اور نہ ہی سخت سردی کو۔

۱۴۔ اور ان (بہشتی درختوں) کے سایے ان کے اوپر پڑ رہے ہوں گے، اور ان کے پھلوں کو توڑنا ان

کے لیے بہت ہی آسان ہو گا۔

۱۵۔ اوران کے گرداگرد (بہترین کھانوں اور مشروبات سے پُر) چاندی کے برتنوں اور بلورین پیالوں کو گردش دے رہے ہوں گے۔

۱۶۔ چاندی کے بلورین ظروف، جنھیں ضروری اندازوں کے مطابق تیار کیا ہوا ہو گا۔

۱۷۔ اور وہاں ایسے پیالوں سے سیراب کیا جائے جو ایسی شرابِ طہور سے لبریز ہوں گے، جس میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی۔

۱۸۔ بہشت کے ایک چشمہ سے جس کا نام سلسبیل ہے۔

۱۹۔ اوران کے گرد ہمیشہ رہنے والے نوجوان (پذیرائی کے لیے) گردش میں ہوں گے، جس وقت تو انھیں دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔

۲۰۔ اور جس وقت تو اس جگہ کو دیکھے گا، تو پھر تو نعمتوں اور ایک ملک عظیم کو دیکھے گا۔

۲۱۔ ان (بہشتیوں) کے جسموں پر نازک سبز رنگ کے ریشمی اور دیباج کے لباس ہوں گے، اور انھوں نے چاندی کے دست بند پہنے ہوئے ہوں گے اوران کا پروردگار انھیں شراب طہور پلائے گا۔

۲۲۔ یہ تو تمھاری جزا ہے اور تمھاری سعی وکوشش لائقِ قدردانی ہے۔

تفسیر

بہشت کی عظیم جزائیں

گزشتہ آیات میں "ابرار اور نیک افراد" کے قیامت کے دن کے دردناک عذاب سے نجات پانے اور لقائے محبوب کو پہنچنے، اور سرور وشادی میں غرق ہونے کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد زیر بحث آیات میں ان بہشتی نعمتوں کی تشریح کرتا ہے اوران آیات میں کم از کم پندرہ نعمتوں کو شمار کرتا ہے۔

سب سے پہلے ان بہشتیوں کے مکان اور لباس کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "خدا ان کے صبر وشکیبائی کے صلہ میں انھیں جنت اور ریشمی لباس وفرش جزا کے طور پر دے گا" (وجزاھم بما صبروا جنة و حریرًا)۔

ہاں! اس استقامت، پامردی اور ایثار کے مقابلہ میں ——— جس کا ایک نمونہ، نذر کو پورا کرنا اور روزے رکھنا اور اپنا وہ کھانا جس کی انھیں خود ضرورت تھی، مسکین ویتیم واسیر کو بخش دینا ہے ——— خدا انھیں جنت کے باغات میں جگہ دے گا، اور انھیں بہترین

لباس پہنائے گا۔

نہ صرف ان آیات میں بلکہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کی جزائیں انسان کے صبر و شکیبائی کے مقابلہ میں ہیں (اطاعت کی راہ میں صبر کرنا، معصیت کے مقابلہ میں صبر کرنا اور مشکلات و مصائب کے مقابلہ میں صبر کرنا)۔

سورہ رعد کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے کہ فرشتے جنتیوں کو اس طرح خوش آمدید کہیں گے: سلام علیکم بما صبرتم اس صبر و استقامت پر جو تم نے کیا تم پر سلام ہے"۔

اور سورہ مؤمنون کی آیہ ۱۱۱ میں آیا ہے (انی جزیتھم الیوم بما صبروا انھم ھم الفائزون) میں نے آج انھیں ان کے صبر و استقامت کی جزا دی ہے، یقیناً وہ کامیاب درست گار ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ اس میں خوبصورت تختوں کے اوپر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ وہاں سورج کی گرمی ہوگی اور نہ ہی ہوا کی سردی ہوگی" (متکئین فیھا علی الارائک لایرون فیھا شمسًا ولا زمھریرًا)۔

(تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کی) اس حالت کا ذکر ان کے مکمل راحت و آرام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ انسان عام طور پر آرام و سکون کی حالت میں اس طرح بسر کرتا ہے۔ اور آیت کے ذیل میں بھی جنت کی فضا کے مکمل اعتدال کی طرف اشارہ ہے۔

نہ یہ کہ سورج اور چاند وہاں موجود ہی نہ ہوں گے، بلکہ سورج کی تکلیف دینے والی تپش نہیں ہوگی، کیونکہ وہاں جنت کے درختوں کا سایہ ہوگا۔

"زمھریر" "ازمھر" کے مادہ سے سردی کی شدت یا غضب کی شدت، یا غصہ کے اثر سے آنکھ کے سرخ ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جہنم میں ایک جگہ ایسی ہے، جہاں سردی کی شدت کی وجہ سے جسم کے اعضاء ریزہ ریزہ ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے[1]

"ارائک" "اریکہ" کی جمع ہے، اصل میں ان پلنگوں کو کہتے ہیں، جنھیں حجلۂ عروسی میں رکھتے ہیں، اور یہاں خوبصورت، زیبا اور فاخرہ پلنگ مراد ہیں۔

اہلسنت کے مشہور مفسر آلوسی "روح المعانی" میں ابن عباس سے ایک حدیث اس طرح نقل کرتے ہیں:

"بینا اھل الجنۃ فی الجنۃ اذ رأوا ضوءًا کضوء الشمس وقد اشرفت الجنان بہ فیقول اھل الجنۃ یا رضوان ما ھذا؛
وقد قال ربنا لایرون فیھا شمسًا ولا زمھریرًا فیقول لھم رضوان لیس ھذا بشمس، ولا قمر، ولکن علی (ع) و فاطمہ (ع) ضحکا و

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۳۰۰

اشرقت الجنان من نور ثغريهما

"جب بہشتی، بہشت میں داخل ہوں گے تو اچانک سورج کی روشنی کی مانند ایک روشنی مشاہدہ کریں گے، جو جنت کے منظر کو روشن کردے گی، جنت والے رضوان (جنت پر مامور فرشتہ) سے کہیں گے: یہ نور کیسا ہے حالانکہ ہمارے پروردگار نے فرمایا ہے، کہ جنت میں نہ تو سورج کو دیکھیں گے اور نہ ہی سردی کو، تو وہ جواب میں کہے گا، یہ سورج اور چاند کا نور نہیں ہے، یہ تو علیؑ اور فاطمہؑ ہنسے ہیں، اور جنت ان کے دانتوں سے روشن ہوگئی ہے۔"[1]

بعد والی آیت ان نعمتوں کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتی ہے: "اور ان بہشتی درختوں کے سایے ان کے اوپر پڑ رہے ہوں گے اور ان کے پھلوں کو توڑنا ان کے لیے بہت ہی آسان ہوگا" (و دانية عليهم ظلالها و ذللت قطوفها تذليلا)۔[2]

نہ تو کوئی مشکل پیش آتی ہے، نہ ہاتھ میں کوئی کانٹا چبھتا ہے اور نہ ہی پھلوں کو توڑنے کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کہیں چل کر جانے کی۔

ہم ایک مرتبہ پھر اس نکتہ کو یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اصول جو انسان کی زندگی پر اس جہان پر حاکم ہیں وہ اس جہان سے بہت ہی مختلف ہیں اور قرآن کی ان آیات میں اور دوسری آیات میں، جنت کی نعمتوں کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ان عظیم نعمتوں کی طرف صرف پر معنی اشارے ہیں، ورنہ بعض روایات کی تصریح کے مطابق وہاں اس قسم کی نعمتیں ہیں جنھیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، اور نہ ہی کسی کان نے سنا ہے اور نہ وہ کبھی کسی کے وہم و گمان میں آئی ہیں۔

"ابن عباس" کا ایک کلام ہے جو انھوں نے اس سورہ کی بعض آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے: وہ کہتے ہیں کہ خدا نے قرآن میں جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے، اس کی مثل و نظیر دنیا میں نہیں ہے، لیکن خدا نے ہمارے جانے پہچانے ناموں کے ساتھ ان کا نام لیا ہے، مثلاً شراب طہور کا ذکر کرتا ہے کہ جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی یہ ایک معطر مادہ ہوتا تھا جسے عرب بہت ہی پسند کرتے تھے۔[3]

بعد والی آیت میں خدا کے ان جنتی مہمانوں کی پذیرائی کی کیفیت کے ایک حصہ کی وضاحت، ان کی پذیرائی کے وسائل اور پذیرائی کرنے والوں کی حالت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ان کے گرداگرد چاندی کے برتنوں اور موتی جیسے پیالوں کو گردش دے رہے

---

[1] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۵۹

[2] "قطوف" "بروزن "ظروف" جمع "قطف" (بروزن حفظ) یا جمع "قطف" (بروزن حذف) ہے، جس میں سے پہلا تو وصفی معنی رکھتا ہے اور دوسرا مصدری اور چنے ہوئے پھلوں یا پھل کے چننے کے معنی میں ہے۔

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۹۱

ہوں گے "(و یطاف علیھم بآنیۃ من فضۃ واکواب کانت قواریرا)۔

"چاندی کے بلوریں ظروف، جنھیں ضروری اندازوں کے مطابق تیار کیا ہوگا" (قواریرا من فضۃ قدروھا تقدیرا)۔

ان برتنوں میں جنت کے انواع واقسام کے کھانے، اور ان بلوریں پیالوں میں انواع واقسام کے لذت بخش اور نشاط آفریں مشروبات جتنی مقدار میں وہ چاہیں گے اور پسند کریں گے موجود ہوں گے اور جنت کے خدمت گار مسلسل ان کے گرداگرد گھوم رہے ہوں گے، اور ان کے سامنے پیش کر رہے ہوں گے۔

"آنیۃ" جمع ہے "اناء" کی، ہر قسم کے برتن کے معنی میں ہے اور "اکواب" جمع ہے "کوب" (بر وزن خوب) کی، پانی کے برتن کے معنی میں ہے، جس میں دستہ نہیں ہوتا، جسے بعض اوقات "قدح" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"قواریر" جمع ہے "قارورہ" کی جو بلوریں اور شیشہ کے برتن کے معنی میں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فرماتا ہے: جنت کے بلوریں اور شیشہ والے برتن چاندی کے بنائے گئے ہیں، جبکہ عالم دنیا میں اس قسم کا برتن مطلقاً موجود نہیں ہے اور بلوریں برتنوں کو مخصوص قسم کے پتھروں کو پگھلا کر بناتے ہیں، لیکن وہی خدا جس نے سیاہ اور تاریک پتھر میں یہ امکان پیدا کر دیا ہے کہ وہ شیشہ اور بلور میں تبدیل ہو جائے، وہ چاندی جیسی دھات میں بھی یہ امکان پیدا کر سکتا ہے۔

بہرحال اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے برتن اور پیالے، بلور اور شیشہ کی طرح صاف وشفاف بھی ہوتے ہیں اور چاندی کی خوبصورتی اور درخشندگی بھی رکھتے ہیں، اور ان میں جو مشروب ہیں وہ مکمل طور پر نمایاں ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے، آپ نے فرمایا:

ینفذ البصر فی فضۃ الجنۃ کما ینفذ فی الزجاج

"انسان کی آنکھ کا نور جنت کی چاندی میں اس طرح نفوذ کر جائے گا، جیسا کہ دنیا کے شیشہ اور بلور میں نفوذ کرتا ہے"۔[1]

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ماہرین نے کچھ ایسی شعاعیں معلوم کر لی ہیں (ایکس شعاعوں کے مانند) جو تاریک اور ٹھوس جسموں سے بھی گزر جاتی ہیں اور انھیں بلور اور شیشہ کی مانند دکھاتی ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں: جنت کی تمام نعمتیں اپنی مشابہ اور مثل ونظیر رکھتی ہیں، سوائے بلوریں اور شیشہ کے برتنوں کے جو چاندی سے بنے ہوئے ہوں گے، جس میں دنیا میں شبیہ اور نظیر نہیں ہے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۱۰

[2] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۵۹

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " وہاں ایسے پیالوں سے سیراب ہوں گے جو شراب طہور سے لبریز ہوں گے جس میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی " ۔ (ویسقون فیھا کأسًا کان مزاجھا زنجبیلًا) ۔

بہت سے مفسرین نے تصریح کی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب ایسی شراب سے جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوتی تھی ، لذت حاصل کرتے تھے ، کیونکہ اس سے ایک خاص قسم کی تیزی شراب میں آجاتی تھی ، اور قرآن یہاں ایسے جاموں کی بات کرتا ہے ، جس کی شراب طہور میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی ، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس شراب اور اس شراب میں زمین آسمان کا فرق ہے یا دوسرے لفظوں میں دنیا اور آخرت کا فرق ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب دو قسم کی شراب رکھتے تھے ، جن کی دو مختلف حالتیں ہوتی تھیں ، ایک تو اصطلاح میں نشاط آور اور محرک ہوتی تھی اور دوسری سست کرنے والی اور آرام بخش ، پہلی میں " زنجبیل " کی آمیزش کرتے تھے ، اور دوسری میں " کافور " کی اور چونکہ عالم آخرت کے حقائق اس جہان کے الفاظ کے قالب میں نہیں آسکتے ، لہذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان عظیم حقائق کو بیان کرنے کے لیے انھیں الفاظ کو زیادہ وسیع اور زیادہ بلند معانی کے ساتھ استعمال کیا جائے ۔

اگرچہ " زنجبیل " کے معنی کے بارے میں مختلف تفسیریں نقل ہوئی ہیں ، لیکن زیادہ تر اسی معطر اور خوشبودار جڑ کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے جو کھانے پینے کی مخصوص دواؤں میں استعمال ہوتی ہے ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " یہ جام بہشت کے ایک چشمے سے پُر کیے جاتے ہیں ، جسے سلسبیل کہا جاتا ہے " (عینًا فیھا تسمّٰی سلسبیلًا) [1]

" سلسبیل " بہت ہی لذیذ قسم کے مشروب کو کہتے ہیں ، جو آرام کے ساتھ منہ اور گلے سے اترتا ہے اور بڑا ہی خوش گوار ہوتا ہے ، بہت سوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ " سلاسہ " کے مادہ سے لیا گیا ہے جو " روانی " کے معنی میں ہے ، جیسا کہ رواں اور عمدہ عبارتوں کو بھی " سلیس " کہا جاتا ہے ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ " تسلسل " کے مادہ سے لیا گیا ہے ، جو پے در پے " حرکت " کے معنی میں ہے اور نتیجہ میں کسی چیز کے رواں ہونے کو بیان کرتا ہے ، اس بنا پر دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں ، اور ہر صورت میں " باء " اس میں اضافی ہے ۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ لفظ دو الفاظ سے مرکب ہے " سل " اور " سبیل " اور بعض اسے " سال " اور " سبیل " سے مرکب سمجھتے ہیں ، پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ " راستہ طلب کرو " ، اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ " اس نے راستہ طلب کیا " اور دونوں کا کنائی معنی " خوشگوار " ہے ۔

---

[1] " عینا " کے محل اعراب کے سلسلہ میں جو بات ہم نے پہلے کی چند آیات میں کہی ہے ، وہ بعینہ جاری ہے ، اور مناسب یہ ہے کہ یہ " منصوب بہ نزع خافض " کی قسم سے ہو ۔

بعض نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ عربی زبان میں "سلسبیل" کے لفظ کا وجود ہی نہیں تھا اور یہ قرآن مجید کی ایجادات میں سے ہے[1] لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد اس پرسرور بزم کی پذیرائی کرنے والوں کے بارے میں ——— جو بہشت بریں میں حق تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں برپا ہوگی ——— گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: "اور ان کے گرد ہمیشہ رہنے والے نوجوان گردش میں ہوں گے، جب تو انھیں دیکھے گا، تو گمان کرے گا کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں" (ویطوف علیھم ولدان مخلّدون اذا رأیتھم حسبتھم لؤلؤًا منثورًا)۔

وہ خود بھی جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کی جوانی کی طراوت و زیبائی اور نشاط و خوشی بھی جاودانی اور ہمیشہ رہے گی، اور ان کا پذیرائی کرنا بھی، کیونکہ "مخلّدون" کی تعبیر ایک طرف سے، اور "یطوف علیھم" "(ان کے گرد طواف کریں گے) کی تعبیر دوسری طرف سے، اس واقعیت کو بیان کرتی ہے۔

"لؤلؤًا منثورًا" (بکھرے ہوئے موتی) کی تعبیر ان کی خوبصورتی و زیبائی، صفا و درخشندگی اور جاذبیت کی طرف [illegible] ہے اور اس روحانی بزم خداوندی میں، ان کے ہر جگہ پر حاضر رہنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور چونکہ دوسرے جہان کی نعمتوں کی تعریف و توصیف ہو ہی نہیں سکتی، چاہے الفاظ کتنے ہی گویا اور رساکیوں نہ ہوں، لہٰذا بعد والی آیت میں سربستہ طور پر مزید کہتا ہے: "اور جس وقت تو وہاں دیکھے گا تو پھر بہت سی نعمتوں اور ایک ملک عظیم کو دیکھے گا" (واذا رأیت ثمّ رأیت نعیمًا و ملکًا کبیرًا)[2]۔

"نعیم" اور "ملک کبیر" کے لیے بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ:

"اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک ایسا ملک ہے جو کبھی زائل اور فنا پذیر نہیں ہوگا"[3]

یا جنت کی نعمتیں اس قدر وسیع ہیں کہ کثرت کے لحاظ سے ان کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "سلسبیل" قاعدتًا غیر منصرف ہے، کیونکہ علمیت اور عجمہ اس میں جمع ہے اور وہ تنوین جو اس نے اپنائی ہے، وہ اس سورہ کی دوسری آیات سے ہم آہنگی کی بناء پر ہے۔

[2] بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ "ثم" یہاں "ظرف مکان" ہے اور "رأیت" فعل لازم کا معنی رکھتا ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہوگا "اذا رمیت ببصرک ثمّ رأیت نعیمًا و ملکًا کبیرًا" (جب تو نظر ڈالے گا تو نعمتوں اور ملکِ کبیر کو دیکھے گا)۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "ثم" دور کے لیے اسم اشارہ ہو اور "رأیت" کا مفعول ہو۔

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۴۱۱

یا " ملک کبیر " یہ ہے کہ فرشتے اہلِ جنت کے پاس جانے کے وقت ان سے اجازت لیں گے ۔ اور سلام کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہیں گے ۔

یا یہ ہے کہ جنت والے جس چیز کا ارادہ کریں گے ، وہ انھیں مل جائے گی ۔

یا ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کا قلمروئے ملک اس قدر ہوگا کہ جب وہ نگاہ کرے گا تو ایک ہزار سال راہ کے فاصلہ کو دیکھے گا ۔

یا یہ دائمی اور ابدی ملک کے معنی میں ہے ، جس میں اس کی تمام آرزوئیں پوری ہوں گی ۔

" نعیم " کا لفظ جو لغت میں " فراواں نعمتوں " کے معنی میں ہے اور " ملکِ کبیر " جو جنت کے باغات کی عظمت اور وسعت کی خبر دیتا ہے ، ایک وسیع و عریض مفہوم رکھتا ہے ۔ جو اوپر کی تمام تفاسیر کو شامل ہے ۔

یہاں تک جنت کی نعمتوں کے ایک حصہ کی طرف اشارہ ہوا ہے ، جو مکانوں ، پلنگوں ، سایوں ، پھلوں ، مشروبات ، برتنوں اور پذیرائی کرنے والوں کی قسم سے ہیں ۔ رب جنتیوں کی زینت و آراستگی کے وسائل کی نوبت ہے ، فرماتا ہے :

" ان کے جسموں پر نازک سبز رنگ کے ریشمی اور دیبا کے لباس ہوں گے " (عالیھم ثیاب سندس خضر و استبرق)[1]

" سندس " ریشم کے نازک کپڑے کے معنی میں ہے جبکہ " استبرق " موٹے ریشمی کپڑے کے معنی میں ہے ۔ بعض اسے فارسی کا لفظ استبر یا ستبر سمجھتے ہیں ، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ عربی اصل " برق " سے جو چمکنے کے معنی میں ہے ، لیا گیا ہے ۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے : " اور ان کی چاندی کے دست بندوں کے ذریعہ تزئین کی گئی ہوگی " (وحلوا اساور من فضۃ) ۔ ایسی صاف شفاف چاندی ، جو بلور کی طرح چمکتی ہے ، اور یاقوت ، دُر اور مروارید سے زیادہ خوبصورت ہے ۔

" اساور " جمع ہے " اسورۃ " (بروزن مغفرۃ) کی اور وہ بھی اپنی نوبت پر " سوار " (بروزن غبار) یا سوار (بروزن کتاب) کی جمع ہے ، جو اصل میں فارسی کے لفظ " دستوار " سے لیا گیا ہے ، جو " دست بند " (کنگن) کے معنی میں ہے اور عربی زبان کی طرف منتقل ہوتے وقت اس میں مختصر سی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے اور اس نے " سوار " کی صورت اختیار کر لی ہے ۔

جنت کے لباسوں کے لیے سبز رنگ کو انتخاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ بہت ہی نشاط آفرین ہوتا ہے ، درختوں کے خوبصورت پتوں کی طرح ۔ البتہ سبز رنگ کی بھی کئی انواع و اقسام ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر بہت مؤثر ہوتا ہے ۔

بعض آیاتِ قرآنی : مثلاً سورۂ کہف کی آیہ ۳۱ میں آیا ہے کہ جنتیوں کے سونے کے کنگنوں سے زینت کی جائے گی " یحلون فیھا من اساور من ذھب ۔ " لیکن یہ بات اس لیے کہ جو زیرِ بحث آیت میں آئی ہے ، کوئی منافات نہیں رکھتی ،

---

[1] " عالیھم " کے محلِ اعراب کے بارے میں دو احتمال ہیں ، پہلا یہ کہ یہ ظرف ہے " فوق " (اوپر) کے معنی میں ہے ، اس قول کی بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے " فوقھم ثیاب سندس " دوسرا یہ کہ یہ اس " ھم " ضمیر کا حال ہے جو پہلی آیات میں آئی ہے اور " ابرار " کی طرف لوٹتی ہے اور جملہ کا معنی اس طرح سے ہوگا " حالکونھم یعلوھم ثیاب سندس خضر " (جبکہ سبز نازک ریشم کے کپڑے ان کے اوپر ہوں گے)

کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تنوع کی بناء پر کبھی اس سے زینت کریں اور کبھی اس سے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا سونے اور چاندی کے کنگن عورتوں کی زینت نہیں ہیں؟ تو پھر جنت کے مردوں کے لیے اس زینت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

لیکن اس کا جواب واضح ہے کیونکہ بہت سے معاشرے اور ماحول ایسے ہیں جن میں سونا اور چاندی مردوں کے لیے بھی زینت ہے اور عورتوں کے لیے بھی (اگرچہ اسلام نے سونے کی زینت کو مردوں کے لیے حرام قرار دیا ہے) لیکن یقینی طور پر مردوں اور عورتوں کے دست بندوں کی نوعیت مختلف ہوگی اور سورۂ زخرف کی آیہ ۵۳ میں فرعون کے قول سے جو نقل ہوا ہے ——— فلولا القی علیہ اسورۃ من ذھب "موسیٰ کو سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے ——— یہ معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے دست بند مصر کے ماحول میں مردوں کے لیے عظمت کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے، چونکہ جنت کی نعمتوں کے بیان کے لیے اس دنیا کے عام الفاظ ہرگز کافی نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ ان عظیم اور ناقابلِ تعریف و توصیف نعمتوں کی طرف انھی الفاظ کے ساتھ کچھ اشارے کیے جائیں۔

اور بالآخر آیت کے آخر میں نعمتوں کے اس سلسلہ کی آخری اور اہم ترین نعمت کے عنوان سے فرماتا ہے: اور ان کا پروردگار انھیں شرابِ طہور پلائے گا" (و سقاھم ربھم شرابًا طھورًا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان نعمتوں کے بیان کے درمیان بھی، خوشگوار مشروبات کے بارے میں ——— جو ایسے جاموں سے جو سلسبیل کے چشمے سے پُر ہوں گے اور جنتی ان سے سیراب ہوں گے ——— ذکر ہوا تھا۔ لیکن ان میں اور جو کچھ اس آیت میں بیان ہوا ہے، بہت فرق ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہاں ساقی "ولدان مخلدون" تھے لیکن یہاں ساقی "خدا" ہے اور کیا ہی عجیب و غریب تعبیر ہے۔ خصوصاً "رب" کے لفظ پر تکیہ کے ساتھ وہ خدا جس نے ہمیشہ اس انسان کی پرورش کی ہے اور اس کا مالک و مربی ہے۔ اسے تکامل و ارتقاء کے مراحل میں ہمیشہ آگے لے گیا ہے، یہاں تک کہ وہ آخری مرحلہ تک جا پہنچا ہے اور اب اس بات کی نوبت آگئی ہے کہ وہ اپنی ربوبیت کو حدِ اعلیٰ تک پہنچادے، اور اپنے دست قدرت سے ابرار اور نیک بندوں کو شرابِ طہور کے جام سے سیراب اور سرمست کردے۔

اور دوسری طرف "طھور" اس چیز کے معنی میں ہے جو خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو بھی پاک کرتی ہے۔ اس طرح سے یہ شراب انسان کے جسم و روح کو ہر قسم کی آلودگی اور ناپاکی سے پاک کرتی ہے اور ایسی روحانیت، نورانیت اور نشاط بخشتی ہے کہ کسی عبارت سے اس کی توصیف نہیں ہوسکتی۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

یطھرھم عن کل شیء سوی اللہ

"ان کے دل و جان کو خدا کے علاوہ ہر چیز سے پاک کردے گی"[1]

غفلت کے پردوں کو چاک کردیتی ہے، حجابوں کو دور کردیتی ہے۔ اور انسان کو خدا کے جوارِ قرب میں دائمی حضور کے لیے شائستہ

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۱۱

اور لائق بنا دیتی ہے، اس شراب طہور کا نشہ ہر نعمت سے برتر اور ہر موہبت سے بالاتر ہے۔

اگر دنیا کی آلودہ اور گندی شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اور خدا سے دور کر دیتی ہے، تو یہ شراب طہور جو ساقی "الست" کے ہاتھ سے دی جائے گی وہ اسے "ماسوی اللہ" سے بیگانہ کر کے اس کے جمال و جلال میں غرق کر دے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو لطف اس آیت اور اس نعمت میں چھپا ہوا ہے وہ سب سے برتر اور بالاتر ہے۔

ایک حدیث سے جو رسولِ خدا سے نقل ہوئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شرابِ طہور کا چشمہ جنت کے دروازے پر واقع ہے:

فیسقون منها شربة فیطهر الله بها قلوبهم من الحسد ..... و ذلك قول الله عزوجل و سقاهم ربهم شرابًا طهورًا۔

"انھیں اس شراب طہور کا ایک گھونٹ پلایا جائے گا اور خدا اس کے ذریعہ سے ان کے دلوں کو حسد (اور ہر قسم کے صفات رذیلہ سے) پاک کر دے گا"۔[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں "طهور" کی تعبیر صرف دو موقعوں پر آئی ہے، ایک تو بارش کے بارے میں (فرقان ۴۸) جو ہر چیز کو پاک اور زندہ کر دیتی ہے اور دوسرے زیر بحث آیت میں جنت کی مخصوص شراب کے بارے میں کہ وہ بھی پاک کرنے والی اور حیات بخش ہے

اور آخری زیر بحث آیت میں، اس سلسلہ میں آخری بات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا کی طرف سے انھیں کہا جائیگا: یہ عظیم نعمتیں اور بے نظیر مواہب تمھارے اعمال کا اجر ہیں، اور حق تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت کی راہ میں تمھاری سعی و کوشش اور جد و جہد مقبول و مشکور ہے" (ان هذا كان لكم جزاء و كان سعيكم مشكورًا)۔

شاید کوئی یہ تصور کرے کہ یہ مواہب اور عظیم اجر انھیں کسی حساب کے بغیر ہی دے دیا جائے گا، یہ سب کچھ کوشش اور عمل کی جزا ہے اور مجاہدات، خود سازیوں اور گناہ سے چشم پوشی کا اجر ہے[1]

اس مطلب کو بیان کرنے میں خود ایک خاص لذت اور لطف ہے کہ خداوند تعالیٰ یا اس کے فرشتے ابرار اور نیک لوگوں کو مخاطب کر کے قدر دانی اور تشکر کے طور پر ان سے کہیں: "یہ سب کچھ تمھارے اعمال کا اجر ہے اور تمھاری سعی و کوشش قابلِ قدر ہے"، بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ تو ایک ایسی نعمت ہے، جو تمام نعمتوں اور مواہب سے بالاتر ہے کہ خدا انسان کا شکریہ ادا کرے۔

"کان" کی تعبیر، جو فعل ماضی ہے، گذشتہ زمانہ کی خبر دیتا ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ نعمتیں پہلے سے ہی تمھارے لیے فراہم ہو چکی ہیں، کیونکہ جب کوئی شخص اپنے کسی مہمان کو زیادہ اہمیت دیتا ہے تو اس کی پذیرائی کے وسائل مدتوں پہلے سے آمادہ کر لیتا ہے۔

---

[1] اس آیت میں حقیقت میں ایک جملہ مقدر ہے مثلاً "یقال لهم" یا "یقول الله لهم" (خدا ان سے کہے گا)

۲۳۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۚ
۲۴۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۚ
۲۵۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝
۲۶۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝

ترجمہ

۲۳۔ یقیناً ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔
۲۴۔ پس تم اپنے پروردگار کے حکم (کی تبلیغ اور اس کے اجراء) کے لیے صبر و شکیبائی اختیار کرو، اور ان میں سے کسی گنہ گار اور کافر کی اطاعت نہ کرو۔
۲۵۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح و شام ذکر کرو۔
۲۶۔ اور رات کو اس کے لیے سجدہ کرو اور رات کے ایک طویل حصہ میں اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر

خدا کے حکم کے اجراء پر موفق ہونے کے لیے پانچ احکام

اس سورہ کی آیات میں آغاز سے لے کر اب تک، انسان کی خلقت اور اس کے بعد معاد و قیامت کی بات ہو رہی تھی۔ زیر بحث آیات میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے، انسانوں کی ہدایت اور اس راہ میں صبر و استقامت کے تاکیدی احکام انھیں دیتا ہے۔ حقیقت میں یہ آیات ان سب بے نظیر نعمتوں تک پہنچنے کی راہ بتاتی ہیں کہ یہ صرف قرآن سے تمسک اور پیغمبر اسلامؐ جیسے رہبر کی پیروی، اور ان کے احکام سے الہام و ہدایت لینے کے طریق سے ہی امکان پذیر ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "یقیناً ہم نے تم پر قرآن نازل کیا ہے" (انا نحن نزلنا علیک القرآن تنزیلا)۔

بعض مفسرین نے "تنزیلا" کو جو اوپر والی آیت میں معمول مطلق کی صورت میں آیا ہے، "قرآن کے تدریجی نزول" کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جس کا تربیتی اثر واضح ہے اور بعض اسے آسمانی کتاب کے مقام کی عظمت کی طرف ایک اشارہ قرار دیتے ہیں، اور خدا کی طرف سے اس کے نزول پر ایک تاکید گردانتے ہیں ——— خصوصاً دوسری تاکیدوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو اس آیت میں آئی ہیں۔

("ان" و "نحن" اور "جملہ اسمیہ" کے ذریعہ تاکید) ——— اور حقیقت میں یہ ان لوگوں کا ایک جواب ہے جو پیغمبر کو کہانت، سحر اور خدا پر افتراء باندھنے سے متہم کرتے تھے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام کو پانچ اہم حکم دیتا ہے، جن میں سے اولین صبر واستقامت کی دعوت ہے، فرماتا ہے: "اب جبکہ یہ بات ہے، تو اپنے پروردگار کے احکام کی تبلیغ اور ان کے اجراء میں صبر وشکیبائی سے کام لے" (فاصبر لحکم ربك)۔

یعنی راستے کی مشکلات اور رکاوٹوں، دشمنوں کی کثرت اور ان کی سختی سے نہ ڈرو اور اسی طرح سے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ صبر واستقامت کے حکم کو "فاصبر" میں "فاء تفریع" کی طرف توجہ کرتے ہوئے) خدا کی طرف سے قرآن کے نزول کی فرع قرار دیتا ہے، یعنی چونکہ تیرا مددگار خدا ہے، لہٰذا قطعی طور پر اس راستے میں صبر واستقامت سے کام لے اور "ربک" کی تعبیر بھی اسی معنی کی طرف ایک اور لطیف اشارہ قرار پاتی ہے۔

اور دوسرے حکم میں پیغمبر کو منحرفین کے ساتھ ہر قسم کے میل جول سے منع کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان میں سے کسی گنہ گار اور کافر کی اطاعت نہ کر" (ولا تطع منهم اٰثمًا او کفورًا)۔

حقیقت میں یہ دوسرا حکم پہلے حکم پر ایک تاکید ہے، کیونکہ دشمنوں کی جماعت اس کوشش میں رہتی تھی کہ پیغمبر کو مختلف طریقوں سے سازش کرکے، باطل کے راستہ پر کھینچ لے جائیں، جیسا کہ نقل ہوا ہے کہ "عتبہ بن ربیعہ" اور "ولید بن مغیرہ" پیغمبر سے یہ کہتے تھے کہ تم اپنی دعوت سے رُک جاؤ، ہم تمھیں اتنا مال ودولت دے دیں گے کہ تم راضی ہوجاؤ گے اور عرب کی خوبصورت ترین عورت کے ساتھ تمھاری شادی کردیں گے اور اسی قسم کی دوسری پیش کشیں اور پیغمبر کو ایک سچے عظیم رہبر کے طور پر، ان شیطانی وسوسوں یا ان دھمکیوں کے مقابلہ میں، جو ان لالچوں کے بے اثر ہوجانے کے بعد دی جاتی ہیں، صبر واستقامت سے کام لینے کی ضرورت تھی کہ وہ نہ تو ان کے کسی لالچ میں آئے اور نہ ہی ان کی کسی دھمکی کے آگے سر جھکائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر کبھی بھی ان کے آگے نہیں جھکے، لیکن یہ آنحضرت کے بارے میں، اس موضوع کی اہمیت کے لیے ایک تاکید ہے، اور تمام راہِ حق کے رہبروں کے لیے ایک ہمیشہ کا دستور العمل قرار پاتا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "آثم" کی "عتبہ بن ربیعہ" سے اور "کفور" کی "ولید بن مغیرہ" یا "ابوجہل" کیساتھ ——— جو تینوں ہی مشرکین عرب میں سے تھے ——— تفسیر کی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ "آثم" (گنہ گار) اور "کفور" (کافر اور کفران کرنے والا) ایک وسیع وعریض مفہوم رکھتے ہیں، جو تمام مجرموں اور مشرکین کو شامل ہے۔ اگرچہ یہ تینوں افراد اس کے واضح مصداق میں سے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "آثم" ایک عام مفہوم رکھتا ہے جو "کفور" کو بھی شامل ہے۔ اس بنا پر "کفور" کا ذکر "عام" کے بعد "خاص" کے ذکر کی قسم سے ہے اور تاکید کے لیے ہے۔

لیکن چونکہ ان عظیم مشکلات کے ہجوم کے مقابلہ میں صبر واستقامت کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس راستے کو طے کرنے کے لیے دو خاص قسم کے زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اپنے پروردگار کے نام کا ہر صبح وشام ذکر کر"

(واذکر اسم ربك بکرة واصیلاً) ۔

" اور رات کے وقت اس کے لیے سجدہ کر ، اور رات کے زیادہ حصہ میں اس کی تسبیح کر" (ومن اللیل فاسجد له و سبّحه لیلاً طویلاً) ۔

تاکہ اس " ذکر " اور اس " سجدہ " اور اس " تسبیح " کے سایے میں اس راستے کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری قدرت و توانائی، قدرت معنوی اور کافی مدد فراہم کرے ۔

" بکرة " (بروزن نکتہ) دن کی ابتداء اور آغاز کے معنی میں ہے اور " اصیل " اس کا نقطۂ مقابل ہے، یعنی دن کا آخری حصہ اور شام کا وقت ۔

بعض نے کہا ہے کہ اس لفظ کا دن کے آخری حصہ پر اطلاق اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ " اصل " کے مادہ سے لیا گیا ہے، اس بناء پر ہے کہ دن کا آخری حصہ رات کی اصل اور بنیاد ہوتا ہے ۔

بعض تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ " اصیل " کا بعض اوقات ظہر اور غروب کے درمیانی فاصلہ پر اطلاق ہوتا ہے ۔

——— (مفردات راغب) ———

اور بعض دوسری تعبیروں سے پتہ چلتا ہے کہ " اصیل " رات کے اوائل حصہ کو بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے اس کی " عشی " کے ساتھ تفسیر کی ہے اور " عشی " رات کے آغاز کو کہا جاتا ہے، اسی لیے مغرب اور عشاء کی نماز کو " عشائین " کہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض کلمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ " عشی " زوالِ ظہر سے لے کر اگلے دن کی صبح تک کو بھی شامل ہے [۱]

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس آیہ شریفہ میں " اصیل " " بکرة " (صبح) کے مقابلہ میں آیا ہے اور اس کے بعد بھی رات کی عبادت کی بات ہوئی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد رات کے آخری حصہ کی طرف ہی ہے ۔

بہرحال یہ دونوں آیات حقیقت میں پروردگار کی مقدس ذات کی طرف شبانہ روز اور ہمیشہ توجہ رکھنے کے لزوم کو بیان کرتی ہیں ۔

بعض نے اس کی خصوصیت کے ساتھ نماز پنجگانہ سے یا نماز تہجد کے اضافہ کے ساتھ، یا خصوصیت سے صبح، عصر اور مغرب و عشاء کے ساتھ تفسیر کی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ نمازیں خدا کے اس دائمی و مسلسل ذکر اور اس کی مقدس بارگاہ میں تسبیح و سجدہ کے مصادیق میں سے ہیں ۔

" لیلاً طویلاً " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رات کی زیادہ تر مقدار میں تسبیح خدا کر، ایک حدیث میں امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام سے اس کی تفسیر میں آیا ہے کہ آپ نے اس سوال کے جواب میں کہ اس تسبیح سے کیا مراد ہے ؟ فرمایا: اس سے مراد نمازِ شب ہے [۲]

لیکن بعید نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی ایک واضح مصداق کے بیان کی قسم سے ہو، کیونکہ تہجد کی نماز، روح ایمان کی تقویت، تہذیبِ نفوس اور خدا کی

---

[۱] مفردات راغب

[۲] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۳

اطاعت کی راہ میں انسان کے ارادہ کو زندہ رکھنے میں حد سے زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔

یہاں اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اوپر والی آیات کے پانچ احکام اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے لیے ایک پروگرام کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ان تمام افراد کے لیے ایک دستور العمل ہے جو انسانی معاشرے کی معنوی اور انسانی رہبری کے راستے میں قدم اٹھاتے ہیں۔

انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ انھیں اس ہدف اور پیغام رسالت پر اطمینان اور ایمانِ کامل کے بعد صبر و استقامت اختیار کرنا لازم ہے، اور راستے کی انبوہ مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہیے، کیونکہ ایک معاشرے کی ہدایت میں، خصوصاً اس وقت جبکہ جاہل اور ہٹ دھرم دشمن مقابلہ میں ہوں ہمیشہ عظیم مشکلات ہوتی ہیں، اگر رہبروں کی طرف سے صبر و استقامت نہ ہو تو کوئی رسالت بھی بارآور نہیں ہو سکتی۔

اور بعد والے مرحلہ میں، شیاطین کے وسوسوں کے مقابلہ میں جو آثم و کفور کے مصداق ہیں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے رہبروں اور پیشواؤں کو منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ان کی رسالت بیکار اور بے نتیجہ رہ جائے، پوری طاقت کے ساتھ ڈٹ جانا چاہیے، نہ لالچ کے فریب میں آنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی دھمکیوں سے خوف کھانے کی ضرورت۔

اور تمام مراحل میں روحانی قدرت، قوتِ ارادی، عزم راسخ اور پختہ ارادے کے حصول کے لیے ہر صبح و شام خدا کی یاد میں رہیں اور اس کی بارگاہ میں اپنی پیشانی جھکا دیں، خصوصاً رات کی عبادتوں اور اس سے راز و نیاز کے ذریعہ مدد حاصل کریں، کیونکہ اگر ان امور کی رعایت کی جائے، تو پھر کامیابی حتمی و یقینی ہے۔

اور اگر بعض مراحل میں کسی مصیبت یا شکست سے دوچار ہونا پڑے تو ان اصولوں کے ساتھ ان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا پروگرام اور ان کی دعوت و رسالت، اس راستہ کے راہ رو افراد کے لیے ایک مؤثر دستور العمل ہے۔

۲۷۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ○

۲۸۔ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ○

۲۹۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○

۳۰۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

۳۱۔ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○

ترجمہ

۲۷۔ وہ دنیا کی جلدی گزر جانے والی زندگی کو دوست رکھتے ہیں، اور سخت اور سنگین دن کو اپنے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔

۲۸۔ ہم نے انھیں پیدا کیا اور ان کے وجود کے جوڑ بند مضبوط بنائے اور جب بھی ہم چاہیں گے، ان کی جگہ دوسروں کو دے دیں گے۔

۲۹۔ یہ ایک تذکرہ اور یاد آوری ہے، پس جو شخص چاہے (اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے۔

۳۰۔ اور تم کسی چیز کو نہیں چاہتے، مگر یہ کہ خدا چاہے، بیشک خدا عالم و حکیم ہے۔

۳۱۔ جسے وہ چاہتا ہے (اور لائق سمجھتا ہے) اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب فراہم کیا ہے۔

تفسیر

یہ ایک تنبیہ ہے اور راستہ کا انتخاب کرنا تمھارے اختیار میں ہے

گزشتہ آیات میں پیغمبر کو خبردار کیا گیا تھا کہ وہ "آثم" و "کفور" (مجرموں اور کافروں) کی اطاعت نہ کریں، اور تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایسے لوگ تھے جو اپنی خام خیالی میں پیغمبرؐ کے ارادوں میں نفوذ کرنے کے لیے، مال و دولت، مقام و منصب اور خوبصورت عورتوں کا لالچ دے کر کام چلانا چاہتے تھے۔

زیر بحث آیات ان کا مزید تعارف کراتے ہوئے کہتی ہیں: "وہ اس دنیا کی جلدی گزر جانے والی زندگی کو دوست رکھتے ہیں، جب کہ ایک سخت اور سنگین دن کو اپنے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اسے نظر انداز کر دیتے ہیں" (ان ھٰؤلاء یحبون العاجلة و یذرون وراءھم یوما ثقیلا)۔

ان کے افکار کھانے، سونے اور شہوت رانی سے آگے نہیں بڑھتے اور ان کا آخری نقطۂ نظر یہی بے قید و شرط مادی لذتیں ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ پیغمبر کی عظیم روح کو بھی اسی ترازو میں تولیں۔

لیکن یہ بے خبر دل کے اندھے، اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ کیسا سنگین دن ان کے آگے آرہا ہے؟! سزاؤں اور عذاب کے لحاظ سے سنگین، حساب و کتاب کے لحاظ سے سنگین زمانہ کے طول کے لحاظ سے سنگین، اور فضیحت و رسوائی کے لحاظ سے سنگین۔

"وراءھم" (اپنے پس پشت) کی تعبیر، حالانکہ اسے قاعدے کی رُو سے آگے کہا جانا چاہیے، تو یہ اس بناء پر ہے کہ وہ اس دن کو فراموشی کے سپرد کریں گے، گویا انھوں نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کے قول کے مطابق "وراء" کبھی تو پشت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور کبھی آگے کے معنی میں۔[1]

بعد والی آیت میں انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنی قدرت و توانائی پر غرور نہ کریں، کیونکہ یہ سب خدا کی عطا ہے، اور جب وہ چاہے گا اچانک واپس لے لے گا، لہٰذا فرماتا ہے: "ہم نے انھیں پیدا کیا ہے، اور ان کے جوڑ بندوں کو مضبوط بنایا ہے اور انھیں قدرت و طاقت عطا کی ہے اور جس وقت ہم چاہیں گے انھیں لے جائیں گے اور ان کی جگہ دوسرے گروہ کو ان کا جانشین بنا دیں گے۔ (نحن خلقناھم و شددنا اسرھم و اذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلا)[2]

"اسر" (بروزن عصر) اصل میں کسی چیز کو زنجیر سے باندھنے کے معنی میں ہے، اور اسیروں کو اسی وجہ سے "اسیر" کہا جاتا ہے

---

[1] تفسیر "روح البیان" میں آیا ہے کہ اگر "وراء" کی "فاعل" کی طرف اضافت ہو تو پشت سر کے معنی میں ہے اور اگر "مفعول" کی طرف اضافت ہو تو آگے کے معنی میں ہے۔ (روح البیان جلد ۹ ص ۴۳۹)

[2] اس آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "بدلنا ھم امثالھم" (توجہ رہے کہ تبدیل عام طور پر دو مفعول لیتا ہے۔ یہاں "ھم" کی ضمیر مفعول اوّل ہے اور "امثالھم" مفعول دوم۔

کو انھیں زنجیروں سے باندھ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں "اسر" انسانی وجود کے جوڑ بندوں کو مستحکم کرنے کی طرف اشارہ ہے جو اہم کاموں کے انجام دینے کے لیے اسے حرکت کی قدرت اور توانائی بخشتے ہیں۔

واقعاً قرآن نے یہاں ایک حساس نقطہ پر انگلی رکھی ہے اور وہ وجود انسانی کے مختلف اجزاء کے جوڑ بند ہیں چھوٹے اور بڑے عضلات ـــــ جو لوہے کی رسیوں کی طرح عضلات کو ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ دیتے ہیں ـــــ لہٰذا پٹھوں اور مختلف عضلات تک، انسانی بدن کی چھوٹی اور بڑی ہڈیوں اور گوشت کے ٹکڑوں کو اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں کہ جن کے مجموعہ سے جسم کی ایک ایسی کامل وحدت تیار ہو جاتی ہے، جو ہر قسم کی فعالیت کے انجام دینے کے لیے آمادہ و تیار ہوتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ جملہ قدرت و قوت سے کنایہ ہے۔

یہ آیت ضمنی طور پر خدا کی پاک ذات کی، ان سے، اور ان کی اطاعت و ایمان سے بے نیازی اور استغناء کو واضح کرتی ہے، تاکہ وہ یہ جان لیں کہ اگر ان کے ایمان کے لیے کچھ اصرار ہے تو حقیقت میں یہ پروردگار کی طرف سے ایک لطف و رحمت ہے۔

اس معنی کی نظیر سورۂ انعام کی آیہ ۱۳۳ میں بھی آئی ہے، جہاں فرماتا ہے: (وربك الغنی ذو الرحمة ان یشأ یذهبكم و یستخلف من بعدكم ما یشاء)۔ تیرا پروردگار بے نیاز و مہربان ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمھارے بعد جسے چاہے تمھارا جانشین بنا دے۔

اس کے بعد ان تمام مباحث کی طرف ـــــ جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں اور جو سعادت و نیک بختی کا ایک جامع پروگرام پیش کرتے ہیں ـــــ اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ ایک تذکرہ اور یاد آوری ہے، پس جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کر لیتا ہے" (ان هذه تذكرة فمن شاء اتخذ الی ربه سبیلاً)۔[1]

ہماری ذمہ داری تو راستہ دکھا دینا ہے، نہ کہ انتخابِ راہ پر مجبور کرنا، اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ اپنی عقل و ادراک کے ذریعہ حق کو باطل سے پہچانو، اور اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ راستہ کا انتخاب کرو۔

حقیقت میں یہ اس چیز کے لیے ایک تاکید ہے جو اس سورہ کے آغاز میں گزر چکی ہے، جس میں فرمایا ہے: انا هدیناه السبیل اما شاكراً و اما كفوراً۔ ہم نے اسے راستے کی نشاندہی کر دی اب چاہے وہ اسے قبول کرے اور اس نعمت کا شکر ادا کرے یا روگردانی کر کے کفران کرے۔

اور چونکہ یہ ممکن ہے کہ کوتاہ فکر افراد اوپر والی تعبیر سے بندوں کے لیے تفویض اور مطلق سپردگی کا تصور کر لیں، لہٰذا بعد والی آیت میں اس توہم کی نفی کے لیے مزید کہتا ہے: "تم کسی چیز کو نہیں چاہتے مگر یہ کہ خدا چاہے"۔ (وما تشاءون

---

[1] بعض لوگ اس آیت کے لیے ایک محذوف کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تقدیر میں اس طرح ہے "فمن شاء اتخذ الی رضا ربه سبیلاً" یا "الی طاعة ربه سبیلاً"، لیکن انصاف یہ ہے کہ تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تکامل کے سب راستے خدا ہی کی طرف جا کر منتہی ہوتے ہیں۔

الّا ان یشاء اللہ)[1]۔

کیونکہ خدا علیم وحکیم ہے (ان اللہ کان علیمًا حکیمًا)۔

اور یہ حقیقت میں (الامر بین الامرین) والی مشہور اصل کا اثبات ہے، ایک طرف فرماتا ہے: "خدا نے راستہ تو بتا دیا ہے، اس کا انتخاب تمھارے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف مزید کہتا ہے: "تمھارا انتخاب مشیتِ خدا پر موقوف ہے، یعنی تم مکمل استقلال نہیں رکھتے، بلکہ قدرت وتوانائی اور تمھارے ارادے کی آزادی سب مشیتِ خداوندی اور اس کی جانب سے ہے اور جس وقت وہ چاہے اس قدرت وآزادی کو تم سے چھین سکتا ہے۔

اس طرح نہ تو "تفویض" اور مکمل سپردگی ہے اور نہ ہی جبر اور سلب اختیار، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک دقیق وظریف حقیقت ہے یا دوسرے لفظوں میں: آزادی کی نوعیت خدائی مشیت کے ساتھ وابستہ ہے کہ جس وقت بھی وہ چاہے اسے واپس لے سکتا ہے، تاکہ بندے تکلیف ومسئولیت اور ذمہ داری کے بوجھ کو ——— جو ان کے تکامل وارتقاء کی رمز ہے ——— اپنے کندھوں پر بھی اٹھا سکیں، اور اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز بھی خیال نہ کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بناء پر ہے کہ بندے اپنے آپ کو خدا کی پاک ذات کی ہدایت، حمایت اور توفیق وتائید سے بے نیاز نہ سمجھیں اور کاموں میں عزم راسخ کے باوجود اپنے آپ کو اسی کے سپرد کردیں، اور اس کی حمایت کے ماتحت کام کریں۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ جو بعض جبری مسلک والے مفسرین مثلاً "فخر رازی" اس آیت کے ساتھ چپکے ہیں تو یہ ان پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں کی بناء پر ہے جو انھوں نے اس مسئلہ میں اپنائے ہوئے ہیں، وہ کہتا ہے:

واعلم ان ھذہ الآیۃ من جملۃ الآیات التی تلاطمت فیھا امواج الجبر و القدر

جان لے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جس میں جبر کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں[2]

ہاں! اگر اس آیت کو قبل کی آیات سے جدا کردیں تو پھر اس توہم کی گنجائش ہے، لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک آیت میں اختیار کی تاثیر بیان ہوئی ہے اور دوسری آیت میں مشیت پروردگار کی تاثیر، تو پھر "الامر بین الامرین" کا مسئلہ اچھی طرح سے ثابت ہوجاتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ تفویض کے طرفدار صرف اسی آیت سے واسطہ رکھتے ہیں جو اختیار مطلق کی بات کرتی ہے، اور جبر کے طرفدار محض اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ اگر وہی سامنے ہو تو پھر جبر کی بو آتی ہے اور پھر ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اپنے پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں سے اس کی توجیہ کریں، حالانکہ کلام الٰہی (اور ہر دوسرے کلام) کے صحیح فہم وادراک کا تقاضا یہ ہے کہ سارے کلام کو ایک دوسرے کے پاس رکھ کر دیکھا جائے، اور کسی تعصب اور پہلے سے کیے ہوئے فیصلے کے بغیر فیصلہ کریں۔

---

[1] اس بارے میں کہ "ان یشاء اللہ" کا محل اعراب کیا ہے، مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے اور معنوی طور پر اس طرح ہے: "ما تشاءون الا وقت مشیت اللہ" لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں "مشیئۃ" مقدر ہو، اور معنا اس طرح ہو "وما تشاءون الا مشیئۃ یشاء اللہ"۔

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۰، ص ۲۶۲

آیت کے ذیل میں جو فرمایا ہے: ان اللہ کان علیماً حکیماً ممکن ہے یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ خدا کے علم وحکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بندوں کو راہِ تکامل وارتقاء کے طے کرنے میں آزاد چھوڑ دے، ورنہ اجباری وتحمیلی تکامل، تکامل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس کا علم وحکمت اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کچھ افراد کو تو کارِ خیر پر مجبور کرے اور کچھ افراد کو کارِ شر پر، اور اس کے بعد پہلے گروہ کو اجر وپاداش دے، اور دوسرے گروہ کو عذاب وسزا دے۔

اور آخر کار اس سورہ کی آخری آیت میں نیکوکار اور بدکاروں کی سرنوشت کی طرف ایک مختصر اور پرمعنی جملہ کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے اور ظالموں کیلئے اس نے دردناک عذاب فراہم کر رکھا ہے" (یدخل من یشاء فی رحمتہ والظالمین اعدلھم عذاباً الیماً)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کے آغاز میں کہتا ہے: "جس شخص کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے، لیکن آیت کے آخر میں، عذاب کو ظالموں کے لیے مخصوص قرار دیتا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کی عذاب کے لیے مشیت، انسان کے ظلم وگناہ کا ارادہ کرنے کے بعد ہے، اور مقابلہ کے قرینہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ رحمت میں بھی اس کی مشیت ایمان، عمل صالح اور اجرائے عدل میں انسان کے ارادہ کے بعد ہے اور ایک حکیم ودانا سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔

تعجب کی بات ہے کہ اس واضح قرینہ کے باوجود پھر بھی کچھ افراد، مثلاً فخر رازی آیت کے مضمون کو جبر کی دلیل قرار دیتا ہے، اور آیت کے ذیل میں ارادہ کی آزادی اور ظالموں کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔[1]

خداوندا! ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر، اور دردناک عذاب سے جو ظالموں کے انتظار میں ہے رہائی دے۔

پروردگارا! تو نے راستہ بتا دیا ہے، ہم بھی اس راہ کو طے کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ ہماری مدد فرما۔

بارِ الٰہا! اگر ہم "ابرار" نہیں ہیں تو ان کے دوست اور محبت کرنے والے ضرور ہیں، ہمیں ان کے ساتھ ملحق کر دے۔

سورۂ انسان (دہر) کا اختتام
یکم ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ
یکم ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء
بعد دوپہر چار بج کر پینتیس منٹ
۸۱ ر ای ماڈل ٹاؤن - لاہور

---

[1] آیات "مشیت" کے بارے میں مزید تشریح کے لیے جلد ۱۹ ص ۴۶۰ - ۴۶۱ (سورہ زمر کی آیہ ۳۷ کے ذیل میں) مطالعہ فرمائیں۔

سُورۂ مُرسلات

یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۵۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

سورۂ "مرسلات" کے مضامین

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ "مکہ" میں نازل ہوا، لیکن بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ آیہ ۴۸ "واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون" "مدنی" ہے، اگرچہ انھوں نے اس چیز کی کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی ہے اور اگر "رکوع" و "نماز" کا مسئلہ اس استنباط کا سبب بنا ہے تو یہ درست نظر نہیں آتا، کیونکہ مسلمان مدتوں مکہ میں نماز پڑھتے اور رکوع کرتے رہے۔

بہرحال زیادہ تر مطالب جو اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں، وہ قیامت اور مکذبین و منکرین کی تہدید و انذار سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سورہ کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ آیہ "ویل یومئذ للمکذبین" "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" کا اس میں دس مرتبہ تکرار ہوا ہے، اور ہر مرتبہ نئے مطلب کے بعد ہے۔

کئی قسمیں کھانے کے بعد قیامت اور معاد کے سنگین اور سخت حوادث کی خبر دیتا ہے اور اس کے بعد اسی آیت کو ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے"

اس کے بعد والے مرحلہ میں گزشتہ گنہ گار اقوام کی غم انگیز سرگزشت ہے۔

اور تیسرے مرحلہ میں انسان کی خلقت کے خصوصیات کا ایک گوشہ ہے۔

اور چھٹے مرحلہ میں زمین میں خدا کی نعمتوں کے ایک حصہ کا بیان ہے۔

اور پانچویں مرحلہ میں تکذیب کرنے والوں کے عذاب کے کچھ حصوں کی تشریح کرتا ہے۔

اسی طرح ہر مرحلہ میں ایک بیدار کرنے اور ہلا دینے والے مطلب کی طرف اشارہ کرکے، اس کے بعد اس آیت کا تکرار کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے ایک حصہ میں بہشت کی ان نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو پرہیزگاروں کو نصیب ہوئی ہیں، تاکہ انذار کو بشارت کے ساتھ ملا دے اور تہدید کو تشویق کے ساتھ۔

بہرحال یہ تکرار سورہ الرحمٰن کی بعض آیات کے تکرار کے مشابہ ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں گفتگو نعمتوں کے متعلق تھی اور یہاں زیادہ تر تکذیب کرنے والوں کے عذابوں کے بارے میں ہے۔

اس سورہ کے لیے "مرسلات" کے نام کا انتخاب اس سورہ کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من قرء سورۃ والمرسلات کتب انہ لیس من المشرکین

"جو شخص سورۂ مرسلات کو پڑھے گا تو یہ لکھا جائے گا کہ یہ مشرکین میں سے نہیں ہے"۔[۱]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من قرأها عرف الله بينه و بين محمد (ص)

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا تو خدا اسے پیغمبرؐ کا آشنا (اور ہم جوار) بنا دے گا"۔[۲]

اس میں شک نہیں کہ یہ ثواب اور فضیلت انھی لوگوں کے لیے ہے جو پڑھ کر غور و فکر کریں اور اس پر عمل کریں، اور اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے بعض نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا اسرع الشيب اليك يا رسول الله (ص) "اے رسولِ خدا! آپ میں بڑھاپے کے آثار کتنا جلدی ظاہر ہو گئے ہیں"؟

آپؐ نے فرمایا:

شيبتني هود، والواقعة والمرسلات وعم يتساءلون

"مجھے سورۂ ہود، واقعہ، مرسلات اور عم یتسائلون نے بوڑھا کر دیا ہے"۔[۳]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان تمام سورتوں میں قیامت کے حالات اور اس عظیم دادگاہ کے ہولناک مسائل بیان کیے گئے ہیں، اور یہی وہ امور تھے جنھوں نے پیغمبرؐ کی روحِ مقدس میں اثر کیا۔

یہ بات واضح ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لیے پختہ ارادہ کے بغیر جو تلاوت ہو، وہ اس قسم کا اثر نہیں چھوڑ سکتی۔

---

[۱]، [۲] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۴

[۳] خصائل صدوق "باب الاربعة" حدیث ۱۰

سورۂ مرسلات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۙ○

۲۔ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۙ○

۳۔ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۙ○

۴۔ فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ○

۵۔ فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ○

۶۔ عُذۡرًا اَوۡ نُذۡرًا ۙ○

۷۔ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ○

۸۔ فَاِذَا النُّجُوۡمُ طُمِسَتۡ ۙ○

۹۔ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ۙ○

۱۰۔ وَاِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ۙ○

۱۱۔ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ ؕ○

۱۲۔ لِاَیِّ یَوۡمٍ اُجِّلَتۡ ؕ○

۱۳۔ لِیَوۡمِ الۡفَصۡلِ ۚ○

۱۴۔ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ ؕ○

۱۵۔ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ ○

ترجمہ

۱۔ قسم ہے ان فرشتوں کی جنھیں پے درپے بھیجا جاتا ہے۔
۲۔ اوران کی جو تیز ہوا کی طرح چلتے ہیں۔
۳۔ اور قسم ہے ان کی جو (بادلوں کو) پھیلاتے اور منتشر کرتے ہیں۔
۴۔ اوران کی جو جدا کرتے ہیں۔
۵۔ اور قسم ہے ان کی جو (خدا کی) بیدار کرنے والی آیات (انبیاء کی طرف) القاء کرتے ہیں۔
۶۔ اتمام حجّت یا انذار کے لیے
۷۔ تمھیں جو کچھ (قیامت کے بارے میں) وعدہ دیا جاتا ہے، وہ وقوع پذیر ہوگا۔
۸۔ جب ستارے محو اور تاریک ہوجائیں گے
۹۔ اور آسمان (کے ستارے) پھٹ جائیں گے۔
۱۰۔ اور جب پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے۔
۱۱۔ اور جب پیغمبروں کے لیے (شہادت دینے کے لیے) وقت کا تعین ہوگا
۱۲۔ یہ امر کس دن کے لیے تاخیر میں ڈالا گیا ہے؟
۱۳۔ (حق کی باطل سے) جدائی کے دن کے لیے
۱۴۔ تمھیں کیا معلوم ہے کہ جدائی کا دن کیا ہے؟
۱۵۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

تفسیر

خدا کے وعدے حق ہیں، وائے ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے

اس سورہ کے آغاز میں مقدمہ کے طور پر پانچ آیات میں پانچ قسمیں آئی ہیں، جن کے معنی کی تفسیر میں بہت اختلاف ہے۔

فرمایا ہے: "قسم ہے ان کی جو پے در پے بھیجے جاتے ہیں" (والمرسلات عرفًا)[1]۔

"اور ان کی جو طوفان اور تیز آندھی کی طرح حرکت کرتے ہیں" (فالعاصفات عصفًا)۔

"اور قسم ہے ان کی جو پھیلاتے اور منتشر کرتے ہیں" (والناشرات نشرًا)۔

"اور ان کی جو جدا کرتے ہیں" (فالفارقات فرقًا)۔

"اور ان کی جو بیدار کرنے والی آیات القاء کرتے ہیں" (فالملقیات ذکرًا)۔

"اتمام حجت یا ڈرانے کے لیے" (عذرًا او نذرًا)[2]۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان سربستہ قسموں کا ——— جو اہم مسائل کی خبر دیتی ہیں ——— مفہوم کیا ہے؟

یہاں تین مشہور تفسیریں ہیں۔

۱۔ یہ پانچوں کی پانچوں قسمیں "آندھیوں اور طوفانوں" کی طرف اشارہ ہیں، جن کا طبیعیات کے بہت سے مسائل میں ایک مؤثر نقش ہے۔ اس قول کی بناء پر ان آیات کا مفہوم اس طرح ہوگا: قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے در پے چلتی ہیں۔

اور قسم ہے ان طوفانوں کی جو تیزی کے ساتھ چلتی ہیں۔

اور قسم ہے ان کی جو بادلوں کو پھیلاتی اور منتشر کرتی ہیں اور بارش کے حیات بخش قطرات کو ان کے درمیان سے خشک سرزمینوں کی طرف بھیجتی ہیں۔

اور قسم ہے ان کی جو بادلوں کو بارش برسانے کے بعد پراگندہ کر دیتی ہیں۔

اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو اس پروگرام کے ساتھ انسانوں کو خدا کی یاد میں مصروف کر دیتی ہیں۔

(بعض نے "فالعاصفات عصفًا" کو عذاب کے طوفانوں کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے، جو حیات بخش ہواؤں کی مدِ مقابل ہیں کہ وہ بھی اپنی نوعیت میں تذکرے اور بیداری کا سبب ہیں)۔

۲۔ یہ تمام قسمیں "آسمانی فرشتوں" کی طرف اشارہ ہیں۔ یعنی قسم ہے ان فرشتوں کی جو پے در پے انبیاء کی طرف بھیجے جاتے ہیں

---

[1] "عرف" یکے بعد دیگرے اور پے در پے کے معنی میں آیا ہے اور اصل میں "گھوڑے کی گردن کے بالوں" کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے پر پڑے ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس کی "اچھی اور جانے پہچانے کام" کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

[2] "عذرًا او نذرًا" پر نصب (زبر) کا اعراب مفعول لاجلہ کی بناء پر ہے اور بعض نے اسے حال سمجھا ہے۔

(یا وہ فرشتے جو جانے پہچانے اور مشہور پروگراموں کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں)۔
اور قسم ہے ان کی جو طوفانوں کی طرح پوری سرعت اور تیزی کے ساتھ اپنے کاموں کے پیچھے جاتے ہیں۔
اور ان کی جو آسمانی کتابوں کی آیات کو پیغمبروں کے سامنے کھولتے اور نشر کرتے ہیں۔
اور ان کی جو اس عمل کے ساتھ حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں۔
اور ان کی جو حق تعالیٰ کے ذکر اور اس کے احکام کو انبیاء پر القاء کرتے ہیں۔

۲۔ پہلی اور دوسری قسم "ہواؤں اور طوفانوں" کے بارے میں ہے، اور تیسری، چوتھی اور پانچویں قسم فرشتوں کے ذریعہ حق تعالیٰ کی آیات کی نشر و اشاعت کے بارے میں اور پھر حق کو باطل سے جُدا کرنے اور اس کے بعد اتمام حجت اور انذار کے مقصد سے خدا کے ذکر اور اس کے احکام کو پیغمبروں پر القاء کے بارے میں ہے۔

وہ چیز جو تیسری تفسیر پر شاہد بن سکتی ہے، اوّلاً آیات میں "واو" کے ذریعہ ان دو قسم کی قسموں کی جدائی ہے۔ جبکہ باقی کا "فاء" کے ذریعہ عطف ہوا ہے جو ان کے ارتباط اور تعلق کی نشانی ہے۔

ثانیاً ——— جیسا کہ ہم دیکھیں گے ——— یہ تمام قسمیں ایک ہی مطلب کے لیے ہیں، جو ساتویں آیت میں بیان ہوا ہے، یعنی قیامت و معاد کی حقانیت و واقعیت۔ اور ہم جانتے ہیں کہ قیامت کے قریب ایک عظیم تغیر عالم میں پیدا ہوگا۔ ایک طرف تو شدید طوفان، آندھیاں، زلزلے اور ہلا دینے والے حوادث ہوں گے، اور اس کے بعد دوسری طرف عدلِ الٰہی کی عدالت اور دادگاہ قائم ہوگی، جہاں فرشتے اعمال ناموں کو پھیلائیں گے اور نشر کریں گے، اور مومنین اور کفار کی صفوں کو الگ اور جدا کر دیں گے اور اس سلسلہ میں حکم الٰہی کا القاء کریں گے۔

اگر اوپر والی پانچ قسمیں اس تفسیر کے مطابق بیان ہوں تو مقسم بہ یعنی وہ چیز جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، مناسب ہوگی اور آخری تفسیر کو اس لحاظ سے برتری حاصل ہے۔

"فالملقیات ذکرًا" کے جملہ میں ذکر یا تو ان علوم و معارف کے معنی میں ہے جو انبیاء کی طرف القاء ہوئے ہیں، یا ان آیات کے معنی میں ہے جو ان پر نازل ہوئی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی میں خود قرآن کو بھی "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ حجر کی آیہ ۶ میں آیا ہے، و قالوا یا ایها الذی نزل علیه الذکر انك لمجنون ——— (دشمن) کہتے تھے، اے وہ کہ جس پر ذکر نازل ہوا ہے، تو تو دیوانہ ہے"!

"الملقیات" کی تعبیر جمع کی صورت میں ہے، حالانکہ وحی کا فرشتہ یعنی جبرئیل ایک سے زیادہ نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات قرآنی آیات کے نزول کے لیے فرشتوں کے بہت سے گروہ جبرئیل کے ہمراہ ہوتے تھے سورہ عبس کی آیہ ۱۵ میں بھی یہ آیا ہے "بایدی سفرہ" یعنی آیاتِ قرآنی خدا کے سفیروں (فرشتوں) کے ہاتھ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئی ہیں"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قسمیں کس مقصد کے لیے ہیں، بعد والی آیت میں اس معنی سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: "جو کچھ تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ واقع ہو کے رہے گا" (انما توعدون لواقع)۔

بعث ونشور، ثواب وعقاب، حساب وجزا سب حق ہے اور ان میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

بعض نے اسے خدا کے تمام وعدوں کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے، چاہے وہ نیکوں سے وعدے ہوں یا بدوں سے، دنیا میں ہوں یا آخرت میں، لیکن بعد والی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مراد صرف وعدۂ قیامت ہے۔[1]

اگرچہ اس آیت میں مسئلہ معاد پر کوئی استدلال نہیں ہوا ہے، اور صرف دعوے پر قناعت کی گئی ہے، لیکن مطلب کی عمدگی یہ ہے کہ گذشتہ قسموں میں ایسے مطالب آئے ہیں، جو خود معاد اور قیامت کے دلائل ہیں، منجملہ ان کے مردہ زمینوں کا بارشوں کے نزول کے ذریعہ زندہ ہونا، جو خود معاد کے منظر کا نمونہ ہے دوسرے پیغمبروں پر خدائی احکام وتکالیف کا نزول اور رسولوں کا بھیجنا جس کا معاد کے بغیر کوئی مفہوم نہیں ہے، خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قیامت کا وعدہ قطعی ویقینی ہے۔

اس مطلب کی نظیر سورہ ذاریات کی آیہ ۲۳ میں بھی آئی ہے، خدا فرماتا ہے: "فورب السماء والارض انه لحق"۔ "آسمان کے پروردگار کی قسم تمھاری روزی حق ہے"۔ "رب" کی قسم: جو پروردگار کی ربوبیت اور عالم خلقت میں اس کی تدبیر کی طرف اشارہ ہے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ بندوں کو روزی کے بغیر نہ چھوڑے۔

اس کے بعد اس موعود دن کی نشانیوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ موعود دن اس وقت آن پہنچے گا، جب ستارے صفحۂ آسمان سے محو اور تاریک ہو جائیں گے" (فاذا النجوم طمست)۔

"اور آسمان (آسمان کے ستارے) پھٹ جائیں گے" (واذا السماء فرجت)۔

"اور جب پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے" (واذا الجبال نسفت)۔

"طمست" "طمس" (بروزن شمس) کے مادے سے کسی چیز کے آثار کو محو اور زائل کرنے کے معنی میں ہے، اور یہاں ممکن ہے ستاروں کی روشنی کے محو ہونے کی طرف اشارہ ہو، یا ان کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے کی طرف۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ سورہ تکویر کی آیہ ۲ میں آیا ہے: واذا النجوم انکدرت، "جب ستارے تاریک ہو جائیں گے"۔

اور "نسفت" "نسف" (بروزن حذف) کے مادہ سے، اصل میں غذا کے دانوں کو چھلنی میں ڈال کر ہلانے کے معنی میں ہے، تاکہ چھلکا دانہ سے الگ ہو جائے اور یہاں پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور پھر ہوا میں بکھر جانے کے معنی میں ہے۔

اصولی طور پر قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام بہت ہی ہولناک اور سرکوبی کرنے والے حوادث کے ایک سلسلہ کے ساتھ ہوگا، اس طور پر کہ اس کے نظام کو کلی طور پر پراگندہ کر دے گا، اور عالم آخرت ایک نئے نظام کے ساتھ اس کی

---

[1] "فاء" کا عطف بھی اسی مطلب کی تائید کرتا ہے۔

جگہ سے لے گا۔

یہ حوادثات اتنے عجیب وغریب اور وحشت ناک ہوں گے کہ کسی بیان کے ساتھ ان کی وضاحت نہیں ہوسکتی، کیا وہ حوادثات جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑ پھینکیں گے اور انھیں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے کہ وہ گرد وغبار میں تبدیل ہوجائیں گے، اور دھنکی ہوئی اون کی صورت اختیار کرلیں گے، قابلِ تعارف ہیں۔

بعض مفسرین کی تعبیر کے مطابق یہ حوادثات اتنے عظیم ہوں گے، کہ وہ عظیم ترین زلزلے جنھیں انسان نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، ان کے مقابلہ میں ایسے ہوں گے جیسے کہ چھوٹے چھوٹے پٹاخے ——— جنھیں بچے کھیلتے ہوئے چلاتے ہیں ——— بہت بڑے ایٹم بم کے مقابلہ میں۔

بہرحال یہ قرآنی تعبیریں نظام ہائے آخرت اور دنیا کے نظاموں میں بہت زیادہ فرق کی دلیل ہیں۔

اور اس کے بعد قیامت کے منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اور یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبروں کے لیے وقت معین ہوگا، کہ وہ اپنی اپنی باری پر آئیں، اور اپنی امتوں کے بارے میں شہادت دیں" (و اذا الرسل اقتت)[1]

جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۶ میں آیا ہے، (فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین)۔ ہم ان لوگوں سے بھی سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے، اور رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "امتوں کے لیے ان رسولوں کی شہادت اور ان کی گواہی کو کس دن کے لیے تاخیر میں ڈالا گیا ہے": (لای یوم اجلت)[2]

"جدائی کے دن کے لیے" (لیوم الفصل)۔

حق سے باطل کی جدائی کا دن، مومنین کی صفوں کا کافروں کی صفوں سے جدا ہونے کا دن، اور نیکوکاروں کے بدکاروں سے جدا ہونے کا دن، اور سب کے بارے میں حق تعالیٰ کی مطلق قضاوت اور انصاف کا دن۔

---

[1] "اقتت" اصل میں "وقت" کے مادہ سے "وقتت" تھا جس میں واو مضموم ہمزہ کے ساتھ تبدیل ہوگئی اور یہ پروردگار کے رسولوں کے لیے "توقیت وقت" کے معنی میں ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ وقت خود ان کیلئے معین نہیں ہوگا، بلکہ ان کے عمل یعنی ان کی شہادت کے لیے معین ہوگا، لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں مقدر ہے۔

[2] اس تفسیر کے مطابق "اجلت" کی ضمیر انبیاء ورسل کی شہادت کی طرف لوٹتی ہے، جو گزشتہ آیت سے معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض نے یہ کہا ہے یہ ان تمام امور کی طرف لوٹتی ہے جو انبیاء اور ان اخبار سے مربوط ہیں، جو انھوں نے ثواب وعقاب اور قیامت وغیرہ کے حوادث کے بارے میں دیئے ہیں، اور بعض نے ان تمام امور کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں، مثلاً ستاروں کا تاریک ہونا وغیرہ ..... لیکن واضح ہے کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ آیت میں ضمیر کا مرجع اس کے ساتھ متصل ہے۔

یہ سوال وجواب اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، اور اس دن کے بارے میں کیسی معنی خیز اور منہ بولتی تعبیر ہوئی ہے "جدائیوں کا دن"

اس کے بعد اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے فرماتا ہے، "تو کیا جانے کہ یوم الفصل اور جدائیوں کا دن کیا ہے" (وما ادرٰیك ما یوم الفصل)۔

جہاں پیغمبر اس وسیع وعریض علم، اور ان تیز بین نگاہوں کے باوجود ——— جو اسرار غیب کا مشاہدہ کرتی تھیں ——— اس دن کی عظمت کے ابعاد وجہات کو ٹھیک طرح سے نہ جانتے ہوں تو باقی لوگوں کی ذمہ داری واضح ہے اور جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے، قیامت کے تمام باعظمت اسرار کا ادراک کرنا، ہم قفس دنیا کے قیدیوں کے لیے ممکن نہیں ہے، ہم تو صرف دور سے ان کا ایک سایہ سا دیکھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اور آخری زیر بحث آیت میں، اس دن کی تکذیب کرنے والوں کو بہت سختی کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

"ویل" کی بعض نے "ہلاکت" کے معنی میں، بعض نے "انواع واقسام کے عذاب" کے معنی میں، اور بعض نے "جہنم کی ایک پُرعذاب وادی" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ یہ لفظ عام طور پر افسوس ناک حوادثات کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں قیامت کے دن تکذیب کرنے والوں کی دردناک سرنوشت کی حکایت کرتا ہے[1]

یہاں مکذبین سے مراد وہ لوگ ہیں جو قیامت کی تکذیب کرتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص قیامت اور خدا کی دادگاہِ عدل اور حسابِ جزا پر ایمان نہ رکھتا ہو، وہ آسانی کے ساتھ ہر قسم کے گناہ اور ظلم وفساد کا مرتکب ہو سکتا ہے، لیکن اس دن پر ایمانِ راسخ، انسان کو ذمہ داری، احساسِ مسئولیت، تقوٰی اور پرہیزگاری بخشتا ہے۔

ایک نکتہ

ان قسموں کا مطلب!

اوپر والی آیات میں پہلے ہواؤں اور طوفانوں کی قسم کھائی گئی ہے، اور یہ اس اہم اثر کی وجہ سے ہے جو وہ عالمِ خلقت میں رکھتی ہیں: بادلوں کو چلاتی ہیں، اور پھر انھیں خشک اور مردہ زمینوں کی بلندی پر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتی ہیں اور بارش برسانے کے بعد انھیں پراگندہ اور منتشر کر دیتی ہیں۔

---

[1] "ویل" کے معنی کے سلسلہ میں مزید وضاحت اور اس کا "ویس" اور "ویح" کے ساتھ فرق جلد ۲۲ صفحہ ۴۰۲ سورۂ ذاریات کی آیہ ۶۰ کے ذیل میں آیا ہے۔

نباتات کے بیجوں کو بکھیرتی ہیں، اور جنگلات اور چراگاہیں وجود میں لاتی ہیں، بہت سے پھولوں اور پھلوں کو بارور کرتی ہیں، اور حرارت و برودت کو زمین کے مختلف مقامات سے دوسرے مقامات کی طرف منتقل کرتی ہیں اور فضا میں اعتدال پیدا کرتی ہیں۔

زندہ اور اوکسیجن سے بھری ہوئی ہوا کو کھیتوں اور صحراؤں سے شہروں کی طرف لے جاتی ہیں، اور گندی ہواؤں کو صاف کرنے کے لیے صحراؤں کی طرف لے جاتے ہیں۔

سمندروں کے پانی کو متلاطم اور امواج بناتی ہیں اور پانی کے اندر زندہ رہنے والی موجودات کے لیے پانی کو اوکسیجن سے پُر کرتی ہیں، ہاں! ہوائیں اور بادہائے نسیم، دنیا میں عظیم اور حیات بخش خدمات انجام دیتی ہیں۔

ان قسموں کا دوسرا حصہ جو فرشتوں کے ذریعہ نزولِ وحی کے پروگرام کی بات کرتا ہے، وہ بھی عالمِ معنی میں اس نسیم سے مشابہ ہے، جو عالم مادہ میں چلتی ہے، فرشتے، وحی کے کلمات کو، جو بارش کے قطروں کی طرح زندہ کرنے والے ہوتے ہیں، خدا کے پیغمبروں کے دلوں پر نازل کرتے ہیں، اور تقویٰ و معارفِ الٰہی کے پھل اور پھول دلوں میں اُگاتے ہیں، اس طرح خدا نے عالمِ مادہ کی تربیت کرنے والوں کی بھی اور عالم معنی کی تربیت کرنے والوں کی بھی قسم کھائی ہے۔

اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ تمام قسمیں اس دن کی واقعیت کے بیان کے لیے ہیں جس میں یہ تمام کوششیں ثمر بخش ہوں گی، جو قیامت کا دن اور یوم الفصل ہے۔

۱۶- اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ؕ
۱۷- ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝
۱۸- كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝
۱۹- وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝
۲۰- اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ۙ
۲۱- فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ۙ
۲۲- اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ۙ
۲۳- فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝
۲۴- وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝
۲۵- اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ۙ
۲۶- اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۝ۙ
۲۷- وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ؕ
۲۸- وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۶- کیا ہم نے پہلی (مجرم) قوموں کو ہلاک نہیں کیا؟
۱۷- پھر ہم بعد میں آنے والوں کو ان کے پیچھے بھیجیں گے۔
۱۸- (ہاں) ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں۔
۱۹- وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۲۰۔ کیا ہم نے تمھیں پست اور حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا
۲۱۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ اور آمادہ قرار گاہ میں ٹھہرایا۔
۲۲۔ ایک معین مدت تک
۲۳۔ ہم اس کام پر قدرت رکھتے تھے، پس ہم کیسے اچھے قدرت والے ہیں (لہذا معاد کا معاملہ ہمارے لیے آسان ہے)
۲۴۔ وائے ہو اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۲۵۔ کیا ہم نے زمین کو انسانوں کے اجتماع کا مرکز قرار نہیں دیا۔
۲۶۔ ان کی زندگی کی حالت میں بھی اور موت کی حالت میں بھی۔
۲۷۔ اور ہم نے اس میں استوار اور بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمھیں ہم نے خوشگوار پانی پلایا۔
۲۸۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے

تفسیر

ان تمام مظاہر قدرت کے باوجود پھر بھی تم معاد میں شک رکھتے ہو؟!

ان آیات میں بھی منکرین قیامت کو مختلف طریقوں سے خبردار کرتا ہے، اور گوناں گوں بیانات کے ساتھ انھیں غفلت کی گہری نیند سے بیدار کرتا ہے۔

پہلے ان کا ہاتھ پکڑ کر گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں گزشتہ مصیبت زدہ اقوام کی سرزمین دکھاتا ہے، اور فرماتا ہے "کیا ہم نے پہلی قوموں کو جنھوں نے کفر و انکار کی راہ اختیار کی تھی ہلاک نہیں کیا" (الم نهلك الاولين)۔

ان کے آثار نہ صرف صفحات تاریخ پر، بلکہ صفحہ روئے زمین پر بھی نمایاں ہیں۔ قوم "عاد" و "ثمود" اور "قوم نوح" و "قوم لوط" اور قوم "فرعون" جیسی اقوام، جن میں سے کوئی گروہ طوفان سے، کوئی گروہ صاعقہ (بجلی) سے، کوئی گروہ تیز آندھی سے، اور کوئی قوم زلزلہ اور آسمانی پتھروں کے عذاب سے نابود ہو گئی۔

"پھر ہم بعد میں آنے والی قوموں کو جو ان ہی جیسے اعمال رکھتی ہیں، ان کے پیچھے بھیج دیتے ہیں" (ثم نتبعهم الآخرين)۔

کیونکہ یہ ایک مسلسل جاری رہنے والی سنت ہے اور اس میں استثناء اور تبعیض نہیں ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک گروہ کو ایک جرم کی وجہ سے سزا دے اور اسی جرم کو دوسروں کے لیے پسند کرے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "ہم گنہ گاروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں" (کذالک نفعل بالمجرمین)۔

یہ آیت حقیقت میں "اقوام اوّلین" کی ہلاکت، اور ان کے بعد آنے والی اقوام کی ہلاکت کی دلیل کے طور پر بیان ہوئی ہے، کیونکہ خدائی عذاب میں، نہ تو انتقام جوئی کا پہلو ہوتا ہے، اور نہ ہی شخصی حساب کا تصفیہ، بلکہ وہ اصل استحقاق اور مقتضائے حکمت کے تابع ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اوّلین سے مراد وہ قومیں ہیں جو ماضی بعید میں تھیں، مثلاً قوم نوح و عاد و ثمود، اور آخرین سے مراد وہ قومیں ہیں جو ان کے بعد آئیں، مثلاً قوم لوط و قوم فرعون۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نتبعھم" فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، جبکہ "الم نھلك" ماضی کا معنی رکھتا ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "اولین" ان تمام گزری ہوئی قوموں کے لیے آیا ہے، جو عذابِ الٰہی کے ساتھ ہلاک ہوئیں، اور "آخرین" ان تمام کفار کو شامل ہے، جو پیغمبرؐ کے زمانے میں تھے یا جو اس کے بعد عرصۂ وجود میں قدم رکھیں گے اور جرم و گناہ اور ظلم و فساد میں آلودہ ہوں گے۔

اور انجام کار نتیجہ نکالتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے"۔ (ویل یومئذ للمکذبین)۔

"یومئذ" یہاں روزِ قیامت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان کی اصلی اور اہم سزا اسی روز کے ساتھ مربوط ہے، اور یہ تکرار تاکید مطلب کے لیے ہے، اور یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے۔ کہ یہ آیت عذابِ دنیا کو بیان کر رہی، اور اس کی مشابہ آیت جو اس سے پہلے آئی ہے وہ عذابِ آخرت کو بیان کرتی ہے۔ بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر عالمِ جنین کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی عظمت و قدرت، اور اس اسرار آمیز دنیا میں، اس کی نعمتوں کی کثرت انہیں دکھاتا ہے، تاکہ ایک طرف تو مسئلہ معاد و قیامت پر خدا کی قدرت سے آگاہ ہو جائیں اور دوسری طرف خود کو اس کی بے شمار نعمتوں کا مرہون سمجھیں، اور اس کے آستانے پر سرِ تعظیم جھکائیں۔

فرماتا ہے: "کیا ہم نے تمہیں پست اور ناچیز پانی سے پیدا نہیں کیا ہے"؟ (الم نخلقکم من ماء مھین)۔

"پھر ہم نے اسے مناسب، محفوظ، تیار و آمادہ قرارگاہ میں ٹھہرایا"۔ (فجعلناہ فی قرار مکین)۔

لہ "قرار" "محل استقرار" کے معنی میں ہے اور "مکین" "محفوظ" کے معنی میں ہے، اور اصل میں "مکانت" سے ہے، جو تمکن کے معنی میں آیا ہے البتہ "مکانت" بعض اوقات "منزلت" کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ایسی قرارگاہ، جس میں ہر لحاظ سے، حیات وزندگی اور انسانی نطفہ کی پرورش ورشد ومحافظت کے لیے، تمام ضروریات موجود ہیں، اور وہ اس قدر عجیب وغریب، عمدہ اور موزوں ہیں کہ ہر انسان کو تعجب میں ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "نطفہ کا اس محفوظ جگہ میں ٹھہرنا، ایک معین مدت تک جاری رہتا ہے" (الی قدر معلوم)۔ وہ مدت جس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا، ایسی مدت جو بہت سے تغیرات، دگرگونیوں اور تحولات سے پُر ہے، جس میں نطفہ کو ہر روز حیات وزندگی کا ایک نیا لباس پہنایا جاتا ہے، اور اس کو اس مخفی جگہ میں تکامل وارتقاء کے راستہ پر آگے بڑھاتا ہے۔

اس کے بعد نتیجہ نکالتا ہے: "ہم اس کام پر قدرت رکھتے تھے کہ ایک بے قدر وقیمت، حقیر وناچیز نطفہ سے، ایسا شریف اور کامل انسان بنا ڈالیں، پس ہم کتنے اچھے قادر وتوانا ہیں" (فقدرنا فنعم القادرون)۔[۱]

یہ وہی دلیل ہے جس پر قرآن نے مسئلہ معاد کو ثابت کرنے کے لیے بارہا انحصار کیا ہے، منجملہ ان کے سورۂ حج کی ابتدائی آیات میں کہتا ہے "تم مردوں کے نئی زندگی کی طرف پلٹ آنے کی، کیسے تردید کرتے ہو، حالانکہ تم اس انسان کی، ایک بے قدر وقیمت نطفہ سے خلقت میں، اس کی قدرت کا مشاہدہ کرتے ہو، جس کا ہر روز ایک معاد وقیامت ہے تو مٹی اور اس بے قدر وقیمت نطفہ میں کیا فرق ہے؟

آخر میں پھر اسی جملہ کا تکرار فرماتے ہوئے کہتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وائے ہے ان کے لیے جو اس کی قدرت کے یہ سب آثار دیکھتے ہیں، اور پھر بھی اس کا انکار کرتے ہیں۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

ایها المخلوق السوی والمنشأ المرعی فی ظلمات الارحام، و مضاعفات الاستار، بدئت من سلالة من طین، وضعت فی قرار مکین، الی قدر معلوم، واجل مقسوم، تمور فی بطن امك جنینا، لا تحیر دعاء، ولا تسمع نداء ثم اخرجت من مقرك الی دار لم تشهدها، ولم تعرف سبل منافعها فمن هداك

---

[۱] اس آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں "فنعم القادرون نحن" ہے۔ (اصطلاح کے مطابق مخصوص بالمدح محذوف ہے)۔

[۲] بعض مفسرین نے اس آیت کی اس طرح تفسیر کی ہے "ہم نے نطفہ کی ضروری اندازہ گیریوں، مختلف مقدرات، اور جسم وجان میں خصوصیات کے ساتھ، تقدیر کی ہے، اور ہم اچھی تقدیر کرنے والے ہیں، لیکن یہ تفسیر اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ——— کہ متن قرآن اور مشہور قرأت تشدید کے بغیر ہے ——— بعید نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہ کہا ہے کہ ثلاثی مجرد کا مادہ بھی اندازہ کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ لیکن عام استعمالات میں لفظ "قادر" اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ (غور کیجیے)

لاجترار الغذاء من ثدی امك، وعرفك عند الحاجة مواضع طلبك وارادتك

"اے وہ مخلوق! جسے مناسب جسم کے ساتھ محفوظ ماحول میں پیدا کیا گیا ہے، رحم کی تاریکیوں اور کئی کئی پردوں میں تیری خلقت کا آغاز گیلی مٹی کے جوہر سے ہوا ہے، اور ایک محفوظ قرار گاہ میں ایک وقت معلوم اور معین مدت تک تجھے ٹھہرایا گیا ہے۔

وہ دن جس میں تو اس طرح تھا، اور رحمِ مادر میں حرکت کرتا تھا، نہ تو تجھ میں جواب دینے کی قدرت تھی، اور نہ ہی کسی کی آواز سننے کی توانائی تھی، اس کے بعد تو اس قرار گاہ سے ایسے گھر کی طرف آیا جسے تو نے ہرگز مشاہدہ نہیں کیا تھا، اور اس کے منافع کے راستے کو تو پہچانتا نہیں تھا۔

اب تو یہ بتا کہ تجھے تیری ماں کے پستان سے دودھ پینے کی ہدایت کس نے کی تھی؟ اور تجھے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے طریقے کس نے بتائے تھے؟[1]

ان آیات کے دوسرے حصہ میں خدا کی آفاقی آیات اور نشانیوں اور عظیم جہان میں اس کی نعمتوں اور مواہب کے ایک حصہ کو بیان کیا گیا ہے جو اس کی وسیع قدرت اور رحمت کی بھی ایک دلیل ہیں اور معاد کے امکان کی بھی ایک دلیل ہیں، جبکہ گزشتہ آیات میں خدا کی آیات انفسی اور خود انسان کی خلقت میں جو نعمتیں تھیں، ان کے بارے میں گفتگو تھی۔

فرماتا ہے: "کیا ہم نے زمین کو انسانوں کے اجتماع کا مرکز نہیں بنایا؟" (الم نجعل الارض کفاتا)۔[2]

"ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کی صورت میں بھی" (احیاء و امواتا)۔[3]

"کفات" (بروزن کتاب) اور "کفت" (بروزن کشف) جمع کرنے اور کسی چیز کو ایک دوسری کے ساتھ ملانے کے معنی میں ہے، اور پرندوں کی سریع اور تیز پرواز کو بھی "کفات" کہا جاتا ہے، کیونکہ تیز پرواز کے وقت وہ اپنے پروں کو اکٹھے کر لیتے ہیں، تاکہ زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا کو چیرتے آگے نکل جائیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ زمین تمام انسانوں کے لیے ایک قرار گاہ ہے، زندوں کو تو اپنے اوپر جمع کرتی ہے، اور ان کی تمام حاجتوں اور ضروریات کو پورا کرتی ہے، اور ان کے مردوں کو بھی اپنے اندر جگہ دیتی ہے، کیونکہ اگر زمین مردوں کو دفن کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتی، تو ان سے پیدا ہونے والی عفونت اور بیماریاں تمام زندوں کے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دیتیں۔

ہاں! زمین ایک ماں کی طرح، جو اپنی اولاد کو اپنے گرد جمع کرتی ہے، اور اپنے پر و بال کے نیچے قرار دیتی ہے، انسانوں کو اپنے اوپر جگہ دیتی ہے، ان پر نوازش کرتی ہے، انھیں غذا کھلاتی ہے، لباس پہناتی ہے، گھر اور مسکن دیتی ہے اور اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۳

[2] "کفاتا" "جعلنا" کا دوسرا مفعول ہے اور ایسا مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے۔

[3] "احیاءً و امواتا" ایک محذوف مفعول کی ضمیر کا حال ہے اور تقدیر میں "کفاتا لکم احیاءً و امواتا" تھا۔

اوران کے مردوں کو بھی اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے اور جذب کر لیتی ہے، اوران کے بُرے آثار کو ختم کر دیتی ہے ۔

بعض نے " کفات " کی یہاں " پرواز سریع" کے ساتھ تفسیر کی ہے اور وہ اس آیت کو سورج کے گرد زمین کی حرکت اور دوسری حرکات کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو نزولِ قرآن کے موقع پر قطعاً کشف نہیں ہوئی تھی

لیکن اس کے بعد والی آیت یعنی " احیاءً و امواتاً " کی طرف توجہ کرنے سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے ۔

خصوصاً ایک روایت میں آیا ہے کہ امیرالمومنین علیؑ جب میدان صفین سے واپس لوٹ رہے تھے اور کوفہ کے قریب پہنچے تو جب آپ کی نظر مبارک کوفہ کے دروازے سے باہر قبرستان پر پڑی تو فرمایا :

هٰذه کفات الاموات ای مساکنهم

" یہ مردوں کے کفات یعنی ان کے مسکن اور گھر ہیں"

پھر آپ نے کوفہ کے گھروں پر نظر کی اور فرمایا :

هٰذه کفات الاحیاء

" یہ زندوں کے گھر ہیں"

اس کے بعد آپ نے اوپر والی آیات کی تلاوت فرمائی : الم نجعل الارض کفاتاً احیاءً واموتاً [1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زندوں اور مردوں کے گھروں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے ۔

اس کے بعد کرۂ زمین میں خدا کی ایک عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : " ہم نے اس میں ثابت استوار اور بلند پہاڑ قرار دیئے ہیں" (وجعلنا فیها رواسی شامخات) [2]

یہ پہاڑ جن کی چوٹیاں آسمان کی طرف سر نکالے ہوئے ہیں، اوران کی جڑیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، ایک طرف تو زمین کو زرہ کی مانند گھیرے ہوئے ہیں، اور داخلی دباؤ اور خارجی مدوجزر سے پیدا ہونے والے دباؤ سے محفوظ رکھتے ہیں، اور دوسری طرف ہوا کے قشر کے زمین سے ٹکراؤ کو روکتے ہیں، اور ہوا میں پنجہ ڈال کر اس کو اپنے ساتھ گردش میں لاتے ہیں اور تیسری طرف عظیم طوفانوں اور آندھیوں کو کنٹرول کرتے ہیں اور اس طرح کئی مختلف جہات سے اہلِ زمین کو سکون و آرام پہنچاتے ہیں ۔

اسی آیت کے ذیل میں پہاڑوں کی برکات میں سے ایک اور برکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے : " اور ہم نے تمھیں خوشگوار پانی پلایا" (و اسقیناکم ماء فراتاً) ۔

ایسا پانی جو تمھارے لیے بھی خوش گوار اور باعثِ حیات ہے اور تمھارے جانوروں، کھیتوں اور باغات کے لیے بھی ۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۱۷ (نقل از تفسیر علی بن ابراہیم)

[2] "رواسی" "راسیہ" کی جمع ہے، جو ثابت و پابرجا کے معنی میں ہے اور " شامخات " " شامخ " کی جمع ہے جو بلند کے معنی میں ہے اور بعض عبارتوں میں جیسے " شمخ بانفه " تکبر کے کنایہ ہے (مفردات راغب)

یہ ٹھیک ہے کہ تمام خوشگوار پانی بارش سے ہیں، لیکن پہاڑوں کا بھی اس میں اہم ترین نقش واثر ہے، بہت سے چشمے اور ندی نالے پہاڑوں سے پھوٹتے ہیں اور بہت سے بڑے بڑے دریاؤں اور نہروں کا سرچشمہ برف کے وہ تہہ بہ تہہ تودے ہیں جو پہاڑوں کی چوٹی پر آکر جم جاتے ہیں اور انسانوں کے پانی کے اہم ترین ذخائر بناتے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیاں سطح زمین سے دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سرد ہوتی ہیں، اور سالہا سال تک برف کے ذخائر کو اپنے اندر جگہ دے سکتی ہیں، تاکہ وہ تدریجاً اور آہستہ آہستہ سورج کی حرارت سے پانی بن بن کر نہروں اور دریاؤں کی صورت میں جاری ہوتے رہیں۔

اس حصہ کے آخر میں پھر فرماتا ہے: "وائے ہو اس دن تکذیب کرنے والوں پر" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وہی لوگ جو حق تعالیٰ کی قدرت کی ان تمام آیات اور نشانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو جن میں وہ غرق ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، پھر بھی وہ قیامت اور دادگاہِ قیامت کا، جو اس کے عدل وحکمت کی مظہر ہے، انکار کرتے ہیں۔

۲۹۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۚ ○
۳۰۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ ○
۳۱۔ لَّا ظَلِیْلٍ وَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ؕ ○
۳۲۔ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۚ ○
۳۳۔ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ؕ ○
۳۴۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ○
۳۵۔ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ۙ ○
۳۶۔ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ○
۳۷۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ○
۳۸۔ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ ○
۳۹۔ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَیْدٌ فَكِیْدُوْنِ ○
۴۰۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۚ ○

ترجمہ

۲۹۔ (اور اس دن انھیں کہا جائے گا) بلا توقف اس چیز کی طرف چل پڑو، جس کا تم ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے۔
۳۰۔ تین شاخوں والے (خفقان بار آگ کے دھوئیں کے) سایہ کی طرف چلو۔
۳۱۔ ایسا سایہ جو نہ تو آرام بخش ہے، اور نہ ہی آگ کے شعلوں سے روکتا ہے۔
۳۲۔ وہ اپنے شعلوں کو اس طرح سے پھینکتا ہے جیسا کہ کوئی محل ہو۔

۳۳۔ گویا وہ (سرعت اور کثرت میں) ایسے زرد اونٹوں کے مانند ہیں (جو ہر طرف بکھر جاتے ہیں)۔
۳۴۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۳۵۔ آج کا دن ایسا ہے جس میں وہ کوئی بات نہیں کریں گے (اور ان میں اپنے آپ سے دفاع کرنے کی قدرت نہیں ہوگی)۔
۳۶۔ اور انھیں عذر کرنے کی بھی اجازت نہیں ملے گی۔
۳۷۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۳۸۔ آج وہی (حق سے باطل کی) جدائی کا دن ہے، جس میں ہم نے تمھیں اور گزشتہ لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔
۳۹۔ اگر میرے مقابلہ میں (عذاب اور سزا کے چنگل سے فرار کرنے کی) کوئی تدبیر تمھارے پاس ہے تو اسے انجام دو۔
۴۰۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

تفسیر

نہ دفاع کرنے کی قدرت ہے نہ فرار کی راہ

ان آیات میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں اور اس عدلِ الٰہی کی دادگاہ کا انکار کرنے والوں کی اصلی اور آخری سرنوشت بیان ہوئی ہے، ایسا بیان جو انسان کو سچ مچ ایک گہری دہشت میں ڈبو دیتا ہے، اور مصیبت کے پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ان سے کہا جائے گا، بلا تامل اس چیز کی طرف چل پڑو، جس کا تم ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے"! (انطلقوا الیٰ ما کنتم بہ تکذبون)۔

چلو اس جلانے والی جہنم کی طرف جس کا تم ہمیشہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

چلو ان انواع و اقسام کے عذابوں کی طرف، جنھیں تم نے اپنے اعمال کے ذریعہ پہلے سے فراہم کر رکھا ہے۔

"انطلقوا" "انطلاق" کے مادہ سے، توقف کے بغیر چلنے کے معنی میں ہے، اور قید و بند سے ایک قسم کی آزادی بھی اس میں چھپی ہوئی ہے، اور یہ حقیقت میں عرصۂ محشر میں ان کی حالت کی وضاحت ہے کہ انھیں ایک طولانی مدت تک حساب کے لیے روک لیا جائے گا، پھر ان کو چھوڑ دیں گے اور کہیں گے کہ توقف کیے بغیر دوزخ کی طرف چل پڑو۔

یہ گفتگو کرنے والا ممکن ہے خداوند تعالیٰ ہو، جو براہِ راست ان سے خطاب کرے گا، یا عذاب کے فرشتے، بہرحال یہ ایک ایسا لب و لہجہ ہے

جس میں گہری سرزنش ہے، جو خود ایک دردناک اور جانکاہ عذاب ہے۔

اس کے بعد اس عذاب کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: "تین شاخوں والے (آگ کے گھٹا گھوٹنے والے دھوئیں کے) سایے کی طرف چلو" (انطلقوا الیٰ ظل ذی ثلاث شعب)۔

ایک شاخ سر کے اوپر، ایک شاخ دائیں طرف اور ایک شاخ بائیں طرف، اور اس طرح سے یہ گہرا مرگبار دھواں انھیں گھیرے گا اور انھیں نگل جائے گا۔

لیکن وہ آرام بخش سایہ نہیں ہوگا، اور دوزخیوں کو جہنم کی آگ کے شعلوں سے ہرگز نہیں بچائے گا" (لا ظلیل ولا یغنی من اللھب)۔

چونکہ وہ خود آگ ہی سے اٹھا ہے۔

ممکن ہے "ظل" (سایہ) کی تعبیر سے یہ تصور پیدا ہو کہ وہاں کوئی سایہ بھی ہوگا، جو آگ کے شعلوں کے جلانے میں کچھ کمی کر دے لیکن یہ آیت اس غلط خیال کو باطل کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ سایہ ہرگز وہ سایہ نہیں جس کا تم تصور کرتے ہو، یہ ایک ایسا سایہ ہے، جو جلانے اور گلا گھوٹنے والا ہے، جو آگ کے گاڑھے دھوئیں سے اٹھتا ہے، اور شعلوں کی گرمی کو مکمل طور پر منعکس کر سکتا ہے[1]

اس گفتگو کی شاہد سورۂ واقعہ کی آیات ہیں، جن میں اصحاب شمال کے بارے میں فرماتا ہے: فی سموم وحمیم و ظل من یحموم لا بارد و لا کریم" وہ ہلاک کرنیوالی ہواؤں اور جلانے والے پانی میں ہوں گے، اور تہ بہ تہ دھوئیں کے آتش زا سایہ میں، ایسا سایہ جو نہ تو ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی آرام بخش۔ (سورۂ واقعہ ۴۲ ——— ۴۴)

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تین شاخیں ان کے تینوں اصولِ دین یعنی توحید و نبوت اور معاد کو جھٹلانے کا ردِ عمل ہیں، کیونکہ معاد کی تکذیب، توحید و نبوت کی تکذیب سے جدا نہیں ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ گناہ کے تینوں اسباب، "قوت غضبیہ" "قوت شہویہ" اور "قوت وہمیہ" کی طرف اشارہ ہے، ہاں! وہ تاریک دھواں شہوات کی تاریکیوں کا تجسم ہے۔

ز تاریکی خشم و شہوت حذر کن
کہ از دود آن چشم دل تیرہ گردد!
غضب چوں در آید رود عقل بیروں
ہوی چوں شود چیرہ جان خیرہ گردد!

ترجمہ: غضب اور شہوت کی تاریکی سے بچ!

---

[1] "لا ظلیل" "ظل" کی صفت ہے اور اسی بناء پر مجرور ذکر ہوا ہے۔

جس کے دھوئیں سے دل کی آنکھ اندھی ہوجاتی ہے
جب غصہ آتا ہے ، تو عقل خارج ہوجاتی ہے
اور جب خواہش نفسانی غلبہ کرتی ہے ، تو جان چڑھیا جاتی ہے

اس کے بعد اس جلانے والی آگ کی ایک اور خصوصیت کے سلسلہ میں مزید کہتا ہے: " وہ اپنے اندر سے ایسے شعلے باہر پھینکتی ہے، جو ایک بہت بڑے قصر کی مانند ہوتے ہیں"۔ (انها ترمی بشرر کالقصر)[1]۔

وہ اس دنیا کی آگ کے شعلوں کی طرح نہیں ہوتے، جو بعض اوقات تو سوئی کے سرے کے برابر بھی نہیں ہوتے۔

" قصر " (محل) کی تشبیہ یہاں ایک پُر معنی تشبیہ ہے، شاید یہ تصور کیا جائے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ یہ کہا جاتا کہ وہ شعلے پہاڑ کی طرح تھے، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پہاڑ ـــــ جیسا کہ گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے ـــــ انواع واقسام کی برکات کا منبع ہیں اور میٹھے، خوش مزہ اور خوش گوار پانی کا سرچشمہ ہیں، یہ ستم گروں کے قصر اور محلات ہیں، جو جلانے والے شعلوں اور شرر بار آگ کا سبب بنتے ہیں[2]۔

بعد میں آیت میں اس جلانے والی آگ کے شعلوں اور چنگاریوں کی ایک دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، "وہ زرد رنگ کے اونٹوں کے مانند ہیں" (کانه جمالت صفر)[3]۔

" جمالة " " جمل" کی جمع ہے، جو اونٹ کے معنی میں ہے، (جیسے حجر و حجارہ) اور " صفر" (بروزن قفل) " اصفر" کی جمع ہے جو زرد رنگ کی چیز کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات تاریک اور سیاہی مائل رنگوں پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن یہاں وہی پہلا معنی ہی مناسب ہے کیونکہ آگ کے شعلے زرد اور سرخی مائل ہوتے ہیں۔

گزشتہ آیت میں ان شعلوں کو حجم کے لحاظ سے بہت بڑے قصر سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس آیت میں کثرت، رنگ، سرعت حرکت اور ہر طرف پراگندہ اور بکھر جانے کے لحاظ سے زرد رنگ کے اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو ہر طرف رواں دواں ہیں۔

---

[1] " شرر " (بروزن ضرر) " شرارہ " کی جمع ہے، جو ان چھوٹے چھوٹے اجزاء کے معنی میں ہے، جو آگ سے نکل کر ہوا میں اچھلتے ہیں، اور " شر" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔

[2] بعض مفسرین مثلاً فخر رازی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے " قصر" کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ لکڑیاں ہیں، جنھیں سردیوں کے لیے بیابان سے کاٹ کر اکٹھا کیا کرتے تھے، اور ایک دوسرے کے اوپر جوڑ دیتے تھے۔ (لہذا بعید نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی اسی بناء پر ہو کہ ایک دوسرے پر جڑی ہوئی لکڑیوں کے انبوہ کو ایک بلند قصر سے تشبیہ دیتے تھے)۔

[3] " کانه " کی ضمیر ممکن ہے " قصر" کی طرف لوٹے یا " شرر" کی طرف، لیکن چونکہ " شرر" جمع ہے، لہذا تاویل کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر یہ کہ ہم " شرر" کو اسم جمع سمجھ لیں۔

جہاں شعلے اس قسم کے ہوں تو یہ بات واضح ہے کہ خود وہ جلانے والی آگ کیسی ہوگی ؟ اور اس کے ساتھ دوسرے کیسے کیسے دردناک عذاب ہوں گے ؟ (خدا ہم سب کو اپنی رحمت اور لطف و کرم سے اس سے محفوظ رکھے)

آیات کے اس حصہ کے آخر میں دوبارہ اسی تنبیہ کا تکرار کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

اس کے بعد اس ہولناک دن کے مشخصات اور امتیازات کی ایک اور فصل کو شروع کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "آج ایسا دن ہے کہ وہ کوئی بات نہیں کریں گے" (ھٰذا یوم لا ینطقون)[1]

ہاں! اس دن خدا مجرموں اور گنہ گاروں کے منہ پر سکوت اور خاموشی کی مہر لگا دے گا، جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیہ ۶۵ میں آیا ہے: "الیوم نختم علیٰ افواھھم "آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے" اور پھر جیسا کہ اسی آیت کے ذیل میں آیا ہے "ان کے ہاتھ اور پاؤں کلام کرنے لگیں گے" یہاں تک کہ قرآن کی دوسری آیات کے مطابق ان کی جلدیں بھی کلام کرنے لگیں گی، اور تمام باتیں بیان کر دیں گی"۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور انھیں عذر خواہی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی" (ولا یؤذن لھم فیعتذرون)[2]۔

نہ تو انھیں بات کرنے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی عذر خواہی اور اپنے آپ سے دفاع کرنے کی، کیونکہ وہاں تو تمام حقائق واضح و روشن ہیں، اور کہنے کی کوئی بات باقی نہیں ہے، ہاں! یہ پس پشت ڈالنے والی زبان، جس نے دنیا میں اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا، انبیاء کی تکذیب کی، اولیاء کا استہزا کیا اور مذاق اڑایا، حق کو باطل اور باطل کو حق کر کے پیش کرتی رہی، وہاں ان اعمال کی سزا کے طور پر اس پر قفل لگ جانا چاہیے، اور اسے بیکار ہو جانا چاہیے، اور یہ بات خود ایک عذاب اور دردناک شکنجہ ہے کہ انسان میں اس قسم کے منظر میں اپنے آپ سے دفاع کرنے یا عذر خواہی کرنے کی قدرت نہ رہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ:

"خدا اس سے برتر و عادل تر و بزرگ تر ہے کہ اس کا بندہ کوئی مناسب اور مدلل عذر رکھتا ہو، لیکن وہ اس کو

---

[1] توجہ رکھیں کہ یہاں "یوم" تنوین کے بغیر ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی "لا ینطقون" کے جملے کے مفہوم کی طرف اضافت ہوئی ہے۔

[2] اس بارے میں کہ "فیعتذرون" کا جملہ مرفوع صورت میں کیوں آیا ہے، جبکہ قاعدہ کی رُو سے اسے منصوب ہونا چاہیے تھا، اور اس کی نون حذف ہونی چاہیے تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے عذر خواہی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی عذر ہی نہ ہوگا، یہ اذنِ الٰہی کے نہ ہونے کے سبب سے نہ ہوگا۔

عذر خواہی کی اجازت نہ دے، بلکہ درحقیقت ان کے پاس کسی قسم کا مناسب، مدلّل اور قابلِ قبول عذر ہوتا ہی نہیں، جسے وہ پیش کرسکیں"۔ [1]

البتہ بعض قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں مجرمین بعض اوقات بات کریں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ـــــــ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ـــــــ قیامت میں بہت سے مواقف ہوں گے، جن میں سے بعض میں زبان بیکار ہوجائے گی، اور اعضاء وجوارح کی گواہی کی نوبت آئے گی، اور بعض دوسرے مواقف میں زبان کھل جائے گی، اور وہ کچھ مطالب کو بیان کرے گی، جو ان کی شدید حسرت واندوہ، سرگردانی اور بدبختی کی نشانی ہے۔

اور پھر اس مقطع کے آخر میں کہتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

ایک دوسرے حصّہ میں روئے سخن مجرمین کی طرف کرتے ہوئے اس روز کے منظر کی حکایت کے عنوان سے کہتا ہے: "آج وہی جدائی کا دن ہے، جس میں ہم نے تمھیں اور گزشتہ لوگوں کو جمع کردیا ہے" (ھٰذا یوم الفصل جمعناکم والاولین)۔

آج ہم نے تمام لوگوں کو بغیر کسی استثناء کے، اوّلین سے لے کر آخرین تک، سب کو حساب دینے اور فصلِ خصومت کے لیے اس میدان اور عظیم دادگاہ میں اکٹھا کردیا ہے۔

"اب اگر میرے مقابلہ میں عذاب اور سزا کے چنگل سے، فرار کرنے کی کوئی تدبیر تمھارے پاس ہے تو اسے انجام دو" (فان کان لکم کید فکیدون)۔ [2]

کیا تم میری حکومت کی حدود سے فرار کرسکتے ہو؟

یا میری قدرت پر غلبہ حاصل کرسکتے ہو؟

یا فدیہ دے کر آزاد ہوجانے کی طاقت رکھتے ہو؟

یا حساب لینے والے مامورین کو دھوکہ دینے کی قدرت رکھتے ہو؟

جو کام بھی تم سے ہوسکتا ہے اسے انجام دو، لیکن جان لو کہ تم سے کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا۔

---

[1] "نورالثقلین"، جلد ۵، ص ۴۹۔

[2] "فکیدون" میں "نون" محذوف ہے (نون کے نیچے زیر ہے) اور اس کی یہ زیر یاء متکلم کی جگہ ہے اور اصل میں "فکیدونی" تھا، "یاء" حذف ہوگئی اور کسرہ جو اس کی نشانی ہے باقی رہ گئی، اور ضمیر متکلم ظاہر آیات کے مطابق خدا کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے، اور یہ احتمال کہ یہ پیغمبرؐ کی ذات کی طرف لوٹے، بہت بعید نظر آتا ہے۔

حقیقت میں یہ امر اصطلاح کے مطابق (ایک عاجزی کا اظہار کرنے والا امر ہے) جو مقابل کے عجز و ناتوانی کو واضح کرنے کے لیے بیان کیا جاتا ہے، یہ اسی چیز کے مشابہ ہے جو قرآن مجید کے بارے میں آئی ہے کہ فرماتا ہے: "اگر اس چیز میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تمھیں شک ہے تو اس جیسی لے آؤ"۔

"کید" (بروزن صید) جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: ایک قسم کی تدبیر اور چارہ جوئی کے معنی میں ہے جو بعض اوقات قابلِ مذمت ہوتی ہے اور کبھی قابلِ تعریف و مدح، اگرچہ اس کا زیادہ تر استعمال مذموم موارد میں ہی ہوتا ہے (جیسا کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی طرح ہے)۔

یقیناً اس دن ان سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دن ایک ایسا دن ہوگا کہ اس میں انسان کا ہاتھ ہر قسم کے وسائل و اسباب سے خالی ہوگا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۶۶ میں آیا ہے: "وتقطعت بهم الاسباب": "ان سے سب اسباب منقطع ہو جائیں گے"۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو فرماتا ہے: "یوم الفصل" یعنی جدائیوں کا دن، اور دوسری طرف سے فرماتا ہے، وہ دن "یوم الجمع" یعنی اکٹھا ہونے کا دن ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک، ایک ہی جگہ پر انجام پائیں گے، پہلے ان سب کو اس عظیم دادگاہ میں جمع کریں گے، اور پھر وہ اپنے عقائد و اعمال کی بناء پر مختلف صفوں میں الگ الگ ہو جائیں گے، یہاں تک کہ وہ بھی جنت کی طرف روانہ ہوں گے، گوناگوں صفوں اور مختلف درجات میں ہوں گے، اور دوزخ کی طرف جانے والے بھی مختلف صفوں اور الگ الگ درجوں میں ہوں گے"۔

ہاں! وہ دن حق کی باطل سے اور ظالم کی مظلوم سے جدائی کا دن ہے۔

پھر اسی تہدید آمیز اور بیدار کرنے والے جملہ کا تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کیلئے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

۴۱۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ
۴۲۔ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ؕ
۴۳۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ
۴۴۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ
۴۵۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ
۴۶۔ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ
۴۷۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ
۴۸۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ
۴۹۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ
۵۰۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ع

ترجمہ

۴۱۔ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ (جنّت کے درختوں کے) سایہ میں اور چشموں کے درمیان ہوں گے۔
۴۲۔ اور پھلوں میں سے جنھیں وہ چاہیں گے
۴۳۔ کھاؤ اور مزے مزے سے پیو، یہ ان اعمال کے مقابلہ میں ہے جنھیں تم انجام دیتے تھے۔
۴۴۔ ہم نیکو کار لوگوں کو اسی طرح سے جزا دیں گے۔
۴۵۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۴۶۔ (اس کے مقابلہ میں مجرموں سے کہا جائے گا) کھالو اور اس تھوڑی سی مدّت میں فائدہ اٹھالو (لیکن جان لو کہ خدا کا عذاب تمھارے انتظار میں ہے) کیونکہ تم مجرم ہو۔
۴۷۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۴۸۔ اور جب ان سے رکوع کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو رکوع نہیں کرتے۔
۴۹۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۵۰۔ (اگر وہ اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے) تو پھر اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

تفسیر

اگر وہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے؟!

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کا پروگرام انذار کو بشارت کے ساتھ اور تہدید کو تشویق کے ساتھ ملاتا ہے، اور اسی طرح مومنین کی سرنوشت کو مجرموں کی سرنوشت کے مقابلہ میں بیان کیا جاتا ہے، تاکہ مقابلہ کے قرینہ سے مسائل کا بہتر طریقہ پر ادراک ہو سکے۔

اسی سنت کی بنیاد پر اوپر والی آیات میں، قیامت میں مجرموں کی گوناگوں سزاؤں کو بیان کرنے کے بعد، اس دن پرہیزگاروں کی کیفیت کے بارے میں ایک پُرمعنی اور مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ درختوں کے سایہ اور چشموں کے درمیان ہوں گے" (ان المتقین فی ظلال وعیون)۔

یہ اس حالت میں ہے جبکہ مجرمین ——— جیسا کہ گزشتہ آیات میں معلوم ہو چکا ہے ——— گلہ گھونٹنے والے شرربار اور جلانے والے دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے۔

"ظلال" "ظل" کی جمع ہے جو سایہ کے معنی میں ہے، چاہے وہ سایہ دن میں درختوں کے سایہ کی طرح کا ہو، یا وہ سایہ ہو، جو رات کی تاریکی میں حاصل ہوتا ہے جبکہ "فیء" اس سایہ کو کہا جاتا ہے جو صرف ایک نورانی مبدء کے مقابلے میں وجود میں آتا ہے، جیسا کہ سورج کے مقابلہ میں درختوں کا سایہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ ان انواع واقسام کے پھلوں کے درمیان ہوں گے، جن کی انھیں خواہش ہوگی" (وفواکہ مما یشتھون)۔

یہ بات واضح ہے کہ پھلوں سایوں اور چشموں کا ذکر، ان پر خدا کی عظیم نعمتوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ ہے، ایسا گوشہ جو اہلِ دنیا کی زبان میں بیان کرنے اور تصویر کشی کے قابل ہے، لیکن وہ نعمتیں جو بیان میں نہیں آسکتیں، اور دنیا میں رہنے والوں کے دل ودماغ میں نہیں سما سکتیں، وہ اس سے کئی درجہ بلند وبرتر ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خدا کی اس مہمان سرا میں ان کی اعلیٰ ترین طریقہ پر پذیرائی کی جائے گی، جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے کہ انھیں کہا جائے گا "کھاؤ اور مزے لے لے کر پیو، یہ سب کچھ ان اعمال کے مقابلہ میں ہے جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے (کلوا واشربوا ھنیئًا بما کنتم تعملون)۔

یہ جملہ چاہے براہ راست خدا کی طرف سے ان کو خطاب کرنے کے عنوان سے ہو، یا فرشتوں کے ذریعہ سے، ایک اپنے واضح لطف و محبت سے توأم ہے، جو ان کی روح اور جان کی ایک غذا ہے۔

" بما کنتم تعملون " (ان اعمال کے مقابلہ میں جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نعمتیں کسی کو بغیر کسی حساب و کتاب کے نہیں دیتے، اور یہ صرف دعوے، خیال اور تصور سے حاصل نہیں ہوتیں، یہ تو صرف اعمال صالح کے ذریعہ ہی ملتی ہیں۔

" ھنیئا " (بروزن ملیح) "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق ہر وہ چیز ہے جس کے لیے مشقت نہ کرنی پڑے، اور اس سے کوئی تکلیف اور پریشانی پیدا نہ ہو، اسی لیے گوارا اور خوش مزہ غذا اور پانی کو " ھنی " کہا جاتا ہے، اور بعض اوقات خوشگوار زندگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کے پھل، کھاتے اور مشروبات دنیا کے کھانے پانی کی طرح نہیں ہیں، جو بعض اوقات انسان کے بدن میں بُرے آثار چھوڑ دیتے ہیں، یا ان سے غیر مطلوب عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔

مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کھانے اور پینے کا حکم کیا ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اباحت کو بیان کرتا ہے یا واقعاً امر و فرمان و حکم ہے؟

لیکن اس بات پر توجہ کرنا چاہیے کہ اس قسم کے اوامر، جو پذیرائی کے موقع پر دیئے جاتے ہیں، کہنے والے کی ایک قسم کی طلب و خواہش ہوتی ہے، جیسے مہمان کی عظمت و احترام کے لیے بیان کیا جاتا ہے اور میزبان یہ چاہتا ہے کہ مہمان زیادہ سے زیادہ کھائے، تاکہ اس کا زیادہ احترام و اکرام ہو۔

بعد والی آیت میں دوبارہ اسی مطلب پر تکیہ کرتا ہے کہ یہ نعمتیں کسی حساب و کتاب کے بغیر نہیں ملتیں، لہٰذا مزید کہتا ہے: " یقیناً ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے جزا دیتے ہیں " (انّا کذالک نجزی المحسنین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں " تقویٰ " کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں " عمل " پر اور اس آیت میں احسان و نیکوکاری پر۔

" تقویٰ " گناہ و فساد و شرک و کفر سے ہر قسم کا پرہیز، اور " احسان " ہر اچھے کام کو انجام دیتا ہے اور " عمل " بھی اعمالِ صالح کے بیان کے لیے ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ خدا کی نعمتوں کا پروگرام صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کہ ایمان کے جھوٹے دعویداروں کے ساتھ، اور ہر قسم کے فساد سے آلودہ افراد کے ساتھ۔ اگرچہ وہ ظاہراً اہلِ ایمان کی سلک میں داخل ہیں۔

آخر میں پھر تکرار کرتا ہے: " وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے " (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وائے ہے ان کے لیے جو ان تمام نعمتوں اور محبتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس محرومیت کی حسرت کا دُکھ، دوزخ کی جلانے

والی آگ سے کم نہیں ہوگا ۔

اور چونکہ معاد کے انکار کا ایک عامل، دنیا کی جلدی گزر جانے والی لذات، اور ان لذتوں سے فائدہ اٹھانے کی بے قید و بند آزادی کی طرف میلان ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں روئے سخن مجرمین کی طرف کرتے ہوئے تہدید آمیز لب و لہجہ میں فرماتا ہے: "ان مختصر سے چند دنوں میں کھالو اور فائدہ اٹھالو، لیکن یہ جان لو کہ خدا کا عذاب تمھارے انتظار میں ہے، کیونکہ تم مجرم اور گنہ گار ہو" (کلوا و تمتعوا قلیلًا انکم مجرمون)۔

"قلیلًا" کی تعبیر ممکن ہے کہ دنیا میں انسان کی عمر کی مختصر مدت کی طرف اشارہ ہے، اور اس جہان کی نعمتوں کے آخرت کی بے حساب نعمتوں کے مقابلہ میں ناچیز ہونے کی طرف بھی ۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب آخرت میں مجرمین سے کہا جائے گا، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آخرت میں مجرموں کے لیے، زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی، کسی قسم کا تصور نہیں ہے، لہٰذا اس بات کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ گفتگو دنیا میں ان سے خطاب ہے ۔

حقیقت میں "متقین" اور پرہیزگار لوگوں کی آخرت میں انتہائی احترام کے ساتھ پذیرائی ہوگی اور "کلوا واشربوا هنيئًا" کے پرلطف جملہ کے ساتھ ان سے خطاب ہوگا، لیکن دنیا پرست اسی دنیا میں "کلوا و تمتعوا قلیلًا" کے تہدید آمیز جملہ کے ساتھ مخاطب ہوتے ہیں ۔

پرہیزگاروں سے فرماتا ہے: بما کنتم تعملون: (یہ سب کچھ ان اعمالِ صالحہ کے مقابلے میں ہے جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے)
اور ان سے بھی کہتا ہے: انکم مجرمون "یہ تہدید اس بناء پر ہے کہ تم مجرم ہو"[1]

اور بہرحال یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ عذابِ الٰہی کا سرچشمہ انسان کا جرم و گناہ ہی ہے، جو بے ایمانی یا شہوتوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے پیدا ہوتا ہے ۔

اس کے بعد اس تہدید کی ایک مرتبہ پھر "وائے ہو اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔ کے جملہ سے تکمیل کرتا ہے ۔

وہی لوگ جو دنیا کے زرق و برق اور اس کی لذتوں اور شہوتوں پر فریفتہ ہو گئے، اور انھوں نے عذابِ الٰہی کو اپنے لیے خرید لیا۔

بعد والی آیت میں ان کے انحراف، بدبختی اور آلودگی کے ایک اور عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بادۂ غرور سے

---

[1] حقیقت میں اس آیت میں کچھ محذوف ہے، اور مجمع البیان کے قول کے مطابق تقدیر میں اس طرح ہے: کلوا و تمتعوا قلیلًا فان الموت کائن لا محالة؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ تقدیر میں یوں ہو: کلوا و تمتعوا قلیلًا وانتظروا العذاب فانکم مجرمون

ایسے سرمست ہیں، کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ پروردگار کے سامنے رکوع کرو، تو وہ رکوع نہیں کرتے" (و اذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون)۔

بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت قبیلہ "ثقیف" کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن سے پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ "تم نماز پڑھا کرو" اس پر انھوں نے یہ کہا تھا: ہم ہرگز کسی کے سامنے خم نہیں ہوں گے، اور یہ ہمارے لیے عیب ہے، تو پیغمبرؐ نے فرمایا:

لا خیر فی دین لیس فیہ رکوع و لا سجود

"وہ دین جس میں رکوع و سجود نہ ہو کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا"[1]

وہ نہ صرف رکوع اور سجدے کا انکار کرتے تھے، بلکہ یہ روحِ غرور و نخوت ان کے تمام افکار اور زندگی میں نمایاں تھی۔ نہ تو وہ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے، اور نہ ہی پیغمبرؐ کے احکام مانتے تھے۔ نہ لوگوں کے حقوق کا رسمی طور پر اقرار کرتے تھے، نہ خالق کے سامنے تواضع تھی۔ اور نہ ہی مخلوق کے سامنے فروتنی و انکسار، حقیقت میں یہ دونوں عامل (غرور و شہوت پرستی) جرم و گناہ اور کفر و ظلم و طغیان کے اہم ترین عوامل میں سے ہیں۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے یہ ارکعوا (رکوع کرو) کا خطاب انھیں قیامت کے دن ہوگا، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے خصوصاً قبل و بعد کی آیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔

اور اس کے بعد دسویں اور آخری بار اس سورہ میں فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

اور آخری زیرِ بحث آیت میں، جو سورۂ "مرسلات" کی آخری آیت ہے، ایک عتاب آمیز لب و لہجہ کے ساتھ جو سرزنش سے پُر ہے ایک تعجب آمیز استفہام کی صورت میں فرماتا ہے: "اگر وہ اس قرآن کے ساتھ، جس کی صداقت کے دلائل، اس کی تمام آیات سے نمایاں ہیں، اور اس کی حقانیت اس کی تمام تعبیروں میں منعکس ہے، ایمان نہیں لاتے، تو پھر اس کے بعد اور کس بات پر ایمان لائیں گے"؟ (فبای حدیث بعدہ یؤمنون)۔

جو شخص اس قرآن پر ایمان نہ لائے، جو اگر پہاڑوں پر نازل ہو جاتا، تو وہ لرزنے لگتے اور خشوع کرتے ہوئے پھٹ جاتے، تو وہ کسی آسمانی کتاب اور کسی عقلی دلیل کو تسلیم نہیں کرے گا، اور یہ روحِ عناد اور ہٹ دھرمی کی نشانی ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰، ص ۴۱۹، اور اسی معنی کو "آلوسی" نے "روح المعانی" میں اور "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں، اور "زمخشری" نے "کشاف" میں، اور "روح البیان" نے زیرِ بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

ایک نکتہ

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں اشارہ کیا تھا کہ اس میں " ویل یومئذ للمکذبین " کے جملہ کا دس مرتبہ تکرار ہوا ہے اور یہ ایک اہم اور ہلا دینے والی واقعیت پر تاکید کے لیے ہے، اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اس کے مشابہ جملے کثرت سے ملتے ہیں، جن کے بعض حصوں کی، جن پر خاص عنایت اور تاکید مطلوب ہوتی ہے، شعر و نثر میں تکرار کرتے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ان دس آیات میں سے، ہر ایک کسی نئے نکتہ کی طرف اشارہ ہے، جو اپنے سے قبل کے مطالب کی تکذیب سے مربوط ہے، اس بناء پر کوئی تکرار نہیں ہوئی ہے۔

ہم اس سورہ کو تفسیر " روح البیان " کے ایک جملہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے: یہ سورہ پیغمبر پر، مسجد " خیف " کے نزدیک ایک نماز میں، سرزمین " منی " میں نازل ہوا، اور میں نے خود اس غار کی زیارت کی ہے۔

خداوندا! ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم ہرگز تیری آیات کی تکذیب سے آلودہ نہ ہوں۔

پروردگارا! ہمیں غرور و نخوت اور ہوا و ہوس سے، جو جرائم کے اصلی سرچشمے ہیں، محفوظ رکھ!

بارِ الٰہا! جس دن پرہیزگاروں کی تیرے جوارِ قرب میں پورے احترام کے ساتھ پذیرائی ہو رہی ہوگی، ہمیں ان کی صف میں قرار دینا۔

آمین یا رب العالمین

۱۱، ربیع الثانی ۱۴۰۷

۲۲ ـــــ ۹ ـــــ ۱۳۶۵

تفسیر نمونہ جلد ۲۵ کا اختتام

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِشاریہ

تفسیر نمونہ

: اُردو ترجمہ :

جلد : ۲۵

: ترتیب و تدوین :

سیّد شکیل حُسین مُوسوی

اصول وعقائد	علماء ودانشور
احکام	کتبِ آسمانی
اخلاقیات	کتبِ تاریخ وتفسیروسیرۃ
اقوامِ گذشتہ	لغاتِ قرآن
شخصیات	متفرق موضوعات

اصُول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

اللہ ۲۹، ۶۵، ۸۳، ۹۹، ۱۰۶
۱۲۰، ۱۴۷، ۱۶۷، ۱۷۹
۲۲۷، ۲۶۹، ۲۷۶، ۳۰۳
۳۱۳
حکیم ۳۰۳
رب ۵۳، ۶۹، ۷۴، ۷۹
۸۳، ۹۹، ۱۱۰، ۱۲۰
۱۵۴، ۱۶۰، ۱۶۷، ۱۷۹
۲۰۱، ۲۰۴، ۲۳۶، ۲۵۰
۲۹۹، ۳۰۳
رحمٰن ۲۹، ۶۵، ۹۹، ۱۴۷
۱۷۹، ۲۲۷، ۲۶۹، ۳۱۳
رحیم ۲۹، ۶۵، ۹۹، ۱۴۷، ۱۶۷
۱۷۹، ۲۲۷، ۲۶۹، ۳۱۳
علیم ۳۰۳
غفار ۷۴
غفور ۱۶۷

توحید

.. ہم نے انھیں اس چیز (نطفہ) سے پیدا کیا جس کا انھیں خود علم ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم! ہم اس بات پر قادر ہیں۔ ۵۳
.. تم خدا کی عبادت کرو اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو ۶۵
.. خدا نے تمھیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا، زمین کو بچھا ہوا فرش بنایا، سات آسمانوں کو خلق کیا، چاند اور سورج سے آراستہ کیا۔ ۷۹
.. ہم کسی کو خدا کا شریک قرار نہیں دیتے۔ اس کا مقام بلند ہے وہ بیوی بچے نہیں رکھتا۔ ۱۰۰
.. میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں، کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔ ۱۲۰، ۱۲۱
.. غیب کا علم اسی کو ہے۔ ۱۲۶
.. اللہ ہی عالم الغیب ہے، وہ کسی کو بھی اپنے غیب کے اسرار پر آگاہ نہیں کرتا۔ رب کا ذکر کیے جاؤ، اسی سے دل لگاؤ، وہ مشرق و مغرب کا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسے نگہبان و کارساز مانو۔ ۱۵۴
.. اے رسولؐ ان کی جزاء سزا مجھ پر چھوڑ دو۔ انھیں مہلت دے دو۔ ہمارے پاس غل و زنجیر ہے، گلوگیر غذا اور دردناک عذاب ہے۔ اللہ کے پاس اس کا بہتر بدلہ ہے ۱۶۱
.. اپنے پروردگار کو بڑا سمجھ اس کی بزرگی بیان کر۔ ۱۷۹ و ۱۸۱، ۱۸۲
.. ہم نے انسان کو سڑے ہوئے نطفہ سے

پیدا کیا۔ اُسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا کہ اس کی آزمائش کریں۔ اب وہ شکر گزار بنے یا کافر۔ کافروں کے لیے طوق زنجیر اور شعلے تیار کیے ہیں۔ ۲۶۹

نبوّت

.. اے رسولؐ انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے تاکہ باطل میں ڈوبے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں۔ ۵۰

.. انسانوں کی طرف سے قرآن اور نبوت کا انکار۔ ۱۰۷

.. میں اپنے پروردگار کی رسالتیں تمھیں پہنچاتا ہوں۔ ۱۲۳

.. میں نہیں جانتا جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا بعید۔ غیب کا علم اسی کو ہے یا ان رسولوں کو جنھیں اس نے منتخب کر لیا ہے، ان کے آگے پیچھے نگران مقرر کر دیتا ہے۔ ۱۲۶

.. رات کو تھوڑے حصّے کے سوا قیام کر۔ آدھی رات یا اس سے کم یا کچھ زیادہ۔ قرآن ترتیل سے پڑھ۔ ہم عنقریب تجھ پر ایک سنگین و ثقیل بات کا اضافہ کریں گے۔ ۱۴۷

.. یقیناً ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔ پس تبلیغ اور اجراء میں صبر سے کام لو۔ کسی گنہ گار و کافر کی اطاعت نہ کرو۔ صبح و شام اپنے رب کو یاد کرو۔ رات کے زیادہ حصّے میں تسبیح کرو۔ ۲۹۹ تا ۳۰۲

عدل

.. عدالتِ وجدان اور قیامتِ صُغریٰ ۲۳۳

قیامت (معاد)

.. آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند۔ پہاڑوں کا بکھرنا۔ کسی دوست کا خبر گیری نہ کرنا۔ گنہگار اس دن کے عذاب کے بدلے اہلِ قبیلہ، بیوی بچوں، دوستوں غرض سب کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گا۔ ۳۸ تا ۴۲

.. تم معاد اور قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو اپنی پیدائش کی تحقیق کرو۔ ۵۵

.. یہاں تک کہ یوم موعود سے ملاقات کریں گے۔ یہ وہی دن ہے جس کا تمھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ ۵۷ تا ۵۹

.. اس کے بعد وہ تمھیں اسی مٹی کی طرف دوبارہ پلٹا دے گا۔ ۷۹ تا ۸۱

.. ان لن یبعث اللہ کا جملہ بعض کے نزدیک معاد کا انکار ہے۔ ۱۰۷

.. اس دن زمین اور پہاڑ شدت سے لرزیں گے۔ آسمان پھٹ پڑے گا اور وعدہ پورا ہو گا۔ ۱۶۱

.. جب صور پھونکا جائے گا تو وہ

ایک سخت دن ہو گا۔ ۱۸۵
.. معاد کا انکار اس لیے ہے کہ ساری زندگی گناہ، ہوس رانی اور ظلم و بیداد گری میں بسر کرے، اسی لیے پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی۔ ۲۳۱، ۲۳۲
.. عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغرا ۲۳۳
.. قیامت کے مختلف نام۔ یوم الحسرۃ یوم الندامۃ و یوم الواقعہ وغیرہ۔ ۲۳۴، ۲۳۵
.. چاند بے نور ہو جائے سورج چاند اکٹھے ہو جائیں، بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ پناہ پروردگار کی طرف ہے۔ انسان آگاہ کیا جائے گا بلکہ وہ خود آگاہ ہے محض بہانے تراشتا ہے۔ ۲۳۶ تا ۲۴۱
.. مظاہر قدرت دیکھنے کے بعد بھی قیامت میں شک رکھتے ہو۔ ۳۲۲ تا ۳۲۷

جنّت

.. اہلِ جنّت کے خصائل ۴۹ تا ۵۲
.. یہ لوگ کس طرح توقع رکھتے ہیں کہ جنت کے باغوں میں قدم رکھیں گے ۵۵
.. بہشت کی عظیم جزائیں صبر کے صلہ میں ریشمی لباس۔ تکیہ لگائے تخت پر بیٹھنا، نہ دھوپ ستائے گی نہ سخت سردی، درختوں سے پھل توڑنا آسان ہو گا۔ بہترین برتنوں میں بہترین کھانے، زنجبیل ملی شراب پینے کو، بکھرے موتیوں جیسے خدمت گار، یہ جزا ہے قدردانی ہے۔ ۲۹۰ تا ۲۹۸

جہنّم

.. ہم عنقریب اُسے جہنم میں داخل کریں گے، نارِ جہنم کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیتی۔ ۱۹۷ تا ۱۹۹
.. دوزخ کی خلقت کا مقصد انتقام جوئی نہیں ہے، انسانوں کو ڈرانے کا ذریعہ ہے۔ ۲۰۷

فرشتے

.. فرشتے اور روح اس (پچاس ہزار سال والے) دن اس کی طرف عروج کریں گے۔ ۳۵

❖ ❖ ❖

احکام

نماز

.. نماز پر مداومت کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ہی حالتِ نماز میں رہیں بلکہ معین اوقات میں انجام دیں۔ ۴۶
.. وہ پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ ۴۹
.. نماز تربیت کا عالی مکتب اور تہذیبِ نفوس و معاشرہ کی پاکبازی کا اہم وسیلہ ہے۔ ۵۲

تم خدا کی عبادت کرو اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ ۶۵
.. اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو وہ بہت بخشنے والا ہے۔ ۷۴
.. نماز قائم کرو۔ (اقیموا الصلوٰۃ) ۱۶۷
.. وہ ہرگز ایمان نہیں لایا اور نہ اس نے نماز پڑھی۔ ۲۵۵

زکوٰۃ

.. اٰتوا الزکوٰۃ زکوٰۃ ادا کرو ۱۶۷

اِنفاقِ مال

.. جسے خدا مال و ثروت عطا فرماتا ہے وہ اس میں سے ایک، دو تین ہزار سے صلہ رحمی کرتا ہے۔ ۴۷
.. اللہ کو قرض حسنہ دو، جو کارِ خیر تم آگے بھیجتے ہو اللہ کے پاس اس کا بہتر اجر ہے۔ ۱۶۷

* * *

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

.. مصلّین، حقداروں کو اموال دینے والے سائل، محروم کی خبر گیری کرنے اور روزِ جزاء پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ ۲۵ تا ۴۷
اپنے دامن کو بے عفتی سے بچانا صرف بیویوں، کنیزوں سے تمتع کرنا۔ عہد و امانت کو ادا کرنا اور پابندی سے نماز پڑھنا اہلِ جنت کے خصائل ہیں۔ ۴۹ تا ۵۲

اخلاقِ سیّئہ (رذیلہ)

.. حارث بن نعمان یا جابر بن نذر یا نعمان بن حارث فہری کا عذاب طلب کرنا اور معذب ہونا۔ ۲۹، ۳۰
.. بعض انسان ہلوع (حریص) جزوع اور منوع ہیں۔ یہ صفات نکبت بدبختی اور شر و فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔ ۴۴، ۴۵
.. اس نے (قرآن سے مبارزہ کے لیے) سوچا اور منصوبہ بنا لیا۔ وہ مرے، اس نے کیا بُرا منصوبہ بنایا۔ پھر اس پر نظرِ ثانی کی منہ چڑایا اور کہا یہ جادو اور قولِ بشر ہے۔ ۱۹۳ تا ۱۹۶
.. نہ وہ ایمان لایا نہ نماز پڑھی۔ بلکہ اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ متکبرانہ چال سے اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ گیا۔ عذابِ الٰہی اس کے لیے شائستہ ہے۔ ۴۵۵

* * *

اقوامِ گزشتہ

قومِ نوح

- اے قوم میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔ خدا کی عبادت کرو تاکہ تمھارے گناہ بخشے جائیں۔ ۶۵
- جناب نوحؑ کا قوم کو ہدایت کرنا۔ قوم کا استکبار و انکارِ حق سے فرار کے سوا اس قوم نے کوئی اثر نہ لیا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، چہرے ڈھانپ لیے۔ ۶۹ تا ۷۲
- انھوں نے کہا ۔ ود، سواع، یغوث یعوق اور نسر کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ ۸۳ ، ۸۵
- وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہو گئے اور جہنم میں پہنچے۔ ۸۶

❖ ❖ ❖

شخصیات

ابن ابی کبشہ

۱ : رسولِ پاک کے مادری اجداد میں کوئی شخص تھا۔
۲ : قریشِ مکہ کی طرف سے بطورِ تحقیر و استہزاء رسولؐ پاک کا لقب ۱۱۹

ابو الاسد جمحی

ایک دولت مند مغرور قریشی ۱۱۹ ، ۱۲۰

ابوجہل

قرآن نے اسے بھی کفور کہا ہے۔ ۳۰۰

ابوسعید خدریؓ

اس صحابی نے رسولِ پاکؐ سے من عندہ علم من الکتاب کے معنی پوچھے۔ ۱۳۶

ابوطالبؑ

آپ کی وفات کے بعد رسولِ پاکؐ پر بہت سخت وقت آیا۔ ۱۰۰

اصبغ بن نباتہ

حضرت علیؑ نے اصبغ کو امام حسینؑ کے بارے میں خبر دی۔ ۱۳۱

امراء القیس

عرب کا ایک شاعر جس نے ابتداءِ کلام 'لا' زائدہ استعمال کیا ہے نمونہ کے اشعار ۲۲۸

انس بن مالک

سورۂ بقرہ کو یاد کر لینے والا شخص ہماری نظر میں بزرگ تھا۔ ۱۰۳

❖ ❖ ❖

جعفرؑ بن محمدؑ امام صادق

.. جسے خدا مال وثروت دیتا ہے وہ اس میں سے ایک، دو تین ہزار علیٰحدہ کر کے اِس سے صلہ رحمی کرتا ہے اور اس طرح اپنی قوم سے مشقت اور بوجھ اُٹھالیتا ہے۔ ۴۷

.. محروم وہ شخص ہے جو کسب وکار میں تکلیف اٹھاتا ہے لیکن اس کی زندگی پیچیدہ ہو گئی ہے۔ ۴۷

.. جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ سورۂ نوحؑ کی تلاوت ترک نہ کرے۔ اگر واجب یا مستحب نمازوں میں پڑھے گا تو خدا جنت میں باغ اور نیکوں کی ہم نشینی عطا کرے گا۔ ۶۴

.. خدائی موت کی نسبت گناہوں کے باعث مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ نیکوکاروں کی طویل عمری طبعی طولِ عمر والوں کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ ۶۸

.. حالاتِ نوحؑ میں بیت سے مراد ولایت ہے۔ جو شخص ولایت میں داخل ہوا، انبیاء کے گھر میں داخل ہوا۔ ۹۳

.. جو شخص سورۂ جنّ کی تلاوت کرے جن وشیاطین کے شر سے محفوظ رہے گا۔ ۹۸

.. جب امام کسی علم کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اُسے اس کی تعلیم دے دیتا ہے۔ ۱۳۴

.. مجلس میں آکر فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ میری کنیز کہاں چھپ گئی۔ ۱۳۵

.. جو سورۂ مزمّل کو نمازِ عشا میں یا آخرِ شب پڑھے تو یہ سورہ اور رات دن اس کے گواہ ہوں گے۔ خدا اُسے پاکیزہ زندگی اور موت دے گا۔ ۱۴۵

.. آیات میں جنّت کے ذکر پر رک کر اُسے اللہ سے طلب کرو اور جہنم کے ذکر میں خدا سے پناہ مانگو۔ ۱۵۱

.. تین چیزوں میں خدا کی مخصوص عنایت ہے۔ نماز تہجد پڑھنا۔ روزہ افطار کرانا۔ مومنوں کی ملاقات کو جانا۔ نمازِ تہجد گناہوں کو ختم کر دیتی ہے۔ ۱۵۳

.. جو شخص سورۂ قیامت کو پابندی سے پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا یہ سورہ بہترین شکل میں اس کے ساتھ قبر سے اُٹھے گی اور اپنے قاری کو جنت کی بشارت دے گی۔ ۲۲۶

.. مومن کی موت خوشبوءِ عطر اور کافر کی موت سانپ بچھو کے ڈسنے کی مانند ہے۔ ۲۵۳

.. موت کی یاد، سرکش شہوتوں کو مار دیتی ہے، غفلت دور کرتی اور

خدائی وعدوں سے قوت پہنچاتی ہے۔ ۲۵۴
.. جو کسی مومن کو کھانا کھلائے کہ وہ سیر ہو جائے تو اس کا ثواب اللہ کے سوا نہ کوئی فرشتہ جانتا ہے نہ کوئی نبی مرسل۔ اسی ذیل میں ایک اور حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔ ۲۸۷

جعفر طیّار

رسولِ پاکؐ نے جنگ موتہ میں جعفر
.. طیّار کی شہادت کی خبر دی ۱۳۱

حاطب بن ابی بلتعہ

.. جس نے مسلمانوں کا راز (عزم مکہ) مشرکین کو لکھ بھیجا۔ ۱۳۰

سارہ

.. وہ عورت جو حاطب کا خط مشرکین مکہ کے نام لے جا رہی تھی۔ ۱۳۰

عبداللہ بن عباسؓ

.. یہ پانچوں (ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر) بُت طوفانِ نوح میں دفن ہو گئے۔ ۸۵
.. رسولِ پاکؐ نماز صبح میں مشغول تھے۔ جنّوں کے ایک گروہ نے تلاوتِ قرآن سُن کر ایمان و اسلام قبول کیا۔ ۱۰۰
.. جبرئیل کا قرآن سنانا، رسول پاکؐ کا الفاظ کو جلدی دہرانا، خدا کا منع فرمانا کہ قرآن ہم جمع کر رہے ہیں جلدی نہ کرو۔ (بیان کیا)۔ ۲۲۳
.. اہلِ جنّت کی کیفیت پر رسولِ پاکؐ کی حدیث۔ ۲۹۲

عبداللہ بن مسعودؓ

.. قومِ جنّ کا رسولِ پاکؐ پر ایمان لانا بیان کرتے ہیں۔ ۱۰۱
.. اقتصادی جہاد پر آپ کا ایک قول بلیغ ۱۷۳

عتبہ بن ربیعہ

.. قرآن نے عتبہ (قریشِ مکہ) کو آثم کہا ہے۔ ۳۰۰

عداس

.. طائف کے باغوں کے مالک کا غلام جو رسولِ پاکؐ پر ایمان لایا۔ ۱۰۱

علیؑ ابن ابی طالبؑ

.. اے فرزندِ خدا سے اِس طرح ڈر کہ اس کے حضور دنیا بھر کی نیکیاں لے کر آئے گا تو شاید وہ قبول نہ کرے، اور پُر اُمید رہ کہ اہلِ زمین کے گناہ بھی رکھتا ہو تو بخش دے گا۔ ۴۸
.. زیادہ استغفار کرتا کہ تو روزی جلب کرے۔ ۷۷
.. خداوندِ سُبحان نے استغفار کو روزی

کی زیادتی اور رحمت قرار دیا۔ فرمایا خدا سے بخشش طلب کرو، وہ بخشنے والا ہے۔ آسمان سے پر برکت بارش برساتا ہے۔ ۷۸
.. اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے نہ گھبراؤ۔ (نہج البلاغۃ) ۱۲۵
.. یہ علمِ غیب نہیں ہے یہ ایسا علم ہے جو میں نے صاحبِ علم (پیغمبرؐ) سے حاصل کیا ہے۔ ۱۳۲
.. کچھ علمِ غیب خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کے علاوہ وہ علوم جو پیغمبرؐ کو دیے اور انھوں نے مجھے تعلیم فرمائے۔ ۱۳۳
.. برتن کے ٹوٹے ہوئے حصے اور دستہ والی طرف سے پانی نہ پیو، یہاں شیطان بیٹھا ہوتا ہے۔ ۱۳۹
.. ترتیل کے بارے میں فرمایا، اہم بات یہ ہے کہ مطالبِ آیات و معنی کو سمجھو۔ ۱۵۱
.. صبر و استقامت، ایمان میں اس طرح ہے جیسے بدن میں سر، عظمتِ خداوندی کے بارے میں جناب امیرؑ کے طویل کلام کا اردو ترجمہ ۲۰۵
.. ہمیں اور ہمارے شیعوں اور دوستوں کو بھی حقِ شفاعت حاصل ہے۔ ۲۱۵
.. قرآن شفاعت کرنے والا اور مقبول الشفاعۃ ہے۔ ۲۱۶
.. ہر گھر کا ایک دروازہ ہے، اور آخرت کا دروازہ موت ہے۔ ۲۵۳
.. انسان کی خلقت اور عطاءِ نعمات پر ایک طویل حدیث ۳۲۴، ۳۲۵

علی بن ربیعہ

.. ایک ہٹ دھرم قریشی ہمسایہ جو حضورؐ سے کہتا تھا کہ میں قیامت کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں تو بھی تصدیق نہ کروں گا۔ ۲۳۰

علیؑ بن موسیٰؑ رضاؑ

.. بس اتنا قرآن پڑھو جس میں خشوعِ قلب صفائے باطن اور روحانی و معنوی نشاط حاصل ہو۔ ۱۷۲

محمد بن عبداللہ رسولِ پاکؐ

.. اللہ کو مداومت کے ساتھ نیک عمل پسند ہیں خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔ ۴۶
.. کوئی شخص اپنے عمل کے باعث جنت میں نہ جائے گا، جب تک رحمتِ خدا شاملِ حال نہ ہو۔ ۴۸
.. جو سورۂ نوحؑ پڑھے گا ان میں شمار ہو گا جنھیں نوحؑ کی دعوت ڈھانپ لیتی ہے۔ ۶۴
.. جسے خدا نے کوئی نعمت بخشی وہ خدا کا شکر بجا لائے۔ روزی میں تاخیر ہو تو استغفار کرے۔ کسی حادثہ سے غمگین ہو تو لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم کہے۔ ۷۷

.. مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ ہوں۔ مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ جان اور اموال سے امان میں رہیں۔ ۱۱۳

.. تمام روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور ذریعۂ طہارت ہے۔ ۱۱۷

.. جبرئیل کا (ایک بدو عرب کی صورت میں) رسولؐ پاک سے مکالمہ ۱۲۷ ، ۱۲۸

.. فرمایا، وہ (آصفؑ) میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی تھا۔ جب سوال کیا من عندہ علم من الکتاب کون ہے فرمایا وہ میرا بھائی علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے۔ ۱۳۶

.. خدا نے جنوں کو پانچ اقسام میں پیدا کیا۔ ایک صنف فضا میں، ایک سانپوں، ایک بچھوؤں اور ایک حشرات الارض کی صورت میں اور ایک انسان کی مانند جس پر حساب وعقاب ہے۔ ۱۳۹

.. سورۂ مزمل تلاوت کرنے والے سے دنیا و آخرت کی سختیاں اٹھ جائیں گی۔ ۱۴۴

.. اسلام میں نہ رہبانیت ہے اور نہ ہی تبتل۔ ۱۵۷

.. صبر کے موضوع پر آپ کی ایک طویل حدیث۔ ۱۸۵

.. جنت کے بارے میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا۔ ۲۱۴

.. اس دن فرشتوں، انبیاء اور شہداء کو شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ روزِ قیامت پہلے انبیاء، پھر علماء، پھر اس کے بعد شہداء شفاعت کریں گے۔ شہید اپنے ستر ہزار رشتہ داروں کی سفارش کر سکیں گے۔ ۲۱۵

.. جو سورۂ قیامت کی تلاوت کرے گا، میں اور جبرئیل گواہ ہوں گے کہ یہ قیامت پر ایمان رکھتا تھا۔ ۲۲۵

.. خداوندا! اس برے ہمسایہ (علی بن ربیعہ) کے شر سے مجھے دور رکھ۔ ۲۳۰

.. لوگوں کے داخلۂ جنت کی کیفیت پر آپ کی حدیث۔ خدا کے شہودِ باطنی پر ایک حدیث (بذریعہ انسؓ) ۲۴۸

.. ایک ساعت کی فکرِ موت ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ۲۵۴

.. جو شخص مسلمانوں میں سے تین افراد کو کھانا کھلائے گا، اللہ جنت کے تین باغوں سے اُسے کھانا کھلائے گا۔ خدا کے نزدیک بہترین عمل پیاسوں کو ٹھنڈا پانی پلانا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا ہے۔ ۲۸۶ ، ۲۸۷

.. سورۂ مرسلات کا قاری مشرکین میں سے نہیں ہے۔ ۳۱۲

.. مجھے سورۂ ہود، واقعہ، مرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا کر دیا۔ ۳۱۲

* * *

محمدؑ بن علیؑ باقرؑ

.. اگر کوئی شخص نوافل میں سے کوئی چیز

اپنے اوپر فرض کرلے تو ہمیشہ اس کی مداومت کرتا رہے۔ ۴۶
.. امام کی ایک حدیث نوحؑ کے بارے میں۔ قرآن میں نوحؑ کو شکر گزار بندہ کہا گیا۔ ۹۲
.. ناشیہ سے مراد نمازِ تہجد کے لیے قیام کرنا ہے۔ ۱۵۵
.. ہم اور ہمارے شیعہ اصحابِ یمین ہیں۔ اہلِ بیت کے دشمن اپنے عمل میں رہن ہیں۔ ۲۱۱
.. دنیا آخرت کے ساتھ لپیٹ دی جائے گی۔ (التفت الدنیا بالاخرۃ) ۲۵۱، ۲۵۲
.. انسان علمِ خدا میں مذکور تھا۔ اگرچہ عالم خلق میں مذکور نہ تھا۔ ۲۷۰

کمیل بن زیاد

.. حجاج سے کہا کہ فرمان علیؑ کے مطابق تو میرا قاتل ہے ۱۳۱

مروان

.. تو بڑھاپے میں ضلالت و گمراہی کا پرچم اٹھائے گا۔ (فرمانِ رسولؐ) ۱۳۱

نوحؑ

.. ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ دردناک عذاب پہنچنے سے پہلے انھیں ڈراؤ۔ ۶۵
میں نے قوم کی ہدایت کے لیے ہر طرح کی کوشش کی مگر... ۶۹
.. میرے اللہ قوم نے میری نافرمانی کی۔ ان کی پیروی کی جن کے مال و اولاد نے خسارہ میں اضافہ کیا۔ ان گمراہ رہبروں نے مکرِ عظیم کیا۔ ۸۴
.. خدایا! کفار میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑ۔ اگر یہ باقی رہے تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ مجھے، میرے والدین اور میرے گھر میں داخل ہونے والوں کو بخش دے۔ ۸۸
.. نوحؑ کا پورا تعارف، تمام لقب، بیٹے حام، سام، یافث اور کنعان ۹۱، ۹۲

ولید بن مغیرہ

.. ولید کو قرآن نے کفور کہا ہے۔ ۳۰۰

ہجر بن قیس

.. تجھے میرے بعد لعنت کرنے پر مجبور کریں گے۔ (رسولِ پاکؐ) ۱۳۱

علماء و دانشور

آلوسی (مفسر روح المعانی) ۲۹۱
ابن ابی حاتم ۲۰۲
ابن مردویہ ۲۰۲
ابو اسحٰق ثعلبی ۳۰

ابوبکر نقاش موصلی ۳۰
ابوعبداللہ زنجانی ۲۶۶
ابوعبید ہروی حافظ ۳۰
احمد زاہد استاد ۲۶۶
ارسطو ۲۷۲
الکسی سوفورین (غیر مسلم مشہور طبیب) ۲۷۹
امینی (علامہ) ۳۰
بغوی (علامہ) ۲۶۶
بیہقی ۲۰۶، ۲۶۶
ثعلبی ۳۰
حاکم ابوالقاسم جسکانی ۲۶۶
راغب ۴۱، ۸۲، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۸۳، ۲۷۳
زمخشری (تفسیر کشاف) ۲۶۶
سیوطی ۲۶۶
شمس الدین شافعی ۳۰
طبرسی (مفسر مجمع البیان) ۱۵۰
طوسی شیخ (تبیان) ۲۱۰
عکرمہ ۲۶۶
فیض کاشانی (صاحب محجۃ البیضاء) ۲۳۴
القرطبی ۳۰
محمد بن ادریس شافعی ۲۶۹
محمد زرندی شیخ ۳۰
مومن شبلنجی ۳۰
واحدی ۲۶۶
واقدی (مورخ) ۸۵
ویل دورانت (مسیحی مورخ نے اہانہ زندگی سے پردہ اٹھایا ہے) ۵۰

کتبِ آسمانی

توراۃ

کے سفرِ تکوین میں حضرت نوحؑ کی زندگی کے بارے میں مختلف تفصیلی بحث آئی ہے۔ ۹۱

قرآن

سورۂ معارج کے مطالب

.. اصولِ دین، معاد، مشرکین کو عذابِ خدا سے ڈرانا۔ ۲۷

سورۂ معارج کی تلاوت کے فضائل

.. قاریٔ سورہ کو حافظین صلوٰۃ، امانات وعہود پیمان کا ثواب ملے گا۔ ۲۸

سورۂ معارج کی شانِ نزول

.. ولایتِ علیؑ کا اعلان۔ نعمان بن حارث فہری کا معذب ہونا۔ ۲۹

سورۂ نوحؑ کے مطالب

.. حضرت نوحؑ کی سرگذشت، توحید کی دعوت، تبلیغ کا طریق کار، حق و باطل کے مبارزہ پر مشتمل ہے۔ ۶۳

سورۂ نوح کی تلاوت کی فضیلت

.. جو اس سورہ کی تلاوت کرے ۔ اس کا شمار ان مومنین میں ہوگا جنھیں نوحؑ کی دعوت ڈھانپ لیتی ہے۔ ۶۴

سورۂ جن کے مضامین

.. ایک نہ دکھائی دینے والی مخلوق جن کا حضور پاکؐ پر ایمان لانے اور ان میں مومن و کافر جماعتوں کی موجودگی اور کچھ حصہ توحید و معاد پر مشتمل ہے۔ ۹۷

سورۂ جن کی تلاوت کی فضیلت

.. جو یہ سورہ تلاوت کرے اُسے جن قوم کی تعداد کے برابر غلام آزاد کرنے کا ثواب دیا جائے گا۔ ۹۷

سورۂ جن کی شانِ نزول (مختلف روایات) ۱۰۰

.. ہم نے عجیب قرآن سنا جو سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ (جن) ۹۹

سورۂ مزمل کے مضامین

.. یہ سورہ مکی ہے۔ اس میں نرمی کے ساتھ تبلیغِ رسالت کا حکم، اس کے پانچ حصے ہیں۔ ۱۴۳

سورۂ مزمل کی تلاوت کی فضیلت

.. اس سورہ کو تلاوت کرنے والے سے دنیا و آخرت کی سختیاں اُٹھ جائیں گی۔ (رسولؐ پاک) ۱۴۴
.. جتنا تمھارے لیے ممکن ہو اُتنا قرآن پڑھو۔ ۱۶۸
.. غور و فکر کے ساتھ تلاوتِ قرآن کہ معنی و مفہوم ذہن نشین ہو جائے۔ ۱۷۲

سورۂ مدثر کے مضامین

.. یہ پہلا سورہ ہے جو آشکارا دعوت کے بعد ہے۔ مبداء و معاد کی دعوت، شرک سے مبارزہ اور مخالفین کو عذابِ الٰہی سے انذار و تہدید۔ ۱۷۷

سورۂ مدثر کی تلاوت کی فضیلت

.. جو یہ سورہ پڑھے گا، اُسے مکہ میں پیغمبرؐ کی تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کی تعداد پر دس نیکیاں دی جائیں گی۔ ۱۷۹
.. اس نے قرآن سے مبارزہ کرنے کے لیے غور و فکر کے بعد ایک منصوبہ بنایا اور کہا کہ یہ قرآن جادو کی طرح پرکشش ہے۔ اور قولِ بشر ہے۔ ۱۹۳

سورۂ قیامت کے مضامین

- زیادہ تر قیامت، نیکوں اور بدکاروں کے مسائل پر گفتگو ہے۔ ۲۲۵

سورۂ قیامت کی تلاوت کے فضائل

- جو سورۂ قیامت تلاوت کرے گا میں اور جبرئیل اس کے گواہ ہوں گے کہ وہ قیامت پر ایمان رکھتا تھا۔ (رسول پاکؐ) ۲۲۵
- قرآن کو جلدی پڑھنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دے۔ اس کو جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ ۲۴۲

سورۂ انسان (دہر) کے مضامین

- پانچ حصے آفرینش، نیکوں کا اجر و ثواب، ثوابوں کا استحقاق، اہمیت قرآن، مشیت الٰہی کی حاکمیت، سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کی بحث۔ ۲۶۵

سورۂ انسان (دہر) کی تلاوت کی فضیلت

- اس سورہ کی تلاوت کی جزا خدا پر جنت اور اس کے ریشمی لباس (رسولؐ پاک)
- جو جمعرات کی صبح تلاوت کریگا، قیامت میں رسول پاکؐ کے ساتھ ہوگا۔ (باقرؑ) ۲۶۷
- یقیناً ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا۔ ۲۹۹

سورۂ مرسلات کے مضامین

مکی سورہ، منکرین و مکذبین کی تہدید و انذار ۳۱۱

سورۂ مرسلات کی تلاوت کی فضیلت

- جو سورۂ مرسلات کی تلاوت کرے، وہ مشرکین میں سے نہیں ہے۔ (رسول پاکؐ)
- جو سورۂ مرسلت کی تلاوت کرے گا۔ خدا اُسے پیغمبرؐ کا ہم نشین قرار دیگا۔ (صادقؑ) ۳۱۲

کُتبِ تاریخ و تفسیر و سیرۃ

احقاق الحق ۱۳۶، ۲۶۶، ۲۷۷
احتجاج طبرسی ۲۷۹
احکام زندان در اسلام ۲۸۳
اسباب النزول ۲۶۶
اصول کافی ۱۱۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۹، ۲۸۶
الاصابہ (ابن حجر) ۱۳۱
الغدیر ۲۷، ۳۰، ۳۴، ۲۷۷
المعجم المفہرس ۴۶
المنجد ۲۸۵
اولین دانشگاہ آخرین پیغمبر ۲۷۵
بحار الانوار ۷۳، ۹۲، ۱۲۳، ۱۵۲، ۲۱۵، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۷
بخاری ۱۰۰
تاریخ القرآن ۲۶۶
تذکرہ ابو اسحٰق ۳۰
تفسیر ابو الفتوح رازی ۸۱، ۸۵، ۱۲۱، ۱۷۳
" ابوبکر یحییٰ (القرطبی) ۳۰
" البیان فی غرایب القرآن ۸۹

تفسیر اعلام القرآن ۹۲
" الکشف والبیان ۳۰
" المیزان ۱۶۵، ۱۷۱، ۱۸۳، ۱۸۹، ۲۴۸، ۲۶۶
" برہان ۹۸، ۱۸۴، ۲۴۰، ۳۲۶
" تبیان ۲۱۰
" درمنثور ۱۴۳، ۲۶۶، ۲۷۸، ۲۹۱
" روح البیان ۱۱۳، ۲۱۰، ۳۰۴
" روح المعانی ۱۰۵، ۱۴۳، ۱۶۲، ۱۸۵
" " ۲۳۰، ۲۴۸
" " ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳
" سراج المنیر ۳۰
" شفاء الصدور ۳۰
" صافی ۲۳۰
" علی بن ابراہیم ۸۵، ۱۰۰، ۱۰۳، ۲۳۱
" غریب القرآن ۳۰
" فخر رازی ۷۱، ۸۱، ۸۹، ۱۵۷، ۱۸۳، ۱۸۹، ۱۹۰، ۳۰۶
" فی ظلال القرآن ۱۰۰، ۱۸۳، ۱۸۹
" تفسیر قرطبی ۸۵، ۱۰۳، ۱۷۳، ۱۸۷، ۱۹۰
" " " ۲۱۱، ۲۱۹، ۲۴۸، ۲۶۵، ۲۸۵
" کشاف ۱۹۰، ۲۶۶
" مجمع البیان ۲۸، ۳۰، ۳۶، ۶۴، ۷۱، ۸۵، ۸۶، ۹۷، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۸، ۱۸۲، ۱۸۹، ۲۰۰، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۲۶، ۲۴۱، ۲۴۴، ۲۴۸، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۸۵، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۷، ۳۰۱
تفسیر مراغی ۱۲۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۲۰۳
" " ۲۱۹، ۲۳۰
" نورالثقلین ۴۶، ۴۷، ۷۷، ۸۹
" " ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۱۷، ۱۳۴، ۱۴۳
" " ۱۴۴، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۷۰، ۱۸۴، ۲۱۱
" " ۲۴۷، ۲۵۲، ۲۸۱، ۳۳۳
خصال (صدوقؒ) ۲۱۵، ۲۷۹
در رالسمطین ۳۰
روزہ روش نوین برائے درمانِ بیماریہا۔ ۲۷۹
ریاض النضرہ ۱۳۱
سفینۃ البحار ۱۳۹
سنن ابن ماجہ ۲۱۵
سنن ابی داؤد ۲۱۵
سیرت ابنِ ہشام ۱۰۱
سیرت حلبی ۳۰
شرح جامع الصغیر سیوطی ۳۰
شرح نہج البلاغۃ ۲۵۳
طبقات ابن سعد ۱۳۱
فرائد السمطین ۳۰
فرہنگ قصص القرآن ۹۲
فضائل خمسہ ۱۳۱
کامل ابن اثیر ۱۳۱، ۲۸۴
لسان العرب ۲۱۰، ۲۸۵
مجمع جلد ۲ (ہیثمی) ۱۳۱
مجمع البحرین ۱۵۷

محجۃ البیضاء ۲۲۴ ، ۲۳۵
مستدرک صحیحین ۱۳۱
مسند احمد حنبل ۱۰۰ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶
مسلم ۱۰۰ ، ۲۱۴
معالم التنزیل ۲۶۶
مفاہیم القرآن ۲۱۶
مفردات (راغب) ۸۲ ، ۱۰۲ ، ۱۰۷ ، ۱۵۷ ، ۱۸۲ ، ۲۷۳ ، ۲۸۵ ، ۳۰۱ ، ۳۱۶
مناقب ابن شہر آشوب ۲۱۶
من لا یحضر (صدوق رہ) ۲۴۱
نور الابصار ۳۰
نہج البلاغۃ ۱۰۳ ، ۱۲۵ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۸۵ ، ۲۰۵ ، ۲۱۶ ، ۳۲۵
وسائل الشیعہ ۱۱۷

لُغاتِ قرآن

الف

ابرار : جمع بر (بروزن رب) کی، وسعت پھیلاؤ، زیر کے ساتھ نیکی ۲۸۰
اجداث : جدث (بروزن عبث) کی جمع بمعنی قبر ۵۸
ارائک : اریکہ کی جمع، حجلۂ عروسی کے پلنگ ۲۹۱
اساور : جمع اسورہ کی، دست بند، کنگن ۲۹۶
اصیل : دن کا آخری حصہ۔ شام ۳۰۱
اعتدنا : ہم نے تیار کر رکھا ہے ۲۷۳
اغلال : غل کی جمع۔ طوق جو گردن میں ڈالا جائے ۲۷۳
اقوم : مادہ قیام مضبوط و مستحکم قیام
اکواب : کوب کی جمع۔ بغیر دستہ والا پانی کا برتن۔ قدح ۲۹۳
امد : (بروزن صمد) زمانہ (ابتداء اور انتہاء کے زمانہ میں سے صرف) انتہاء کا زمانہ ۱۲۷
امشاج : مشج (بروزن سبب) کی جمع۔ ملی جلی چیز۔ آمیزہ ۲۷۱
انطلقوا : مادہ انطلاق۔ بلا توقف چلنا ۳۲۹
انکال : مادہ نکول 'نکل' کی جمع، بوجھل زنجیریں۔ ۱۶۲
آنیۃ : اناء کی جمع، ہر قسم کے برتن ۲۹۳

ب

باسرہ : مادہ بسر (بروزن نصر) ناپختہ چیز، بگڑے ہوئے چہرے۔ ۲۴۸
بخس : بروزن شخص۔ اشارہ ہے۔ ان کی نیکیوں میں کمی نہیں کی جائے گی ۱۱۲
بساط : مادہ بسط۔ پھیلی ہوئی چیز ۸۲
بسر : مادہ بسور 'کسی کام میں وقت سے پہلے تعجیل کرنا۔ منہ چڑانا۔ ۱۹۵
بشر : یہاں بشرہ کی جمع ہے، بدن کی ظاہری جلد ۱۹۸
بکرۃ : (بروزن نکتہ) دن کی ابتداء و آغاز ۳۰۱
بنان : انگلیاں۔ انگلیوں کے سرے پوریں۔ ۲۳۰

ت

تبار : ہلاکت، زیاں، خسارہ ۹۰
تبتل : مادہ بتل (بروزن قسم) انقطاع۔ اسی سے بتول لقب ہے ۱۵۷

تحرّو : مادہ تحری۔ کسی چیز کا قصد کرنا ۹۰
تحصوہ : مادہ احصاء ، شمار کرنا ۱۶۹
تراقی : ترقوہ کی جمع۔ حلق اور گلے کے گرد کی ہڈیاں۔ دم حلق میں اٹکنا۔ ۲۵۱
ترتیل : واضح طور پر بیان کرنا ۱۵۱
ترجون : مادہ رجاء۔ امید ، جو بعض اوقات خوف کے ساتھ ہو ۷۵
ترہقہم : مادہ رہق (بروزن شفق) جبری طور پر ڈھانپنا۔ ۵۸
تمنّی : ہمیشہ دوست رکھنا۔ ۴۱
تمنن : مادہ منّت ۔ احسان جتانا ۱۸۴
توءیہ : مادہ 'ایواء' ایک چیز کو دوسری چیز میں ضم کرنا۔ ۴۱

ج

جَدّ : عظمت ، شدت ، جدیت ، حصہ و نصیب، ریشہ ، جڑ ، قطع ۱۰۲
جمالۃ : جمل کی جمع ، اونٹ ۳۳۱

ح

حرس (بروزن قفس) حارس کی جمع ۔ نگہبان ۱۰۷
حُمُر : حمار کی جمع ۔ گدھے ۲۱۸
حمیم : گرم اور جلا دینے والا پانی ۴۰

د

دیّار : (بروزن سیّار) مادہ 'دار' وہ شخص جو گھر میں رہائش رکھتا ہو۔ ۸۹

ر

راق : مادہ 'رُقیٰ' رقیہ اوپر جانا، وہ دعائیں جو بیمار کے لیے موجب نجات ہیں۔ ۲۵۱
رجز : پلیدگی ، رجس ، شرک ، گناہ ۱۳۸
رصد : (بروزن حسد) انتظار میں آمادگی، گھات لگا کر بیٹھنا، نگرانی اور نگہبانی میں آمادگی۔ ۱۰۸ ، ۱۲۸
رواسی : راسیہ کی جمع ۔ ثبات قدمی ۳۲۶.
رہق : (بروزن شفق) قہر و غلبہ کے ذریعے کسی شے کو چھپانا۔ جیسے گناہ و طغیان انسان کے دل پر غلبہ پا کر اُسے چھپا لیتے ہیں۔ ۱۰۵
رہق : تکالیف شاقہ ۱۱۲
رہینہ : مادہ رہن گرو رکھنا۔ ۱۸۳

ز

زمہریر : مادہ 'زمہر' غصہ کے اثر سے آنکھ سُرخ ہونا، شدید سردی۔ ۲۹۱

س

سبح : (بروزن مدح) حرکت ، آمد و رفت ، تیرنا۔ ۱۵۶
سُدًی: (بروزن ہدًی) مہمل ، فضول ، بے مقصد ۲۵۸
سراع : سریع کی جمع ۔ وہ شخص یا چیز جو جلدی سے (تیز) چلے۔ ۵۸
سقر : مادہ 'سُقر' (بروزن فقر) دگرگوں ہونا، سورج کی گرمی سے پگھل جانا۔ ۱۹۷
سلسبیل : بہت ہی لذیذ مشروب ۲۹۴

ش

شامخات : شامخ کی جمع ، بلند ۳۲۶

شرر : شرارہ کی جمع آگ کے ذرات جو آگ سے اچھل کر نکلتے ہیں۔ ۳۳۱

شطط : (بروزنِ وسط) حدِ اعتدال سے خارج ہو کر دُور جا پڑنا۔ ۱۰۴

شوٰی : ہاتھ پاؤں اور اطرافِ بدن۔ یہاں بعض نے سر کی جلد بعض نے پنڈلی کا گوشت مُراد لیا ہے۔ ۴۱

ص

صحف : صحیفہ کی جمع ، ورق جو اُلٹا پلٹا جا سکے۔ ۲۱۹

صعد : بروزن سفر) صعود کرنا ، اوپر جانا۔ ۱۱۶

ط

طباقا : مطابقت ۸۰

ع

عبس : مادہ عبوس (بروزن جلوس) تیوری چڑھانا

عبوس : سخت دن ، بگڑا ہوا چہرہ ۲۸۵

عزین : عزہ (بروزن ہبہ) کی جمع۔ پراگندہ جماعت یا گروہ ۵۴

عشی : رات کا آغاز ۳۰۱

عہن : دھنکی ہوئی رنگین اون ۳۹

غ

غدق (بروزن شفق) فراواں پانی ۱۱۵

ف

فاجر : جو قبیح گناہ کا مُرتکب ہو۔ ۹۰

فاقرہ : مادہ فقرہ (بروزن ضربہ) ریڑھ کے ٹُھرے ، مراد ایسا حادثہ جو ریڑھ کی ہڈی کو توڑ ڈالے۔ ۲۴۹

فجاج : فج (بروزن حج) کی جمع ، دو پہاڑوں کا درمیانی درّہ ، راستہ ۸۲

فروج : فرج کی جمع : عضوِ تناسل کی طرف اشارہ ۵۰

فصیلہ : عشیرہ ، وہ قبیلہ یا خاندان جس سے آدمی جُدا ہوا ہو۔ ۴۱

ق

قاسط : مادہ قسط عادلانہ تقسیم ، عدالت اور کبھی ظلم ، راہِ حق سے انحراف ۱۱۲

قِدد : (بروزنِ پسر) قِدہ کی جمع ہے۔ کٹا ہوا علیحدہ ، الگ الگ۔ ۱۱۱

قدر : مادہ "تقدیر" غور و فکر کے بعد منصوبہ بنانا۔ ۱۹۴

قسورہ : مادہ قسر ، قہر و غلبہ ، شیر کا ایک نام بھی ہے۔ ۲۱۸

قطوف : چُنے ہوئے پھل یا پھل چننا ۲۹۲

قم اللیل : قیام کی تعبیر ، سونے کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کے معنی میں ہے ، نہ کہ پاؤں پر کھڑا ہونا۔ ۱۴۸

قمطریر : مادہ قمطر قطر معنی شدید ، عبوس ۲۸۵

قواریر : قارورہ کی جمع۔ شیشہ اور بلور کے برتن ۲۹۳

ک

کافور : خوشبو، جنت کے ایک چشمہ کا نام ۲۸۰
کبار : کبیر سے مبالغہ کا صیغہ ۸۴
کبر : کبریٰ کی جمع بزرگ، بڑی چیز ۲۰۷
کثیب : تہ بہ تہ پڑی ہوئی ریت ۱۶۳
کفات : بروزن کتاب۔ جمع کرنا۔ کسی ایک چیز کو دوسری میں ملانا ۳۲۵
کفار : کفر میں مبالغہ ہے۔ ۹۰

ل

لبد : (بروزن پدر) کسی چیز کا ایک دوسری پر تہ بہ تہ رکھنا ۱۱۸
لظیٰ : آگ کے خالص شعلے، جہنم کا ایک نام ۴۱
لمسا : مادہ لمس۔ مشہور معنی، یہاں طلب و جستجو سے کنایہ ہے۔ ۱۰۷
لواحہ : مادہ لوح۔ ظاہر و آشکار، تغیر دینا دگرگوں کرنا ۱۹۹
لوامہ : صیغۂ مبالغہ : بہت زیادہ ملامت کرنے والا۔ ۲۲۹

م

مدثر : کپڑا اوڑھنا مراد لباس نبوت جیسے لباس تقویٰ، یہاں مراد ایسا شخص جس نے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا ہو۔ ۱۸۱
مدرار : مادہ درر بروزن جر پستان مادر سے دودھ گرنا۔ مراد بارش ہونا۔ (صیغۂ مبالغہ ہے) ۷۵
مزمل : اصل متزمل مادہ تزمل۔ اپنے اوپر کپڑا لپیٹنا۔ رفیق، ساتھی ۱۴۸
مستطیر : وسیع، پھیلے ہوئے۔ ۲۸۲
معاذیر : معاذرت کی جمع۔ معذرت جو گناہ کو ختم کر دے۔ معذار کی جمع، پردہ پوش ۲۴۰
معارج : معرج کی جمع، سیڑھی، صعود کرنے کی جگہ ۳۲
ملتحدا : مادہ "لحد" (بروزن مہد) گڑھا جو کنارِ قبر میں کھودا جاتا ہے۔ مراد پناہ گاہ۔ ۱۲۱
مہطعین : مہطع کی جمع، کسی چیز کی جستجو میں گردن اٹھا کر تیزی سے چلنے والا آدمی ۵۴
مہل : (بروزن قفل) پگھلی ہوئی دھات : ۳۹
مہیل : مادہ ہیل (بروزن کیل) نہایت نرم ریت ۱۶۳

ن

ناشیہ : مادہ نشی۔ حادثہ، رات کی گھڑیاں عبادت۔ ۱۵۵
ناضرہ : مادہ نضرہ ایک خاص قسم کی خوشی ۲۴۶
ناقور : مادہ نقر۔ اس طرح دبانا کہ سوراخ ہو جائے۔ اسی سے منقار بنا۔ ۱۸۶
نبتلیہ : انسان کی تکلیف، ذمہ داری اور مسئولیت کی طرف اشارہ ۲۷۱
نراہ قریبا : اور ہم اسے قریب سمجھتے ہیں۔ ۳۷
نزاعۃ : پے در پے جدا کرنے والی شے۔ ۴۱

نصب : نصیب کی جمع۔ نصب کیا ہوا گاڑا ہوا، مثلاً بُت ۵۸

نضرہ : طراوت، فرحی، شادابی ۲۸۶

نفر : تین سے نو تک افراد کی تعداد کے لیے بولا جاتا ہے۔ ۱۰۱

نفس لوّامہ : اخلاقی وجدان جو انسان پر نیک عمل کے وقت خوشی کا اظہار اور بدعمل پر ملامت کرتا ہے۔ ۲۲۹

و

وبیل : مادہ وبل۔ شدید اور سنگین بارش ۱۶۴

وطئاً : قدم رکھنا، موافقت کرنا ۱۵۵

وقار : وزن، عظمت ۷۵

ہ

ہجرِ جمیل : شائستہ جدائی ۱۵۹

ہلوع : حریص، کم طاقت ۴۴

ہنئ : (بروزنِ ملیح) ایسی چیز جو بلا مشقت حاصل ہو۔ ۳۳۷

ی

یتمطّی : مادہ مطی پشت، بے اعتنائی، غرور تکان، بے حالی سے پشت کو کھینچنا۔ ۲۵۷

یحسب : مادہ حسبان، گمان ۲۳۰

یخوضوا : مادہ خوض (بروزن حوض) پانی میں چلنا۔ باطل میں غوطہ زن ہونا۔ ۵۷

یفتدی : مادہ فداء۔ فدیہ دے کر رہا ہونا ۴۱

یفجرون : مادہ تفجیر شگاف کرنا۔ فجر بمعنی پردۂ شب چاک ہونا۔ ۲۸۲

یوثر : مادہ اثر وہ روایت جو گزشتہ لوگوں سے نقل ہوئی ہو اور اس کا اثر باقی ہو ۱۹۶

یودّ : مادہ وُد (بروزن حُب) اپنے کام میں مشغول رہنا۔ ۴۱

یوفضون : مادہ اضافہ تیز چلنا ۵۸

متفرق موضوعات

ائمہ کے علمِ غیب کی ایک اور راہ

.. آصف بن برخیا کا جناب سلیمانؑ کے سامنے تختِ بلقیس پیش کرنا۔ ۱۲۵، ۱۳۷

ابرار کے لیے اجرِ عظیم

.. پینے کو بہت ہی معطر شراب۔ اس چشمۂ شراب کو جہاں چاہیں لے جائیں

اس دن کا خوف جس کا عذاب وسیع۔

خدا انھیں اس دن کے شر سے بچا لے گا۔ ۲۸۰، ۲۸۶

اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا۔

اس دعوت کے لیے کہا گیا جسے پہلے سے خود تیاری کیے بغیر انجام دینا ممکن نہیں۔ ۱۴۸

اُٹھیے، عالمین کو ڈرائیے۔

بہانہ تراشوں کا فضیلتِ علیؑ سے انکار

.. نعمان بن حارث فہری کے معذب ہونے کا انکار ۳۲ - ۳۳

بھوکوں کو کھانا کھلانا بہترین نیکی ہے۔

.. بھوکوں کو کھانا کھلانا خدا کی بارگاہ میں ایک خاص محبوبیت رکھتا ہے۔ ۲۸۶ - ۲۸۸

پروردگار کے لشکروں کی تعداد

.. اللہ کی قدرت کی وسعت اُسے لشکروں اور مددگاروں سے بے نیاز کرتی ہے لیکن اظہارِ عظمت اور مخلوق کے لیے تذکر و یاد دہانی کے طور پر وہ لشکروں والا ہے۔ ۲۰۴ ، ۲۰۵

پچاس ہزار سال کے برابر دن

.. فرشتے خدا کی طرف عروج کریں گے۔ یہ جسمانی عروج نہیں ہوگا۔ ۳۵ ، ۳۷

تبلیغ کے طریقے

.. گھروں میں جاکر۔ بازاروں، گلیوں اور عمومی مجالس میں پیار کے ساتھ ۷۲

ترتیل کے معنیٰ

.. واضح طور پر بیان کرنا۔ اس پر ائمہ کے ارشادات ۱۵۱

تقویٰ اور عمران و آبادی میں ربط

.. ایمان و عدالت معاشروں کی آبادی، کفر و ظلم بربادی کا باعث ہیں ۷۶

تلاش معاش، جہاد کی ہم ردیف

.. بھوکی اور دوسروں کی محتاج قوم عظمت و سربلندی ہرگز حاصل نہیں کرسکتی۔ اقتصادی جہاد، دشمن کے ساتھ جہاد کا ایک حصہ ہے۔ ۱۷۳

تلاوت قرآن اور عبادت و دُعا کے لیے رات کو اُٹھنا

.. اگرچہ خطاب رسولؐ سے ہے مگر مومنین بھی شب بیدار رہتے تھے۔ پنجگانہ نماز کی تشریع سے قبل واجب اور بعد میں منسوخ۔ (اختلافِ مفسرین) ۱۵۰

تم دوزخی کیوں ہو گئے؟

.. ہر شخص اعمال کے بدلے رہن ہے۔ دائیں ہاتھ والے جنت میں ہیں۔ مجرموں سے سوال جواب نماز پڑھی نہ کھانا کھلایا۔ اہلِ باطل کی ہم نشینی اور قیامت کا انکار (جہنم میں لے آیا) ۲۰۹ ، ۲۱۴

جتنا تمہارے لیے ممکن ہو اتنا قرآن پڑھو

.. آپؐ اور ایک مسلم جماعت دو تہائی

❖ ❖ ❖

.. آدھی یا ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں۔ اس نے بخش دیا ہے۔ جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو۔ پڑھا کرو۔ ۱۶۸

جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں ہے

.. ہر زمانے میں طاغوت اپنی جمعیت اور افرادی قوت پر فخر کرتے اور اتراتے نظر آتے ہیں۔ ۱۲۵

جن کی خلقت کے بارے میں تحقیق

.. آگ کے شعلہ سے پیدا کیا جبکہ انسان کو مٹی سے۔ سلیمان کے لیے جنوں کے کارنامے۔ ان کا وجود قرآن و احادیث سے ثابت ہے۔ ۱۳۷ تا ۱۴۰

جنین کا پُرغوغا عالم

.. انسانی نطفہ کی رحم میں منتقلی اور مختلف ادوار کی بحث ۲۷۳ - ۲۷۵

جنین کی تبدیلیاں بار بار کی رستاخیز

.. کیا انسان ابتداء میں نطفہ نہیں تھا۔ پھر اُسے علقہ بنایا، درست کیا۔ پھر اس سے مرد اور عورت کو پیدا کیا۔ ۲۶۰ ۲۶۱

چاند رات اور صبح کی قسم

.. ان قسموں سے عظمت خدا پر توجہ مقصود ہے ۲۰۷، ۲۰۸

حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے شیر سے گدھے

.. مجرم حق بات سے گریزاں ہیں۔ خوفزدہ گدھوں کی طرح بھاگتے ہیں۔ قرآن تذکرہ اور ہدایت ہے۔ مشیت خدا کے بغیر ہدایت و نصیحت نہیں ہے۔ ۲۱۷ - ۲۲۱

حقیقت سے فرار کیوں۔

.. یہ بات تعجب خیز نہیں کہ لوگوں کو حق بات سننا تک گوارا نہ تھا۔ منہ پھیر لینا کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا۔ ۷۳

خدائی رہبروں کی صداقت

.. شیطانی رہبروں کی طرح نہ لمبے چوڑے وعدے کرتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۲۴

خُدا کا لطف تجھ سے مدارات کرتا ہے

.. قوم نوحؑ کی کیفیت۔ خدا کا انکار، بُت پرستی ۸۴، ۸۷

خدا کے وعدے سچے ہیں وائے ہو جھٹلانے والوں پر۔

.. قسم ہے پے در پے فرشتوں (رسولوں) کی، جو بادلوں کو پھیلاتے اور منتشر کرتے ہیں۔ وعدۂ قیامت پورا ہوگا

ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائیں گے۔ اس دن جھٹلانے والوں پر وائے ہو۔ ۳۱۵ تا ۳۲۰

دوزخ کے ماموریں کی یہ تعداد کس لیے ہے

.. کفار نے مضحکہ کیا کہ انیس افراد ہی کیوں؟ اِس تعداد پر غلبہ پانا مشکل نہ ہوگا۔ یہود نے قرآنی بیان اپنی کتب سے ہم آہنگ پایا۔ مومنوں کا ایمان مستحکم ہوا۔ ۲۰۱ ، ۲۰۴

رات کی عبادت کا اثر

.. رات کے وقت عبادت و تلاوت زیادہ مضبوط اور پُر تاثیر ہے۔ ان لمحات میں دعا مناجات، طبیعت خاص آمادگی رکھتی ہے۔ قیامِ شب کے لیے ضرور تیار ہونا چاہیئے۔ ۱۵۴ ، ۱۵۹

روزِ جزا شفاعت کرنے والے

.. انبیاء، فرشتے، شہداء، قرآن، شفاعت کرنے والے ہیں۔ مومنین بھی شفاعت کریں گے۔ ۲۱۴ تا ۲۱۶

شائستہ انسانوں کے اوصاف

.. بے ایمان افراد اور سچے مومنوں کے اوصاف ۴۴ - ۴۸

❖ ❖ ❖

عالمُ الغیب خُدا ہے۔

.. میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) کا وعدہ تم سے کیا ہے وہ قریب ہے۔ یہ علم خدا کے پاس ہے۔ ۱۲۶ - ۱۲۹

عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغریٰ

.. نفسِ انسانی اور تین مراحل نفس امارہ، نفسِ لوّامہ (اخلاقی وجدان) نفسِ مطمئنہ ۲۳۲

عذابِ الٰہی کے چار مرحلے

.. طوق، زنجیر (انکال)، گلوگیر غذا، عذابِ الیم۔ ۱۶۵ ، ۱۶۶

علمِ غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق

.. علمِ غیب پر دو قسم کی آیات:
۱: علمِ غیب خدا کے ساتھ مخصوص ہے
۲: اولیاء خدا اجمالی طور پر علمِ غیب سے آگاہ ہیں۔ ۱۲۹ ، ۱۳۰

عمر کی کمی بیشی کے اسباب

.. عمر کے کم ہونے میں گناہوں کی تاثیر ہے۔ پرہیز گاری طولِ عمر کا سبب ہے۔ ۶۸

قرآن جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔

.. قرآن نازل کرنا، جمع کرنا اور اس کی

حفاظت کرنا۔ ہمارے ذمہ ہے۔ آپ
پریشان نہ ہوں۔ ۲۴۲ - ۲۴۴

قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے وجدان کی قسم

.. انسان قیامت کے بارے میں شک نہیں رکھتا بلکہ چاہتا ہے کہ گناہ کے لیے زندگی بھر آزاد رہے۔ ۲۲۷ - ۲۳۶

کس منہ سے جنت کی طمع

.. کفار جنت کے لالچ میں بڑی تیزی کے ساتھ آپ کے دائیں بائیں سے آتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ ۵۳ - ۵۶

کفار

.. کفار یوں ہی استہزاء کرتے رہیں گے۔ جب تک اس عذاب کو نہ دیکھ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۳

.. دنیا کی فانی زندگی سے پیار کرتے ہیں سخت و سنگین دن سے بے خبر ہیں ہم نے انھیں پیدا کیا۔ جب چاہیں ان کی جگہ دوسروں کو دے دیں۔ ۳۰۳ - ۳۰۵

.. ظالموں کے لیے دردناک عذاب فراہم کر رکھا ہے۔ ۳۰۷

.. قرآن پہ ایمان نہیں لاتے تو کس بات پر لائیں گے۔ ۳۳۹

لیلۃ المبیت

.. وہ رات جس میں علیؑ بسترِ رسول پر سوئے۔ نہ جانتے تھے کہ صبح تک شہید ہو جائیں گے یا زندہ رہیں گے۔ ۱۳۴

متقی لوگ جنت میں ہوں گے۔

.. جنت کے پھل حسب خواہش نیکوکاروں کی یہی جزا ہے۔ ۳۳۵، ۳۳۷

مجرموں کی موت کا دردناک منظر

.. جب تک جان حلق میں نہ آجائے ایمان نہ لائیں گے۔ یہ کہا جائے کہ کوئی ہے جو موت سے بچائے۔ دنیا سے فراق کا یقین پیدا کرے۔ جان کنی کی شدت۔ اس دن سب کا راستہ خدا کی طرف ہوگا۔ ۲۵۰، ۲۵۴

مساجد اللہ کے لیے ہیں

.. ان میں کسی کو خدا کے ساتھ نہ پکارو۔ ۱۱۶، ۱۱۹

میدانِ محشر میں کچھ چہرے بشاش اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے۔

.. زود گذر دنیا کو دوست رکھتے، اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔ قیامت میں کچھ چہرے ہنستے مسکراتے اور کچھ غمگین اور بگڑے ہوئے ہوں گے۔ انھیں

معلوم ہے کہ عذاب کمر توڑ کر رکھ دے گا۔ ۲۴۵ ، ۲۴۹

میں کسی کے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں

.. اگر حکمِ خدا کے خلاف کام کروں تو مجھے کہیں پناہ نہیں۔ ۱۲۱

نمازِ شب کی فضیلت

.. نماز و دعا رُوح کی صفائی، تہذیبِ نفوس، پاکیزگیٔ قلب اور تقویتِ ایمان کا باعث ہیں۔ ۱۵۲

نوحؑ، پہلے اولوالعزم پیغمبر

.. نوح کا مکمل تعارف، نام عبدالغفار یا عبدالملک یا عبدالاعلیٰ تھا۔ والد کا نام لمک یا لامک تھا۔ آپ کی عمر ۲۵۰ سال تک بیان ہوئی ہے۔ ۹۵۰ برس آپ نے تبلیغ کی۔ ۹۱

نوحؑ کا پہلا پیغام

.. دردناک عذاب پہنچنے سے پہلے خدا سے توبہ کرو اور اسی کی عبادت کرو ۶۶ تا ۶۸

نہ قدرتِ مقابلہ نہ راہِ فرار

.. جس کا انکار کرتے رہے، اس کی طرف چلو۔ دھوئیں کا سایہ آرام بخش نہیں۔ آج حق و باطل کی ابتدائی کا دن ہے۔ ۳۲۹ - ۳۳۴

ولید، ایک حق ناشناس مغرور دولت مند

.. ولید بن مغیرہ مخزومی جسے میں نے تنہا پیدا کیا، پھر مال و اولاد سے نوازا، مجھے چھوڑ دے میں خود اس سے سمجھ لوں گا۔ ۱۸۹ - ۱۹۲

وہ خدا جس نے انسان کو نُطفہ سے پیدا کیا

.. کیا انسان کو بے مقصد پیدا کیا ہے؟ کیا یہ حقیر نطفہ نہ تھا۔ ۲۵۶ تا ۲۵۹

وہ ہلاک ہو اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا

.. ولید بن مغیرہ کے طرزِ عمل اور حق سے انکار کی تفصیل ۱۹۳ ، ۱۹۶

ہم پہلے چھپ کر چوری کیا کرتے تھے

.. ہم آسمان میں گھات لگاتے تھے، تو شہاب پھینکا کرتے تھے۔ (مومن جنوں کا قوم سے خطاب۔) ۱۰۷ ، ۱۰۹

ہم تمہیں فراواں نعمات کے ذریعہ آزمائیں گے

.. جن و انسان ایمان پر قائم ہیں تو فراواں پانی سے سیراب اور نعمتوں سے آزمائیں گے، جو روگردان ہو گا اُسے عذاب کریں گے۔ ۱۱۴ - ۱۱۶

ہم نے حق کو سُنا اور قبول کیا

.. ہم میں اچھے بُرے افراد ہیں، ہم زمین میں خدا کے ارادوں پر نہ غالب آ سکتے ہیں نہ فرار کر سکتے ہیں۔ ۱۱۱ - ۱۱۳

ہم نے ناچیز نطفہ کو انسان بنا دیا۔

.. بہت زمانہ ایسے گزرا کہ انسانی وجود کے ذرّات منتشر رہے اور وہ قابلِ ذکر نہیں تھا۔ ۲۷۰ ، ۲۷۵

❖ ❖ ❖

مقامات

دومۃ الجندل

.. (تبوک کے قریب 'جوف') یہاں قبیلہ بنی کلب کا بت "ود" نصب تھا۔ ۸۵

روضہ (خانج)

.. وہ مقام جہاں سارہ سے جناب امیر نے خط برآمد کیا، جو وہ مشرکین مکہ کی طرف لے جا رہی تھی۔ ۱۳۰

رہاط

.. یہاں قبیلہ 'ہذیل' کا بت سواع' نصب تھا۔ ۸۵

مکہ

.. اہل مکہ کے پاس 'ہبل'، 'اساف'، 'نائلہ اور لات و عزیٰ بت تھے جو کعبہ کے اندر اور باہر نصب تھے۔ ۸۶

نصیبین (یمن)

.. یمن کے جنوں کا ایک گروہ طائف کے باغوں کے قریب سے گزرا۔ رسول پاکؐ سے (نماز) میں قرآن سن کر ایمان لایا۔ ۱۰۱

یمن

.. مختلف قبیلوں کے تین بت یغوث، یعوق اور نسر یمن میں نصب تھے۔ ۸۶

اشاریہ جلد ۲۵
الحمدللہ توفیقِ ربانی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا
پنجشنبہ ۹ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۹۹۱ء
السید شکیل حسین موسوی